

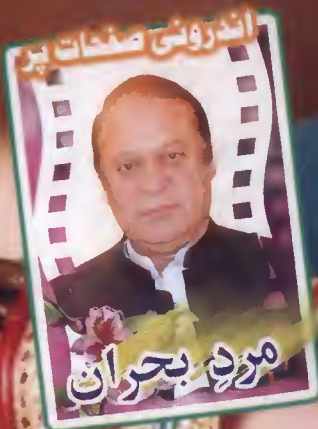
دل کے دوزخ پر بیٹھ، زندگی کی تسمین لیں

کراچی

# سچی کہانیاں

AUGUST  
2013

عید مبارک



اس شمارے میں

- ☆ ”دم ترش جنوں“ سلیم فاروقی کے قلم سے
- ☆ ایک ناقابلِ فراموش سلسلہ ”مکھنی“ ارشد علی ارشد کے قلم سے
- ☆ ”مسئلہ یہ ہے“ قرآنی آیات کے ذریعے آپ کے مسائل کا حل

# سچی کہانیاں

اداریہ

دکھاوا

سليم قادري

7

وزیر اعظم نواز شریف کی سوانح حیات

شہیدوں کی سوچ پر مبنی ایک دل گدا ز سلسلہ

احوال

سليم قادري

9

اس ماہ کی خاص کہانی

ایک شعلہ صفت نوجوان کی سرگزشت

# سچی کہانیاں

دوسری پڑاثر کہانی

میں نصیبوں والی...

محمد اسلم آزاد

147

تیسری پڑاثر کہانی

اللہ پر بھروسہ

عقیدہ نجم طارق

152

پہلی پڑاثر کہانی

وہم نہیں حقیقت

عمیلہ زاہد

162

دوسری پڑاثر کہانی

ڈاک بنگلہ

آصف شیخ

171

ڈنمارک کا سفر نامہ

ذکر جل پری کا

قرن علی عباسی

180

موبائل کے بطن جنم لیتی عبرت اثر کہانی

میری بہن...

سورہ انور

156

آتش جنوں

سليم قادري

61

چھپر چھاؤں

نگہت انور

47

جھوپٹوں سے محلات

راجہ محمود

29

شہید کی ڈائری

منزہ سہام

28

رنگوں اور روشنیوں کی دنیا کے مسکرون واقعات

دلی سے دلدار...

محمد خطاب خان

192

پہلی جگ بیتی

درد دل کے وسیلے

فرزادہ نگہت

107

تیسری آپ بیتی

مجھے قرار آ جائے

فوزیہ بٹ

98

دوسری آپ بیتی

نیکی رائیگاں نہیں...

ممتاز احمد

92

پہلی آپ بیتی

آزادی کی قیمت

جویریہ سلیم

85

قرآنی آیات کے ذریعے آپ کے مسائل کا حل

مسئلہ یہ ہے

ادارہ

227

پہلی پڑاثر کہانی

بولتا دل تو...

ترہانہ تنب

138

چوتھی جگ بیتی

خوشیاں اتم میں...

نصرت سرفراز

133

تیسری جگ بیتی

قدرت کا انتقا

امجد علی

128

دوسری جگ بیتی

چودھوی کا چاند

ملک مندر عباس اعوان

116

Mini Mag

قارین

235

بازگشت

سہام مرزا

258

مقرقات

قارین

000







## دکھاوا

رحمتوں اور برکتوں والے ماہِ صیام کا آغاز ہو چکا ہے۔ لوگ جذبہِ ایمانی سے سرشار نظر آتے ہیں۔ مساجد ”فصلی نمازیوں“ سے ابلی پڑ رہی ہیں۔ صدقہ، خیرات اور ”امپورٹڈ“ فقیروں کا دور دورہ ہے۔ ہم روزے بھی رکھتے ہیں، نمازوں اور تراویح کا اہتمام بھی کرتے ہیں لیکن کیا ہماری ”رُوح“ بھی ان موروثی بیماریوں سے پاک ہو چکی ہے جنہیں ذخیرہ اندوزی بددیانتی، مکر و فریب اور دھوکا دہی کے ناموں سے پکارا جاتا ہے؟

ایسا لگتا ہے جیسے ہم محض دکھاوے کے لیے اپنے نفس کے خونخوار جانور کو دن بھر قید رکھتے ہیں۔ افطار کے وقت یہ خونخوار بھوکا پیاسا جانور آزاد ہوتا ہے تو دسترخوان کے دسترخوان اجاڑ دیتا ہے۔ گویا ایک فرضِ عبادت کو بھی ہم نے نام و نمود اور دکھاوے کا ذریعہ بنالیا ہے۔ اسی دکھاوے کے لیے بڑے بڑے پانچ ستاروں والے ہوٹلوں میں افطار پارٹیاں ہوتی ہیں، دل کھول کر کھانے پینے کی اشیاء کا زیاں کیا جاتا ہے لیکن ہماری ”رُوح“ پہلے کی طرح بیمار ہی رہتی ہے۔

روزہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے رکھا جاتا ہے۔ اگر اسے بھی ہم نے ریا کاری اور دکھاوے کا ذریعہ بنالیا تو یہ اپنے ساتھ تو ظلم ہوگا ہی، اللہ سے بھی مذاق ہوگا۔ جن قوموں نے اللہ سے مذاق کیا وہ معتبوب اور راندہ درگاہِ ٹھہریں۔ اللہ تعالیٰ ہمارے گناہوں کو معاف فرمائے اور ہمیں روزے کی اصل رُوح کو سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

سلیم فاروقی

# احوال

نگراں مدیر سلیم فاروقی قارئین کے درمیان

ووستو.....! سب سے پہلے تو رمضان المبارک کی آمد مبارک! سچی کہانیاں کا آئندہ شمارہ آپ لوگوں کو عید الفطر کے بعد ملے گا اس لیے عید الفطر کی پیشگی مبارک باد! آپ کو یقیناً ہماری مبارک باد پھینکی نظر آرہی ہوگی۔ اس کی وجہ وطن عزیز بالخصوص کراچی کے دیگر گوں حالات ہیں۔ کراچی جو بھی عروس البلا دکھلاتا تھا، روشنیوں کا شہر تھا، اب اندھیروں اور مسائل کا شہر ہے۔ کراچی کے عوام ٹارگٹ کلنگ اور بھتہ خور مافیہ کے تو عادی تھے ہی، لوڈ شیڈنگ بھی اب کوئی نئی چیز نہیں رہی۔ اب تو سی این جی کی بندش نے کراچی کے عوام کو ایک نئے عذاب میں مبتلا کر دیا ہے۔ ابھی اعلان اور اکثر بغیر اعلان کے سی این جی بند کر دی جاتی ہے اور سڑکوں پہ لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ جاتے ہیں جو اکادکا بسیں چلتی بھی ہیں تو انہیں دیکھ کر خوف آتا ہے۔ ان بسوں میں عوام یوں ٹھنسنے ہوتے ہیں جیسے آلو اور پیاز کی بوریاں، بسوں کی پھتوں پر بھی لوگ شہد کی مکھیں کے جھتے کی طرح نظر آتے ہیں۔ پورا شہر ایک عجیب و غریب بے بسی کی تصویر نظر آتا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے ملک میں کسی کی بھی حکومت نہ ہو۔ ایک سال پہلے تک بھی غریب آدمی پیٹ بھر روٹی کمانے کے لیے اس عذاب سے نہیں گزرتا تھا۔ کراچی کی حالت زار دیکھ کر ایسا لگتا ہے جیسے کسی مادرانی قوت نے پاکستان کے اس سب سے بڑے شہر کا جلیہ بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔ عجیب نفسا نفسی کا دور ہے۔ بیرون ملک سے کراچی آنے والے اس کی حالت پر حیران رہ جاتے ہوں گے کہ یہ ہے پاکستان کا سب سے بڑا شہر؟ بے لگام ٹریفک، بدحفاظ اور بدعیت تاجر، کرپٹ ترین بیوروکریسی اور اس سے بھی کمزور زیادہ کرپٹ اور بدعنوان سیاست دان۔ بے روح اور بے حس عوام جو ہر صبح کسی روڈ کی طرح اپنے معمولات میں مصروف ہو جاتے ہیں، مہنگائی کا کوہ گراں اور لاقانونیت اور بدامنی کا ناچتا ہوا آسیب..... یا اللہ! تو میرے شہر اور میرے وطن کو اپنی حفظ و امان میں رکھنا، ہمارے ان تمام گناہوں کو معاف فرما دے جن کی پاداش میں تو نے ہم پر یہ دردناک مسائل نازل فرمائے ہیں۔ یا اللہ! تو اپنی رحمتوں اور برکتوں کے واسطے سے ہمیں اس عذاب سے بچالے۔ (آمین! آمین!)

یہ تو تھا ہمارا احوال جو یقیناً آپ کو پسند نہیں آیا ہوگا کہ آپ خود بھی تو پاکستانی ہیں اور اسی عذاب سے گزر رہے ہیں۔ چھوڑیے ان سب باتوں کو آئیے بزم احوال بجاتے ہیں۔

✉ سرگودھا سے حافظہ مون رقم طراز ہیں۔ محترم سلیم فاروقی اکل! السلام علیکم! احوال میں آپ کی آمد خوش آئند ہے، ہمیں اچھا لگا۔ امید ہے کہ اب آپ اس کرسی صدارت پر ہمیشہ براجمان رہیں گے۔ (کرسی

# ڈو بڈی ساحل

تحریر ☆ ادريس کاوش

عورت.....!

بیٹی ہو تو..... رحمت

بیوی ہو تو..... محبت

ماں ہو تو..... خدا کا روپ

زندگی کے نامساعد حالات کا مقابلہ کرتی ایک ایسی عورت کی کہانی جس کے کردار پر الزام تراشیاں کی جاتی رہیں جو عزت و احترام اور گھر کی چار دیواری کو ترستی رہی مگر ہمیشہ اس کی امیدوں پر پانی پھیر دیا گیا۔ اس کے خوابوں کو چکنا چور کیا گیا اور یہ سب کرنے والے اُس کے اپنے تھے۔ اُس کے نصیب میں قربانیاں تھیں، وہ رشتوں میں پیار بانٹتی رہی اور رشتوں نے اُسے محبتوں کی صلیب پر چڑھا دیا.....!

.....

بہت جلد ماہنامہ ”سچی کہانیاں“ کے صفحات پر ملاحظہ فرمائیے

صدارت؟ مون بی بی کیوں ہمیں بدنام کر رہی ہو؟) انکل ناصر رضا منزہ آبی اور رخسانہ سہام صاحبہ آپ سب کیسے ہیں؟ (سب بہت اچھے ہیں۔) میری طرف سے خلوص بھرا سلام قبول فرمائے۔ انکل ناصر، آپ کو میں نے ایک کہانی ارسال کی تھی، عنوان تھا ”آئینہ خانے میں“ کیا آپ کو وہ کہانی مل گئی ہے؟ (وہ کہانی مل گئی ہے۔) کچھ مصروفیت کی وجہ سے احوال کی محفل سے غائب ہونا پڑا لیکن اب انشاء اللہ کوشش کروں گی کہ ہر ماہ حاضری لگوا سکوں۔ (لیکن غائب ہونے کا جرمانہ کون دے گا؟) جولائی کا شمارہ ابھی بڑھ نہیں سکی ہاں البتہ آتش جنوں اور مہسنی بہت زبردست جارہی ہیں۔ سچی کہانیاں میں جو نئے سلسلے شروع کیے گئے ہیں وہ بھی اچھے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سچی کہانیاں کو ہمیشہ کامیابیوں سے ہمکنار کرتا رہے۔ (آمین! ثم آمین! آخر میں تمام قارئین کرام لکھنے والوں اور والیوں کو سلام و دعا میل۔)

✉ کراچی سے سیمیں غزل انہاں تھتی ہیں۔ منزہ سہام صاحبہ السلام علیکم! (وعلیکم السلام!) امید ہے سب خیریت ہوگی۔ آنکھوں کے آپریشن اور بازو کے درد نے لکھنے پڑھنے سے معذور کر دیا تھا۔ طبیعت سنبھلتے ہی ایک سچی کہانی ”رحمت کا اشارہ“ لے کر حاضر ہوئی ہوں۔ امید ہے حسب سابق حوصلہ افزائی فرمائیں گی۔ (آپ کی کہانی مل گئی ہے لیکن پہلے یہ بتائیے کہ اب طبیعت کیسی ہے؟) دسمبر 2012ء میں آپ نے میرے بیٹے کی منگنی کی مبارک باد دی تھی جس کا شکریہ اب ادا کر رہی ہوں۔ آپ کی دعاؤں سے میرے بیٹے کا نکاح بھی ہو گیا اور میری بہو جرنی بھی چلی گئی۔ اب دسمبر 2013ء میں دونوں یعنی بیٹے اور بہو کی آمد متوقع ہے۔ (ایک مرتبہ پھر دلی مبارک باد لیکن اس کا شکریہ ادا مت کیجیے گا ویسے تو اب 2014ء بھی زیادہ دور نہیں۔) میں نے دسمبر 2012ء میں ایک کہانی ”جراغ تلتے“ بھی بھیجی تھی جس کی مجھے رسید بھی نہیں ملی شاید آپ کے معیار پر پوری نہیں اتری۔ (اتنے عرصے میں کم سے کم رسید تو مل ہی جاتی ہے، نہیں ملی تو.....)

✉ بچوں عاقل سے صابر بلوچ کا اظہار خیال! سلیم فاروقی صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ! (وعلیکم السلام!) بہت دنوں کے بعد حاضر ہوں، کچھ تحریریں ایسی ہوتی ہیں کہ نہ چاہتے ہوئے بھی احوال میں شامل ہونے کو جی چاہتا ہے۔ محترم احوالیوں کو سلام عرض کرتا ہوں اور اگر شمارہ عید الفطر کے قریب آئے گا تو رمضان المبارک کی اور عید الفطر کی بھی مبارک قبول ہو۔ اللہ تعالیٰ رمضان کی برکت سے تمام مسلمانوں کو بخشش عطا فرمائے۔ (آمین! ثم آمین!) اب آتے ہیں شمارے کی جانب اس وقت تک بھائی ناصر رضا کا ادارہ یہ بے حس یا جی منزہ سہام کا شہید کی ڈائری، مریم شاہ بخاری کا ”کالی رات کے بعد“، ایل ڈن، باجی مریم شاہ بخاری، آپ کی تحریر بہت پسند آئی۔ بھائی وقاص حسین کی تحریر ”اب پچھتائے کیا ہودت“ بھی اچھی رہی اور باجی رضوانہ کوثر کی تحریر ”ایک زندگی ایک محبت“ بہترین تحریر ہے۔ باجی عروہ عدنان کی تحریر ”زندگی کے بازار میں“ نے بہت متاثر کیا۔ ”محبت کی بھینٹ“ محمد حسین کنول، انتقام کی آگ، سلتی غزل، انسان کہتے ہیں، عائشہ صدیقہ ضمیر اور موبائل کہانی شیطانی محبت، مور شاہد حسین بھی اچھی تھیں۔ آخر میں بھائی محمد اقبال زمان کی تحریر ”یہ وحشی درندے“ بھی پڑھ سکا ہوں۔ تمام کی تمام تحریریں بہترین تھیں۔ (ان میں سے کوئی تحریر ناپسند بھی ہے یا آپ بھی سیاست دان ہو گئے ہیں؟)

✉ کراچی سے شہزاد احمد کا اظہار یہ! انہوں نے ناصر رضا صاحب کو مخاطب کیا ہے۔ ناصر بھائی، السلام علیکم! (گو تم نے ناصر رضا کو مخاطب کیا ہے لیکن ہماری طرف سے بھی وعلیکم السلام!) امید کرتی ہوں آپ تمام



لوگ خیریت سے ہوں گے۔ اللہ پاک سے دعا ہے کہ سب کو صحت، سلامتی اور خوش حالی عطا فرمائے۔ (آمین!)  
 ثم آمین!) آپ کا بہت شکریہ کہ آپ میری تحریروں کو سچی کہانیاں میں جگہ دیتے ہیں۔ میں نے ایک  
 تحریر ”بیداری“ جنوری کو پوسٹ کروائی تھی۔ وہ معیاری ہے کہ نہیں؟ مجھے امید ہے کہ آپ اسے ”سچی کہانیاں“  
 میں جلدی جگہ دیں گے۔ میں ایک اور تحریر ارسال کر رہی ہوں ”بس میرے رہنا“ اگر معیاری ہو تو جلد جگہ دیجیے  
 گا۔ (کہانی معیاری ہو یا نہ ہو مخاطب کرنے کا یہ انداز بہت زبردست اور معیاری ہے۔)

✉ کراچی سے نفیضہ فضل کا اظہار خیال! ایڈیٹر صاحب! السلام علیکم! امید ہے، بفضل خدا بخیر و عافیت ہوں  
 گے۔ اللہ رب کریم آپ پر اپنا رحم و کرم فرمائے۔ (آمین!) جس خاتون نے یہ اعتراف کیا کہ اس سے غلطیاں  
 سرزد ہوئی ہیں وہ حیات ہے اور اب اپنے گناہوں سے تاب ب ہو چکی ہے۔ اللہ رب العزت اسے معاف فرمائے  
 اور ہمارے گناہوں کو بھی معاف فرمائے۔ (آمین!) کہانی دو دن سے مکمل ہے آج ہڑتال ہے انشاء اللہ کل  
 آپ کو مل جائے گی۔ اس کہانی میں سب کے نام تبدیل کر دیئے ہیں تمام اسٹاف کو میری طرف سے بہت کرا  
 دعائیں اور سلام قبول ہو! (تمام اسٹاف کی طرف سے ولیکم السلام!)

✉ کراچی سے فوزیہ فرید احمد کی خیال آرائی! ایڈیٹر انچارج صاحب! السلام علیکم! میں سب سے پہلے آپ  
 کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گی کہ آپ نے میری حوصلہ افزائی فرمائی، مجھے لکھنے لکھانے کا بہت شوق ہے لیکن مجھے گائیڈ  
 کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ میں اپنی بھرپور کوشش کرتی ہوں کہ میری تحریریں وہ سب کچھ ہو جو ایک اچھے لکھاری  
 میں پایا جاتا ہے۔ میں اپنی ایک اور تحریر بھیج رہی ہوں اور امید کرتی ہوں یہ آپ کے رسالے میں جگہ پائے گی۔  
 اب تک میں نے اپنی جتنی بھی تحریریں بھیجی ہیں وہ سب کی سب بالکل سچی ہیں اور کسی نہ کسی کے ساتھ ایسے  
 واقعات پیش آچکے ہیں اور آئندہ بھی انشاء اللہ تعالیٰ میں سچے واقعات ہی بھیجوں گی کیونکہ اس رسالے میں سچی  
 تحریریں ہی جگہ پاتی ہیں۔ میری آج بھی جانے والی کوشش اگر آپ رسالے کی نذر فرما دیں گے تو مجھے بے حد  
 خوشی ہوگی۔ (فوزیہ بی بی! ایک بات کا دھیان رکھیں اپنی تحریر میں صرف اور صرف اردو کے الفاظ استعمال کرنے  
 کی کوشش کریں۔ ”یہ گائیڈ“ اور ”لکھاری“ وغیرہ اردو زبان کے لفظ نہیں ہیں۔ بہر حال آپ محنت کرتی رہیں کہ  
 محنت کبھی رائے گان نہیں جاتی۔)

✉ راولپنڈی سے بھائی سلیم اختر تشریف لائے ہیں۔ کیسے ہیں جناب؟ امید ہے، بہ خیریت ہوں گے  
 لکھتے ہیں۔ برادر عزیز سلیم فاروقی! السلام علیکم! آپ اور سب کے لیے امن، سکھ اور سلامتی کی دعائیں۔ (ان  
 حالات میں یہی دعائیں بیش قیمت ہیں بہت شکریہ! ہم سب بھی آپ کے لیے دعا گو ہیں۔) امید ہے آپ  
 بہ خیریت ہوں گے۔ جولائی کا سچی کہانیاں ملا خول صورت سرورق کے ساتھ کچھ تبدیلی بھلی لگی۔ امید ہے کہ آپ  
 وہی پرانا انداز اور نئی توانائی کے ساتھ سچی کہانیاں کو ایک مقبول اور ہر دل عزیز پرچہ بنا دیں گے۔ میری دعائیں  
 اور تعاون آپ کے ہمراہ ہوگا۔ ویل ڈن بھائی! (ہماری تو بھرپور کوشش ہے، بس آپ جیسے قلم کاروں اور قارئین کا  
 تعاون شرط ہے۔) ”ہالی ووڈ کی ساحرہ“ راجہ محمود صاحب نے انجیلینا جولی کے بارے میں لکھ کر میدان مار  
 لیا ہے۔ راجہ صاحب ہر ماہ خاصے کی چیز لاتے ہیں یہ اب سچی کہانیاں کی شناخت بن گیا ہے۔ راجہ بھائی! مبارک  
 باد۔ مریم شاہ کی ”کالی رات کے بعد“ اچھی لگی۔ مریم شاہ کی یہ دوسری اہم تحریر ہے جس کا موضوع جرم و سزا  
 ہے۔ بیٹی مریم شاہ! مبارک! رضوانہ کوثر کی ”ماں جایا میرا“ نفیضہ فضل کی ”ایک زندگی ایک محبت“ سہلی غزل کی

## جولائی 2013ء کی انعام یافتہ کہانیاں

قارئین کے ارسال کردہ نوکن کے ذریعے مندرجہ ذیل کہانیاں اس ترتیب سے انعام کی حقدار ٹھہریں

مریم شاہ بخاری کی تحریر ”کالی رات کے بعد“ پہلے انعام کی حقدار ٹھہری، ادارے کی جانب سے مبلغ 700.00 روپے بہ طور انعام بھیجے جارہے ہیں۔

عروہ عدنان کی تحریر ”زندگی کے بازار میں“ دوسرے انعام کی حقدار ٹھہری، ادارے کی جانب سے مبلغ 500.00 روپے بہ طور انعام بھیجے جارہے ہیں۔

علی صبا کی تحریر ”فقیر بابا کا خواب“ تیسرے انعام کی حقدار ٹھہری، ادارے کی جانب سے مبلغ 400.00 روپے بہ طور انعام بھیجے جارہے ہیں۔

عارف شین روہیلہ کی تحریر ”وہ ماں تھی؟“ چوتھے انعام کی حقدار ٹھہری، ادارے کی جانب سے مبلغ 300.00 روپے بہ طور انعام بھیجے جارہے ہیں۔

سلٹی غزل کی تحریر ”انتقام کی آگ“ پانچویں انعام کی حقدار ٹھہری، ادارے کی جانب سے مبلغ 250.00 روپے بہ طور انعام بھیجے جارہے ہیں۔

وقاص حسین کی تحریر ”اب بچھٹائے کیا“ چھٹے انعام کی حقدار ٹھہری، ادارے کی جانب سے مبلغ 200.00 روپے بہ طور انعام بھیجے جارہے ہیں۔

### حوصلہ افزائی

مرحوم کرل رفیق ایس ایم کی یاد میں مور شاہد حسین کی تحریر ”شیطانی محبت“

کو بطور انعام مبلغ سو روپے پیش کیے جارہے ہیں

### بہترین شعر

قارئین نے اس بار فرزانہ جبین حیدر آباد کا بھیجا ہوا شعر سب سے زیادہ پسند کیا۔

یوں ہی تو شاخ سے پتے گرا نہیں کرتے

پتھر کے لوگ زیادہ جیا نہیں کرتے

”انتقام کی آگ“ عروہ عدنان اور علی صبا کی کہانیاں سچی کہانیاں کی خوبصورتی میں اضافہ کر رہی ہیں۔ محمد حسین کنول محبت کے موضوع پر بہترین کہانی لے کر آئے۔ اعتراضات کا دوبارہ شامل ہونا بہتر ہے۔ اس سے نئے لکھنے والوں کے لیے جگہ بنے گی۔ موبائل کہانی ”مور شاہد حسین! بہت خوب لکھا آپ نے“ جیتے رہیں۔ محمد اقبال زمان بھی آپ کے ادارے کا اثاثہ ہیں۔ سرکوشش کے ساتھ تحریروں کے ساتھ بھی حاضری دیتے ہیں۔ اسلام آباد کی بہن نصرت سرفراز اور تحسین جو نیچو کی خدمت میں آداب عرض ہے۔ صفیہ سلطانہ مغل! آپ کا بہت شکریہ۔ پروردگار آپ کو اپنی امان میں رکھے۔ (آمین!) ناصر بھائی اور دیگر احباب کو آداب اور سلام کہیں۔ خط کے ہمراہ ایک تحریر بھی ارسال ہے۔ ناصر بھائی کے حوالے کر دینا۔ ان دنوں میں اپنی کہانیوں کے مجموعہ کے سلسلے میں مصروف ہوں اس لیے خط مختصر ہے۔ (بھائی سلیم! خط کے طویل یا مختصر ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا، بس آپ کے محبت بھرے چند الفاظ ہی ہمارے حوصلے کے لیے کافی ہیں۔)

✉ چکوال سے بھائی عبدالعزیز جی آئی آمد! سلیم فاروقی صاحب! آداب! اس نکریم و توقیر اور عزت افزائی کا بہت شکریہ جو سابقہ خط میں آپ نے مجھ ناچیز کو مرحمت فرمائی۔ بہت دھکی ہوں! دنیا کے کسی بندے پر اعتماد نہیں رہا۔ خدا پوچھئے ان جادوگروں اور عالموں سے جو دوسروں کے گھروں کو تباہ و برباد کرنے کے لیے دکانیں کھول کر بیٹھے ہیں مگر ان کو کوئی پوچھنے والا نہیں۔ جس بچی کو میں نے 3 ماہ قبل دعاؤں کے سائے میں خوش خوش ڈولی میں بٹھایا تھا، آج لاہور کے ایک سرکاری ہسپتال میں موت و حیات کی کشمکش میں پڑی آپ سب کی دعاؤں کی مستحق ہے۔ ظالم سربالیوں نے وہ سلوک کیا کہ لکھ نہیں پا رہا حتیٰ کہ کالے علم کروا کر بچی کو جان سے مارنے کی کوشش کی گئی۔ میں نے صبر کا گھونٹ بھر اور کراچی جا کر بچی کو جو ہڈیوں کا ڈھانچہ بن چکی تھی اٹھا کر لے آیا اور لاہور جس ہسپتال میں خود کام کرتا ہوں داخل کروادی۔ (بھائی جی! یہ سب کچھ پڑھ کر بہت دکھ اور صدمہ ہوا۔ اللہ تعالیٰ بچی کو صحت و تندرستی عطا فرمائے اور اپنی حفظ و امان میں رکھے۔ (آمین!) سچی کہانیاں فریش پرچہ ملا ضرور ہے مگر مصروفیت اور ذہنی انتشار کی وجہ سے ابھی نہیں پڑھا۔ ہاں احوال میں چند خطوط جو بہت پسند آئے، وہ ہیں شمیمہ ناز، نسیم سحر، صفیہ سلطانہ، تحسین جو نیچو، نصرت سرفراز، نانا محمد شاہد اور مختار احمد! سب کے لیے ڈھیر سارا پیار، محبت اور خلوص۔ نیک تمناؤں کے ساتھ ہر یاد کرنے والے کو سلام!

✉ لاہور سے انجم فاروقی کا اظہار خیال! بابا جی منزہ سہام صاحبہ! آداب! امید ہے آپ اور ادارے کے دیگر احباب بخیر و عافیت ہوں گے۔ آپ کے پرچے سچی کہانیاں میں مٹی کے شمارہ میں میری کہانی پر اسرار کرا شائع ہوئی تھی۔ میں اس کی اشاعت کے سلسلے میں مشکور ہوں۔ ادارے کی طرف سے اعزازی پرچہ موصول ہو گیا تھا۔ جون کے شمارہ میں اسے چوتھے انعام کا حق دار قرار دیا گیا تھا۔ شمارہ جون 27 مئی کو منظر عام پر آیا تھا۔ میں نے آفس جاتے وقت الفلاح سینما کے پاس بک اسٹال پر دیکھا تھا لیکن انعامی رقم ابھی تک نہیں ملی۔ (انعامی رقم بھی مل جائے گی پریشان نہ ہوں۔) امید ہے توجہ فرما کر شکریے کا موقع عنایت فرمائیں گی اور مزید سلسلہ آگے بڑھے گا۔ سچی کہانیاں اچھا اور معیاری پرچہ ہے کہانی پیش کرنے کا انداز بھی جاذب نظر ہوتا ہے۔ اس میں مزید کہانیاں دی جاسکتی ہیں۔ توجہ فرما دیجیے۔ آج ناصر رضا سے فون پر دوسرے گفتگو کی کوشش کی گئی لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ (ناصر رضا صاحب علالت کی وجہ سے چھٹی پر ہیں۔)

✉ ساحل ابڑو ڈیرہ اللہ یار بلوچستان سے لکھتے ہیں۔ السلام علیکم! انکل، کیا حال احوال ہیں؟ خیریت ہے؟

میری اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ آپ ہر وقت خوش و خرم اور سچی کہانیاں کے احوال میں ہمارے درمیان ساری زندگی گلاب کی طرح مہکتے رہیں اور ان کی خوشبو ہماری محبتوں میں دائم و قائم رہے آمین! ثم آمین! (اللہ کے فضل و کرم سے ہم اور ہماری پوری ٹیم بخیریت ہے۔) آج مورخہ تیس جولائی، بدھ روز اتوار جولائی کا شمارہ قریبی بک اسٹال سے خریدا۔ ٹائٹل بہت ہی خوبصورت و دیدہ زیب تھا۔ جلدی جلدی سے احوال میں پہنچا تو ماشاء اللہ یہاں کافی رائزر حضرات خوش خوش اور انکل سے گپ شپ میں مصروف تھے لیکن اس خوشی کے باعث موقع پر احوال میں ایک خط پڑھ کر نہ جانے کیوں مجھے دکھ محسوس ہوا۔ جی ہاں وہ خط تھا قمرہ صفیہ سلطانہ، جیکب آباد سے جو پیشے کے لحاظ سے پروفیسر اور معروف ادیبہ اور ایک کتاب کی مصنفہ بھی ہیں۔ صفیہ سلطانہ اپنے خط میں کہتی ہیں کہ محترم سلیم اختر کی کہانی ”مسحا اور موت“ جھوٹ پر مبنی تھی اور خوانخواہ صفیہ ضائع کیے گئے ہیں۔ (ہر شخص کو اپنی رائے دینے کی آزادی ہے۔ یہ صفیہ سلطانہ کی انفرادی رائے ہے۔ اگر واقعی ایسا ہوتا تو وہ بھی شائع ہی نہ ہوتی اور صفیہ سلطانہ کو سلیم اختر صاحب سے خدا نخواستہ کوئی ذاتی رنجش بھی نہیں ہے۔) احوال سے فارغ ہوتے ہی کہانیوں کی دنیا میں قدم رکھا تو راجہ محمود نے آج حد کر دی، سات مسند ریا را دادا کارہ انجیلیا جولی سے ملاقات کرا دی۔ راجہ محمود بھائی! میں آپ کی سوچ، محنت اور کاوشوں کو خراج تحسین پیش کرتا ہوں میری طرف سے آپ کو مبارک ہو۔ مریم شاہ کی کہانی بھی بہت خوبصورت تھی دل کو دکھی کر گئی۔ بہن مریم! آپ کی ہر کہانی سبق آموز ہوتی ہے جو ہم نوجوان نسل کی سوچ کی تعمیر نو کرتی ہے۔ بقیہ تمام دوستوں کی کاوشیں بھی اچھی تھیں اور سلسلے بھی اچھے چل رہے ہیں۔ ماشاء اللہ سچی کہانیاں روز بدھ روز ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔ اللہ اس ادارے کو مزید ترقی و استحکام عطا فرمائے۔ (آمین!) انکل، دوشیزہ جون کا شمارہ مجھے بالکل نہیں ملا، کون سے منگوانا پڑا اور سچی کہانیاں بھی کافی لیٹ ملتا ہے جس کی وجہ سے احوال میں تاخیر ہو جاتی ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ (وجہ صرف اور صرف کراچی کے حالات ہیں۔ ہماری کوشش ہے کہ سچی کہانیاں آپ کو وقت پر ملے۔) اور ہاں انکل ایک افسانہ بھیجا تھا دوشیزہ کے لیے اور ایک چھوٹی سی کہانی نچی کہانیاں کے لیے اس کا کب نمبر آئے گا؟ ضرور آگاہ کرنا۔ (اس کا جواب ہم ٹیلی فون پر دے چکے ہیں۔) ایک نظم عید کے حوالے سے ارسال خدمت کر رہا ہوں اسے ماہ اگست میں ضرور شائع کرنا۔ زندگی رہی تو آئندہ بھی احوال میں ڈھیر سارے گلے شکوے ہوں گے۔ اُس وقت تک اجازت چاہتا ہوں۔

✉ آئیے ایک مرتبہ پھر لاہور چلتے ہیں جہاں ایم سعید انور سعید احوال میں شرکت کے منتظر ہیں۔ (بھائی! آپ پہلے تو یہ بتائیں کہ آپ ایم سعید ہیں یا انور سعید؟) سعید صاحبان لکھتے ہیں۔ محترم سلیم فاروقی، السلام علیکم! کافی عرصے سے خط شامل اشاعت نہیں ہو پایا اس لیے میں آپ سے پہلی بار ہم کلام ہو رہا ہوں۔ میری دعا ہے کہ آپ سدا پھولوں کی طرح مہکتے رہیں اور ہم سے ہم کلام ہوتے رہیں۔ (آمین!) گزشتہ ماہ جون کی 27 تاریخ کو ہی خط سپر ڈاک کر دیا تھا مگر تجانبے خط کون کھا جاتا ہے؟ ہم نہیں جانتے کہ خط ڈاک کے حکمے میں پسی رہ جاتا ہے یا پھر آپ کی رومی کی نوکری کا حصہ بن جاتا ہے مگر ہماری تو پوری کوشش ہوتی ہے کہ خط شامل اشاعت ہو جائے۔ (ہماری بھی پوری کوشش ہوتی ہے کہ ہر موصول ہونے والا خط شامل اشاعت ہو جائے۔) راجہ محمود صاحب کی تحریر ہالی ووڈ کی حسینہ بہت پسند آئی اور وقاص حسین کی تحریر ”اب پیچھلتے کیا ہوت“، سلیم فاروقی کی تحریر آتش جنوں، محمد اقبال زمان کی تحریر ”یہ وحشی درندے“ اور ارشد علی ارشد کی تحریر ”ملکھنی“



بہت اچھی لگیں۔ بہن رضوانہ کوڑا کو ان کے چچا کے انتقال پر دلی تعزیت۔ اللہ تعالیٰ اُن کے لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ (آمین!) کاشی چوہان کا افسانوی مجموعہ عنقریب منظر عام پر آنے پر بہت مبارک باد۔ آخر میں تمام قارئین کو سلام و دعا اور تمام قارئین اور سچی کہانیاں کے اسٹاف کو رمضان المبارک بہت مبارک ہو اور سب لوگوں کو میری جانب سے عید مبارک اور سب کو 14 اگست آزادی کا دن مبارک ہو۔ شکریہ۔ (آپ کو بھی رمضان المبارک اور یوم آزادی بہت مبارک ہو۔)

✉ شاد باغ لاہور سے کوثر سعید کی آمد! (حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ان کی اور انور سعید یا ایم سعیدی بینڈرائٹنگ بالکل ایک جیسی ہے۔) کوثر لکھتی ہیں۔ بھائی سلیم فاروقی! السلام علیکم! سب سے پہلے آپ کو کالم احوال کی خوبصورت محفل میں خوش آمدید! براہِ مہارہ کی طرح اس ماہ بھی تمام کہانیاں زیر دست تھیں۔ راجہ محمود بھائی کی تحریر ہالی ووڈ کی ساحرہ عروہ عدنان کی تحریر زندگی کے بازار میں، سلمیٰ غزل کی تحریر انتقام کی آگ گڈی آپا کی تحریر عجیب عورت اور ڈاکٹر فوزیہ کی تحریر کیا کیا میں نے؟ بہت پسند آئیں۔ ان کے علاوہ منزہ سہام کی تحریر شہید کی ڈائری اور ناصر بھائی کی تحریر احوال بہت اچھے تھے۔ رضوانہ آپ کی چچا کے انتقال پر بہت افسوس ہوا۔ اللہ ان کے لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ (آمین!) زریہ آپ کی کو اپنی سالگرہ بہت مبارک ہو۔ اللہ تعالیٰ انہیں صحت و تندرستی خوش و خوش حالی عطا فرمائے۔ (آمین!) اس ماہ سب قارئین کو عید الفطر بہت مبارک ہو۔ آخر میں سب کو سلام اور بہت سی دعائیں اور ہاں آئندہ ماہ اگست کے شمارے میں نواز شریف کی روداد حیات لگا رہے ہیں ہم بھی اُن کے چاہنے والوں میں ہیں اس لیے ہماری طرف سے انہیں وزیر اعظم بننے پر ڈھیروں ڈھیر مبارک باد۔ اللہ انہیں ملک کے لیے اچھے اچھے کام کرنے کی توفیق دے۔ (آمین!)

✉ کراچی سے ماریہ جلال لکھتی ہیں۔ محترم سلیم فاروقی انکل! السلام علیکم! گزشتہ شماروں میں شائع ہونے والی اپنی کاوشوں کو دیکھ کر خوشی سے آنکھیں بھر آئیں۔ جس طرح آپ نے مجھے اور میری نظم اور تحریر کو قابل اشاعت سمجھا اور میری حوصلہ افزائی کی اس طرح آپ کی اور ادارے کے ساتھ منزہ سہام کی بے حد ممنون ہوں جو ہمیں مزید حوصلہ اور ہمت دیتے ہیں۔ کچھ تازہ کلام اور خیال آرائی کے ساتھ حاضر خدمت ہوں۔ اگر اسے بھی شمارے کے لائق سمجھا جائے تو دلی خوشی ہوگی۔ (اگر نظم یا خیال آرائی اس قابل ہوئی تو ضرور شائع ہوگی۔) دل تو ویسے بھی اپنے ارد گرد پھیلے مختلف سچی کہانیوں کو تحریر کی نذر کرنا چاہتا ہے جو آپ کے شمارے میں ایک نئی کہانی کی صورت ہوگا مگر اس کے لیے خود میں اتنی ہمت اور حوصلہ نہیں پائی۔ (لکھنے کے لیے حوصلے کی نہیں، قلم اور کاغذ اور ذہن کی ضرورت ہوتی ہے ماریہ!) لیکن سچی کہانیاں سے وابستہ اپنی کچھ قریبی لکھاری خواتین اور شاعرات کے ساتھ موسیٰ رضا کی پڑوسی ہوں اور ان کی عزیزہ کی حیثیت سے ان کی جو خدمات اور مقام ڈائجسٹ میں دیکھا تو دل چاہا کہ خود کو بھی اس کا حصہ بناؤں۔ اس سلسلے میں میری پوری کوشش ہوگی کہ ہر ممکن طور پر ایک اچھی تحریر کے ساتھ حاضر ہو سکوں۔ اللہ پاک آپ کو منزہ سہام آئی اور شمارے میں لکھنے والے تمام لکھاری حضرات کو مزید ترقی اور عروج نصیب کرے۔ (آمین!)

✉ تحصیل جہانیاں سے بھائی ملک صفدر اعوان کی آمد! ناصر رضا صاحب اور سلیم فاروقی صاحب آداب! امید کرتا ہوں کہ آپ خیر خیریت سے ہوں گے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت کی دولت سے مالا مال رکھے اور غم کی آگ کی کوئی دھیمی سی آج آپ تک نہ پہنچ سکے اور آپ ہمارے درمیان یونہی

خوشیاں بکھیرتے رہیں۔ (آمین!) سلیم فاروقی صاحب! جی آئی انوں! میں آپ کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا تھا مگر آپ کے قلم کے جادو کا اُس وقت قائل ہو گیا تھا جب سے سچی کہانیاں میں آپ کی کہانی آتش جنوں پڑی ہے اور ہر ماہ اس سے لطف اندوز ہوتا ہوں لیکن احوال میں آپ کی شرکت دیکھی کہ جس محبت، شفقت اور بردباری سے آپ خطوط کے جواب دیتے ہیں جس میں نہ کھٹ شرارتی انداز اور بزرگانہ رویہ دونوں ہی بخوبی شامل ہوتے ہیں۔ آپ کے قلم کے سحر کے بعد میں آپ کی نفسِ طبعیت کا بھی قائل ہو گیا ہوں بس اتنا کہ اب احوال کی جان آپ ہی کے دم سے ہے۔ (صفدر! تم نے ہماری تعریف کچھ زیادہ نہیں کر دی؟ ویسے بے فکر ہو اگر تم تعریف نہ بھی کرو تو تمہارا خط شائع ہوگا۔) سچی کہانیاں ایک خوبصورت خوش رنگ پتھروں سے سج گلدستہ ہے اور آپ جیسے قابل لوگ اس گلدستے میں وہ مہکتے پھول ہیں جنہوں نے اسے چار چاند لگا دیے ہیں۔ (پھول تو ماحول کو مہم کا سکتے ہیں چار کیا، وہ تو ایک چاند بھی نہیں لگا سکتے صفدر!) جولائی کا رسالہ اس مرتبہ دیر سے موصول ہوا بلکہ میں تو یوں کہوں گا چلو ملتا تو سہی کیونکہ پچھلے دو تین ماہ سے سچی کہانیاں مل ہی نہیں رہا تھا۔ کئی دفعہ افس کال کر کے اس بارے میں اطلاع بھی دی۔ سر کولنشن نیچر محمد اقبال زمان سے بھی بات ہوئی اور ان کی کوشش سے مئی اور جون کے رسالے ل بھی گئے مگر فی پرچہ 100 میں پڑا۔ مجھے تو کوئی فرق نہیں پڑا جناب مگر میری جب اس ظلم پر بلبل اٹھی اور آخر احتجاجاً مجھی سے بائیکاٹ کر دیا۔ اب تو ایک ہی امید ہے کہ آپ مجھے اعزازی طور پر ہی پرچہ ارسال کر دیا کریں۔ دل تو چاہتا ہے کہ رسالہ بڑی ہی آسانی سے بغیر کسی تاخیر کے مجھے مل جائے تو دنیا کی دوسری خوشیاں اس خوشی کے آگے ثانوی ہو کر رہ جائیں گی۔ (بھائی! اعزازی شمارہ تو مزید دیر سے ملے گا۔ اس سلسلے میں سر کولنشن نیچر صاحب کوشش کر رہے ہیں کہ پرچہ پاکستان کے شہر ہی میں وقت پر پہنچ جائے۔) آگے اور کالکھوں کیونکہ باتیں تو مجھے بنانی نہیں آتی ہیں ناں (باتیں بھی کوئی ایسی چیز ہیں جنہیں بنایا جائے؟) ”یہ ہے زندگی میری“ کے لیے اپنی کہانی لے کر حاضر خدمت ہوں۔ امید کرتا ہوں جلد از جلد شامل کر کے مشکور فرمائیں گے۔ اگست کے شمارے کا بڑا ہی بے صبری کے ساتھ انتظار ہے کیونکہ مابودلت کی کہانی جو شامل اشاعت ہوگی جس کا ناصر رضا صاحب نے وعدہ کیا ہے اور ہاں ”پراسرار نمبر 3“ کے حوالے سے ناصر رضا صاحب سے سنا تھا کب آ رہا ہے؟ سرجی اس ”پراسرار نمبر 3“ کے لیے آپ کو حال ہی میں دو کہانیاں بھیجی تھیں۔ آپ نے یہاں بھی کہانی لگانے کا مجھ سے وعدہ کیا تھا۔ (ہم نے وعدہ کیا تھا؟ بہر حال پریشان مت ہو تمہاری کہانیاں اگر پراسرار ہوئیں تو ”پراسرار نمبر 3“ میں ضرور شائع ہوں گی۔) زندگی نے وفا کی تو پھر ضرور احوال میں شرکت کو یقینی بناؤں گا۔

✉ محمد اسماعیل بروہی دوڑ نواب شاہ سے لکھتے ہیں۔ سلیم فاروقی صاحب تمام نیک تمنائیں آپ اور اسٹاف کے نام! سلیم صاحب جولائی کا شمارہ وقت پہ پہنچانے کا شکریہ۔ بہت خوبصورت ٹائٹل کے ساتھ پرچہ ایک بار پھر لاجواب ہے۔ ادارے میں ناصر انکل نے بالکل سچ لکھا۔ ہالی ووڈ کی ساحرہ راجہ بھائی نے انجیلینا جولی کو بہترین کہانی کے روپ میں پیش کیا۔ ”کالی رات کے بعد“ مریم شاہ ماں جایا میرا رضوانہ کوڑا ایک زندگی ایک محبت، نفسیہ فضل زندگی کے بازار میں عروہ عدنان انتقام کی لڑگ، سلمیٰ غزل انسان جکتے ہیں عائشہ صدیقہ ضمیر کی کہانیاں بہترین تھیں۔ آتش جنوں بہترین جاری ہے۔ مٹھنی بھی ہمیں پسند ہے اور باقی تمام سلسلے اپنی مثال آپ ہیں۔ پچھلے خط میں راجہ محمود بھائی سے گلوکارہ مہنا زکے فن اور زندگی کی کہانی لکھنے کی فرمائش کی تھی جسے



آپ نے کاٹ دیا تھا۔ ایک بار پھر راجہ بھائی سے گزارش ہے کہ مہناز کے بارے میں ضرور لکھیں پلیز، سلیم انکل اور ناصر انکل مجھے اور تمام نواب شاہ کے قارئین کو انتظار ہے کہ کب میری کہانی چھپے گی؟ پلیز زیادہ انتظار مت کرو ایسے گا اور اب اجازت۔ (تمہیں اور نواب شاہ والوں کو زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ اب تو خوش؟)

✉ اب ذرا ڈوب بلوچستان سے عمران مظہر کی بات بھی سن لیں، کہتے ہیں۔ انکل سلیم فاروقی صاحب السلام علیکم! (وعلیکم السلام!) امید کرتا ہوں کہ آپ ناصر سر کاشی بھائی، منترہ باجی، رخسانہ آٹھی اور رسالے کا تمام اسٹاف خیریت و عافیت سے ہوگا۔ (اللہ کے فضل و کرم سے سب لوگ بہ عافیت ہیں) جولائی کا شمارہ ملا، سرورق قطعاً متاثر نہ کر سکا۔ بھی بیک گراؤ نڈ سے آگے کچھ تو حسن رکھا کریں نا، (حسن تو ہمیشہ پردہ ہی میں ہوتا ہے مظہر!) چھوٹی چھوٹی گئی تبدیلیاں اچھا تاثر چھوڑنے میں کامیاب رہیں۔ ناصر سر کی ”بے حسی“ کسی بھی باضمیر انسان کو چھوڑنے کے لیے کافی ہے۔ (یہ غالباً دنیا کی پہلی ”بے حسی“ ہے جسے اتنی اہمیت دی جا رہی ہے۔) بہت بہترین ادارے لکھتے ہیں ناصر سر۔ عبدالعزیز جی آنکل! آپ چھوٹے بچے کی طرح جب بگڑے نظر آتے ہیں تو بولوں پر بے ساختہ ہنسی آ جاتی ہے۔ (اب وہ بڑے بچے کی طرح تو بگڑنے سے رہے۔) شگفتہ شفیق آٹھی! آپ کو لیڈی ڈیانا پسند ہے؟ ہوں..... میں کچھ نہیں کہوں گا۔ (ارے پولیس بھی نہیں لیڈی ڈیانا ہی تو پسند ہے) مائیکل جیکسن تو پسند نہیں ہے جو آپ چپ رہ گئے؟ تحسین جو نیو! واقعی ان تبدیلیوں نے آپ کے زخموں پر مرہم رکھ دیا ہے تو مٹھائی ہو جائے۔ مٹھائی سے ذہن صفیہ سلطانہ آٹھی کی طرف چلا گیا۔ سلیم انکل، کیا یاد دلا دیا؟ اچا روالی باجی بابا بابا..... اب وہ باجی کہاں رہی ہیں؟ سلیم انکل اگر آپ نے کمر کس لی ہے واقعی تو یاد رکھیے، شہزادہ احوال کا مقابلہ امیدوار میں ہی ہوں۔ (اگر تم ہو تو ثابت کرو اس سے پہلے کہ کوئی اور ولی عہد بن جائے۔) اس بار دور تحریریں پڑھ کر واقعی بہت مزہ آیا۔ راجہ محمود صاحب کی ہالی ووڈ کی ساثرہ اور عمر خطاب کی دل کا کیا قصور؟ عمر خطاب صاحب مجھے کی کاٹنگ سٹوم (تری دیوفیم) اور نیکی کے بارے میں بھی پڑھنا ہے۔ انجیلینا جولی پہ لکھا گیا راجہ محمود صاحب کا مضمون معلومات میں اضافے کا باعث بنا۔ بات ہو جائے مٹھنی کی ارشد علی ارشد بھائی، ایک عرصے بعد ایک بہترین تحریر دینے پر مبارک باد قبول کریں۔ آپ کا انداز تحریر لفظوں کا چٹاؤ، خیالات، کمال کے ہیں۔ امید ہے اس ناول کی ہر قسط بھر پور ہوگی۔ ”انسان بکتے ہیں“ عانتہ صدیقہ ایک اچھی سبق آموز تحریر ہے لکرائیں۔ مور شاہد کی موبائل کہانی ”شیطان محبت“ حقیقت سے پرے لگی جو واقعات انہوں نے بیان کیے وہ بے شک ہوتے ہیں دنیا میں لیکن بہر حال اس تسلسل سے نہیں۔ علی صبا کی ”فقیر بابا کا خواب“ عام سی تحریر تھی۔ اقبال زمان کی ”یہ وحشی درندے“ پڑھ کر حیرت کے ساتھ تاسف بھی ہوا کہ کیا ہو رہا ہے ہمارے آس پاس؟ اعتراضات دونوں بہترین تھے۔ ڈاکٹر فوزیہ اور غلام محمد جو کھونے اپنی تحریروں سے اصلاح کا عنصر بھی اجاگر کیا۔ آپ کی ڈائری کے لیے اور پسند اپنی اپنی اچھے رہے۔ آخر میں ناصر صاحب اور کاشی بھائی کو میرا خصوصی سلام کہیے گا اور ان کا جواب بھی حاصل کیجیے گا۔ (ان دونوں کی طرف سے وعلیکم السلام!) دعاؤں میں ضرور یاد رکھیے گا۔ آپ سب بھی میری دعاؤں میں رہتے ہیں۔ اپنا بہت خیال رکھیے گا۔

✉ کوئٹہ بلوچستان ہی سے شاد پند رالی کی بزم آرائی! لکھتے ہیں۔ سلیم فاروقی صاحب السلام علیکم! مجھے امید ہے کہ آپ اور آپ کی پوری ٹیم خیر و عافیت سے ہوگی۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اور آپ کے اس کارواں میں شامل تمام افراد کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔ آمین! (بس آپ لوگوں کی یہ دعائیں ہی تو ہمارا اثاثہ

ہیں۔) دیگر احوال یہ ہے کہ سب سے پہلے بات ماہنامہ سچی کہانیاں کوئٹہ میں ہر ماہ بہت لیٹ پہنچتا ہے جس کی وجہ سے ہم احوال جیسی خوبصورت محفل میں شامل ہونے سے رہ جاتے ہیں۔ برائے مہربانی اس پر توجہ دیں۔ (سرکیشن ڈپارٹمنٹ اس سلسلے میں بندوبست کر رہا ہے کہ آئندہ آپ کو شکایت نہ ہو۔) ماہ جولائی کا شمارہ بھی آج دو جولائی کو ملا۔ یقیناً جانے کہ دل کو بہت سکون ملا جس کی کوئی انتہا نہیں ورنہ پچھلے شمارے تو ہر ماہ کی 4 یا 5 تاریخ تک ملتے تھے۔ ماہنامہ سچی کہانیاں پاکستان کے ان ڈائجسٹوں میں سے ایک ہے جنہیں پاکستان بلکہ دیگر ممالک میں بھی بہت ذوق و شوق سے پڑھا جاتا ہے۔ ہماری مثال بھی ایسی ہے کہ اگر کسی تناور درخت کو بانی نہ دیا جائے تو وہ سوکھ جاتا ہے اور اس کے پتے بکھر کر بجز مین کی نذر ہو جاتے ہیں۔ ہم بھی اگر ہر ماہ ماہنامہ سچی کہانیاں کا مطالعہ نہ کریں تو ہمیں کبھی چین و سکون نہیں ملتا۔ بہر حال سچی کہانیاں اپنی مثال آپ ہے اس کی جتنی تعریف کی جائے شاید بہت ہی کم ہے۔ (اگر آپ تعریف کرنے کی بجائے معیاری تنقید کریں تو زیادہ بہتر ہے۔) ابھی اگر میں اس کا حرف بہ حرف مطالعہ کروں پھر خط لکھوں تو شاید بلکہ یقیناً احوال میں شریک نہیں ہو پاؤں گا اس لیے ایک مختصر سا تبصرہ آپ کی خدمت میں ارسال ہے۔ امید ہے کہ جگہ دے کر حوصلہ افزائی کریں گے۔ سب سے پہلے میں ماہنامہ سچی کہانیاں کے توسط سے ان ماؤں، بہنوں، بھائیوں اور دیگر اقرباء سے دلی دکھ کا اظہار کرتا ہوں جن کے پیارے کوئٹہ میں ہونے والے سانحہ میں شہید ہو گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان سب کو صبر کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور پاکستان کے حالات کو دور سفر فرمائے۔ آمین! ثم آمین! اس ماہ کا ٹائٹل بہت خوبصورت اور دلکش تھا۔ ادارہ بھی دل کو بھا گیا۔ جب قارئین کا مستقل سلسلہ ”احوال“ پڑھا تو میں نے خود کو قارئین کے درمیان پایا۔ ایسے لگا کہ ہم سب اکٹھے بیٹھے ہیں۔ احوال پڑھتا چلا گیا جب میری نظر جبک آباد سے تعلق رکھنے والی سینئر لکھاری محترمہ پروفیسر صفیہ سلطانہ صاحبہ کے خط پر پڑی تو یقیناً جانے کہ میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں دل دنگ سا رہ گیا، داغ و دل گیا۔ (ان کا خط اتنا خوف ناک تو نہیں تھا!) مجھے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ یہ خط میری بہن پروفیسر صفیہ سلطانہ صاحبہ کا ہے۔ دو تین مرتبہ پڑھا پھر بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایک قلم کار کی معروف رائٹر سے اتنے سخت الفاظ استعمال کر سکتی ہے اور وہ محترم محمد سلیم اختر کے بارے میں ایسے تاثرات رکھتی ہیں۔ میں نے دوسرے پھر محمد سلیم اختر صاحب کی کہانی ”مسیحا اور موت“ پڑھی لیکن مجھے تو اس میں ایسا کوئی جھوٹ نظر نہیں آیا اور نہ ہی میرے خیال میں ادارے نے اپنے صفحے ضائع کیے ہیں بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ ادارے نے محمد سلیم اختر کا حق ادا کر دیا۔ محمد سلیم اختر کا ڈائجسٹوں کی دنیا میں بہت بڑا نام ہے۔ (شادایہ صفیہ سلطانہ کی ذاتی رائے ہے اور اس کا حق تو سب کو ہے۔) ”مسیحا اور موت“ اس معاشرے کی عکاس ہے نہ کہ جھوٹ پر مبنی ہے۔ باقی خطوط بھی اچھے تھے اور کہانیاں بھی اپنی مثال آپ تھیں۔ ہر کہانی میں ایک درد بھرا کردار چھپا ہوا تھا۔ (اور اس کردار کے کٹر پنے کی آواز پرچے سے باہر تک گونج رہی ہے۔) سلیم فاروقی صاحب! اس سے پہلے میں نے دو دفعہ کہانیاں، ایک غزل اور ایک آزاد نظم ارسال کی تھیں لیکن ابھی تک وہ شائع نہیں ہوئیں۔ برائے مہربانی انہیں قریبی اشاعت میں جگہ دے کر مشکور فرمائیں۔ میری طرف سے سچی کہانیاں کے تمام قارئین کو محبت بھرپور خالص سلام قبول ہو۔ (قارئین کی طرف سے وعلیکم السلام!)

✉ رحمہ یار خان سے وقاص حسین کا اظہار خیال! سلیم صاحب السلام علیکم! امید ہے اللہ پاک کی رحمت سے شیک ٹھاک فٹ فٹ ہوں گے۔ دعا ہے اللہ پاک اپنی رحمت کا سایہ ہمیشہ آپ پر رکھے اور آپ ہمیشہ ہستے



مسکراتے رہیں۔ سلیم صاحب آپ سے ایک شکوہ ہے اگر اجازت ہو تو کر دیں؟ (اب اگر ہم آئندہ پرچے تک اجازت نہ دیں تو چلیے آپ بھی کیا بد کریں گے کر دیں)۔ اچھا تو کر دیں؟ تو شکوہ کچھ یوں ہے سلیم صاحب آپ جو یہ لکھتے ہیں۔ ”اگر آپ کی کہانی ہمارے معیار کے مطابق ہوئی تو ہم شائع کریں گے۔“ پلیز یہ مت لکھا کریں۔ ایک تو پہلے ہی مجھے لکھنا نہیں آتا دوسرا آپ کے یہ الفاظ پڑھ کر ناامیدی مزید جاگ اٹھی ہے۔ (تم جانتے ہو کہ مایوسی کفر ہے۔ یہ تو ہم اس لیے لکھتے ہیں کہ نئے قلم کار زیادہ سے زیادہ محنت کریں۔) دل زور زور سے دھڑکنے لگتا ہے پھر یہ سوچ کر کھوڑی سی امید جاگتی ہے کہ کچھ کہانیاں میں کوئی بھی تحریر ضائع نہیں ہوتی۔ اگر ایسا ہوتا تو میری دونوں کہانیاں شائع نہ ہوتیں۔ (دیکھو تم نے اپنے سوال کا جواب خود ہی دے دیا۔) یہ کچھ کہانیاں ہی کی کرم نوازی ہے کہ وہ شائع ہوئیں۔ (اس میں تمہاری محنت بھی شامل ہے۔) اب آتے ہیں اس ماہ کے کچھ کہانیاں کی طرف، مجھے کہانی مکمل کرنا بھی اس لیے ابھی تک پورا نہیں پڑھ سکا مگر جتنا بھی پڑھا ہے ہر بار کی طرح زبردست تھا سوائے میری کہانی کے۔ (تم نے اپنی کہانی میں جن غلطیوں کی نشان دہی کی ہے وہ غلطیاں نہیں تھیں۔ کہانی کو ایک مرتبہ پھر غور سے پڑھو۔) میں دو کہانیاں اور ایک خیال آرائی بھیج رہا ہوں۔ زندگی رہی تو پھر ملیں گے تب تک کے لیے اجازت!

✽ سرگودھا سے مریم شاہ بخاری چچکی مہکتی آئی ہیں لکھتی ہیں۔ محترم سلیم فاروقی انکل! السلام علیکم! خدا تعالیٰ سے دعا گو ہوں کہ رحمتوں برکتوں خوشیوں کامیابیوں محبتوں اور چاہتوں کے کارواں ہمیشہ آپ کے گھر آگن اور دل میں ڈیرے لگائے رکھیں۔ (آمین! ثم آمین! احوال کی محفل میں آپ کی آمد نے چار چاند نہیں بلکہ کئی روشن جگہ گاتے چاند سمیت ستارے بھی لگا دیے۔ آپ کی تحریریں تو ہمیشہ ہی سے لاجواب ہوتی ہیں خواہ وہ کچھ کہانیاں میں ہوں یا پاکستان کے دوسرے ڈائجسٹوں میں۔ میرے لیے یہ بہت فخر و مان کی بات ہے کہ میں آپ جیسے عظیم قلم کار سے بذریعہ قلم ہی سہی مخاطب ہوں۔ سچ انکل! دل احترام سے لبریز ہے تو آنکھیں آپ سے ہم کلام ہونے کی خوشی میں جگمگا رہی ہیں۔ آپ دنیائے ادب کے ایک روشن ستارے ہیں۔ خدا کرے یہ ستارہ ہمیشہ یونی پوری آب و تاب سے چمکتا دکھائے اور دنیائے ادب کے نیلگوں آکاش پہ اپنی روشنی پھیلاتا رہے۔ آمین! ثم آمین! (مریم! لگتا ہے کہ سرگودھا میں آج کل کچھ فری مل رہا ہے اور بہت وافر مقدار میں مل رہا ہے۔) سلیم انکل! بس ایک گزارش ہے کہ اب کچھ کہانیاں سے جڑے رہے گا، کہیں غائب نہ ہو جائے گا۔ ٹھیک ہے ناں! اور ہمیشہ اپنے قلم سے دل موہ لینے والی کہانیاں لکھتے رہے گا۔ چلیے یہ تو ہوگئی آپ سے گفتگو اب ذرا شمارے پر تبصرہ کر لیا جائے۔ شمارہ کا ٹائٹل ہمیشہ کی طرح خوبصورت تھا۔ آخر دو عدد صنف نازک اپنے حسن کے جلوے جو تکبیر رہی تھیں۔ کچھ کہانیاں تو ہمیں ہر رنگ ہر روپ میں بھاتا ہے۔ سب سے پہلے تو میں اپنے پسندیدہ سلسلوں کی بات کروں گی۔ نمبرون ”شہید کی ڈائری“ اس کی تعریف ناممکن ہے۔ ادارہ زندہ کہانی، آتش جنوں اور مکھن کے بارے میں کیا لکھوں؟ ان کی تعریف کے لیے الفاظ کم پڑ جاتے ہیں۔ ہاں بس اتنا ضرور کہوں گی کہ ان سلسلوں کے قلم کار ہمیشہ سلامت رہیں اور خدا کرے زور قلم اور زیادہ اور زیادہ اور زیادہ! اعتراضات میں محمد غلام جو کبھی کو اعتراضی کہانی نے بہت متاثر کیا اور افسردہ بھی..... کاش کہ حسد اور انتقام کی آگ آپ کے اندر نہ بھڑکتی! ڈاکٹر نوذیر! آپ نے سچ کہا انسان ہر شے دولت سے خرید سکتا ہے مگر سکون نہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو معاف کرے۔ (آمین!) شوبز کی کہانی میں دیوی بھارتی کے بارے میں پڑھ کر دل میں

نہ تو کسی ہمدردی کا احساس جاگا اور نہ ہی اس کی موت کا افسوس ہوا۔ (کیوں بھی؟ کیا دیوی بھارتی نے تمہارے خلاف بھی کچھ کہا تھا؟) بہر حال عمر خطاب خان نے خوب لکھا۔ فقیر بابا کچھ خاص متاثر نہ کر سکی، کامنی کماری کی روح اچھی تھی۔ شیطانی محبت عام سی کہانی تھی۔ نام کی زندگی اچھی کہانی تھی۔ وہ ماں ہرگز نہیں تھی تو اس قدر بے حس تھی۔ ماں ہوتی تو ضرور اس رشتے کا تقدس جانتی۔ عارف شین روہیلہ کی کاوش اچھی لگی۔ انسان جتنے ہیں۔ یہ تو اب عام سی بات ہے انسانوں کا کہنا اب کوئی معنی نہیں رکھتا۔ سب بے حس ہو چکے ہیں، جانوروں سے بھی بدتر..... بہر حال اچھی کاوش تھی۔ ”انتقام کی آگ“ بھی ایک روایتی سی کہانی تھی۔ ”محبت کی بھینٹ“ رسم و رواج اور دولت کے شکنجے میں جکڑی کہانی تھی ایسی ہی بے شمار کہانیاں ہمارے معاشرے میں بکھری پڑی ہیں خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو اپنی محبت کو پالیتے ہیں اور کتنے بد قسمت ہیں وہ لوگ جو اپنا سب کچھ لٹا کر بھی خالی دامن خالی ہاتھ رہ جاتے ہیں۔ اس ماہ جو کہانیاں مجھے اچھی لگیں ان میں ”پچھتاہے کیا ہے ہوت“ ایک زندگی، ایک جہت، اور ”زندگی کے بازار میں“ شامل ہیں۔ نقد ہنرمیں کسی کی بھی شاعری متاثر نہیں کر سکی۔ منی میگ میں ”پانچواں شہر“ انتخاب آفریں انیس ”عظیم لوگ“ انتخاب شعیب محی الدین فریدی اور ”یقین و اعتبار“ ممتاز احمد کا انتخاب بہت اچھا تھا۔ بزم آرائی میں ام عادل اور علیہ بابر کا انتخاب اچھا تھا۔ خیال آرائی میں اصفاء فیصل اور شیخ معظم الہی کی خیال آرائی اچھی لگی۔ پسند اپنی اپنی میں صدیق عالم اسلام آباد کا بھیجا ہوا شعر بہت پسند آیا۔ میری کہانی کا شکر ہے! تبصرہ آپ سب پر چھوڑا۔ یہ تو تھا جی، شمارے پر تبصرہ، کھربے ذرا پانی پی لوں۔ غنا غنا، غنا غنا! (پانی کا ذکر مت کرو مریم! رمضان المبارک کا آغاز ہو چکا ہے اور آج پہلا روزہ ہے۔) اف بہت گرمی ہے جی ذرا پینچا تو آن کر دیں ہاں! کیا..... بجلی گئی ہوئی ہے..... اف اللہ! چلو چھوڑو جی، سلیم انکل! گزشتہ ماہ میری کہانی کو انعامی کہانی قرار دیا گیا تھا لیکن انعامی رقم تا حال موصول نہیں ہوئی بلکہ اس سے پچھلی کہانی کا انعام بھی موصول نہیں ہوا تھا۔ کیا کوئی مسئلہ ہے؟ (کوئی مسئلہ نہیں ہے ذرا صبر سے کام لو۔ انعامی رقم تمہیں جلد ہی مل جائے گی۔) اور ہاں! میری نظم جو میں نے بھیجی تھی کب تک شائع ہوگی؟ اب بھی کچھ انتخاب اور اپنی ایک چھوٹی سی نظم بھیج رہی ہوں، پلیز قریبی اشاعت میں جگہ دے کر ممنون فرمائیں۔ (یہ چیزیں باری آنے پر شائع ہوتی ہیں مریم!) آخر میں ناصر چاچا، منترہ جی، آئی رخسانہ، محمد سلیم اختر انکل، ممتاز احمد، شفیق شکی اور تمام پڑھنے والوں کو خواص بھر اسلام! اچھا اچھا جا رہی ہوں مزید آپ کا سر نہیں کھپاتی۔ اجازت دیں۔ (گویا تم سر بھی کھپاتی ہو؟ اس لیے میں کہوں کہ میرے سر میں درد کیوں ہو رہا ہے؟ ہاں! آخر میں تم سے یہ کہنا ہے کہ کہانیاں اور احوال کا خط کاغذ کی ایک طرف لکھا کرو۔ تمہارے توسط سے یہ بات ہم تمام قارئین اور لکھنے والوں کو بھی بتانا چاہ رہے ہیں۔)

✽ پورے والا سے رانا محمد شاہد کا اظہار خیال لکھتے ہیں۔ جولائی کا شمارہ آنکھوں ہی آنکھوں میں باتیں کرتی دوشیزہ کے ساتھ ملا۔ (اُس دوشیزہ سے کیا باتیں ہوئیں؟ تم نے نہیں بتایا؟) نئے رنگ و انداز لیے کچھ کہانیاں یقیناً قارئین کے دلوں میں وہی مقام حاصل کرے گا جو سہام مرزا صاحب کے دور میں تھا۔ ناصر رضا کا ادارہ معاشرے کے ایک سنگین جرم پہ بول رہا تھا۔ بے حس کسی بھی زندہ معاشرے کو مردہ کرنے میں بنیادی اور کلیدی کردار ادا کرتی ہے۔ کیا آج ہمارا معاشرہ زندہ و مہذب معاشرے میں شمار ہوتا ہے؟ حقیقت تو یہ ہے کہ آج ہم ایک بے حس اور بدبودار معاشرے میں جی رہے ہیں۔ قمر علی عباسی نے ایک خاص سیاح کی نظر پائی تھی



وہ جہاں سے بھی گزرتے ایک اچھی نگاہ ڈال کر بھی ہر تفصیل ان کے دماغ میں محفوظ ہو جاتی۔ قطرے سے شروع کر کے سمندر کی بات کرتے اور ذرے سے ابتدا کر کے پہاڑ تک کا سفر طے کر لیتے۔ فقیر سے بادشاہ بننے کی داستان ہو یا شاہ سے گدا، ان کے پاس لفظوں کا ایسا خزانہ تھا کہ جو ختم ہی ہونے میں نہ آتا تھا۔ اللہ انہیں غریقِ رحمت کرے۔ آمین! شہید کی ڈائری میں منزہ سہام صاحبہ نے درست لکھا کہ ہم لوگوں نے خود کو مشینوں کا محتاج بنالیا ہے، خود کو چیزوں کو محتاج کر لینے کی وجہ سے سکون نام کی چیز انسان سے بہت دور بھاگ گئی ہے چنانچہ جب جب انسان فطری زندگی کے قریب آیا اس کی زندگی میں بھی سکون آ گیا۔ انجیلیا جو لی کی کہانی دیکھیں سے بھر پور تھی۔ دیو یا بھارتی کو بھارتی فلم انڈسٹری کا معصوم ترین چہرہ کہا جاتا ہے۔ عمر خطاب خان نے بڑے اچھے انداز میں ان کی سچی کہانی پیش کی۔ کہانی اس لیے زیادہ دلچسپی کی حامل رہی کہ حال ہی میں بھارتی فلم انڈسٹری کی ایک نوا موزا اداکارہ جیا خان نے بھی خود کشی کر لی تھی۔ ہو سکے تو پروین بوبی اور جیا خان کی زندگیوں پر بھی کہانی دیجیے گا۔ جن قارئین نے میری کہانی ”گناہ کا بوجھ“ پسند کی ان کا شکریہ۔ کہانیوں پر تبصرہ اگلے ماہ ہی اس دفعہ ناظم ہائل نکل نہیں ملا۔ 5 جولائی کو میا نوالی سے آیا ہوں وہاں چھو پھو جان کا انتقال ہو گیا تھا۔ اُن کے لیے دُعاے مغفرت کی بھی درخواست ہے۔ (ادارہ آپ کے غم میں برابر کا شریک ہے اور قارئین سے درخواست ہے کہ وہ مرحومہ کے لیے دُعاے مغفرت کریں۔) آخر میں ایک گزارش آپ کے پاس میری تین عدد کہانیاں یہ عنوان ”صلہ“ ”زکھوالا“ اور ”خون کا پیاسا“ موجود ہیں۔ اُن کے انجام کے بارے میں کچھ بتائیے گا؟ (اُن کا انجام وہی ہوگا جو اس سے پہلے بھی ہوتا رہا ہے یعنی باری آنے پر شائع ہو جائیگی۔)

✉ لاہور سے گڈی آبا کی خیال آرائی محترم آداب! امید ہے آپ بخیریت ہوں گے۔ ہم ہر لمحہ اپنے ہم وطنوں کی سلامتی کی دعائیں کرتے ہیں۔ ایک مدت کے بعد اپنی تحریر دیکھ کر خوشی ہوئی لیکن اعزاز یہ ابھی تک نہیں ملا۔ حیرت ہے؟ (جلد ہی مل جائے گا) ایک اور کہانی ”ہاف سیٹ“ بھیج رہی ہوں۔ امید ہے پسند آئے گی اور جلد ہی اسے جگہ ملے گی۔ التماس ہے ہماری خبر چھاپ دی جائے اور بانی بھی ہماری خوب صورت تحریریں جسے قارئین بہت پسند کریں گے آپ کے پاس موجود ہیں جگہ دے کر شکریہ کا موقع دیں۔ ان کے چھپنے کے بعد اور بھی کہانیاں بھیجتی رہوں گی۔ امید ہے گھر میں ہر طرح سے خیریت ہوگی۔ تمام قارئین و معاونین کو سلام قبول ہو۔ اللہ تعالیٰ ہم سب پر رحم فرمائے اور پریشانیوں کے بادل چھٹ جائیں آمین! سفر نامہ بھیجنے کی بھی کوشش کروں گی۔ اللہ کرے ہمارا سچی کہانیاں اور دوشیزہ اسی طرح ترقی کی منازل طے کرتا رہے۔ (آج ہی تو آپ سے ٹیلی فون پر بات ہوئی تھی۔ آپ سے بات کر کے اچھا لگتا ہے۔)

✉ ملک ضیاء الرحمان پوری سے لکھتے ہیں۔ پیاری باجی منزہ سہام، ناصر رضا، سلیم فاروقی اور سب دوستوں کو بہت بہت سلام! (سب دوستوں کی طرف سے وعلیکم السلام!) امید ہے سب دوست اور سچی کہانیاں کی پوری ٹیم اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے خیریت سے ہوگی۔ جولائی کا شمارہ میں تاریخ کو ملا۔ سرورق پر حسین کی تصویر خوب صورت تھی۔ انکل سہام مرزا کی جوانی کی تصویر بڑی خوب صورت تھی۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ انکل سہام مرزا کو اپنی رحمت خاص میں جگہ نصیب فرمائے۔ آمین! باجی منزہ کو قدم قدم پر کامیابیاں نصیب فرمائے۔ آمین! انکل ناصر رضا کی بے حس بھی خوب تھی۔ آگے انکل سہام مرزا، قمر علی عباسی، بمن منزہ سہام کی تصویر دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ احوال زبردست تھا۔ جون کی انعام یافتہ کہانیوں پر محمد سلیم اختر، سلیم الماس مغل، ربیعہ خالد، صدف آصف، خلیل

جبار رانا محمد شاہد سب دوستوں کو بہت بہت مبارک باد۔ باجی منزہ سہام کی شہید کی ڈائری اچھی تھی۔ راجہ محمود کی ”ہانی ووڈ کی سارہ“ و قاص حسین کی ”اب پچھتائے کیا ہوتو“ کا شرف عید کی ”نام کی زندگی“ گڈی آبا کی ”عجیب عورت“ مور شاہد حسین کی ”شیطان کی محبت“ محمد اقبال زمان کی یہ ”خوشی دندنے“ مریم شاہ بخاری کی ”کالی رات کے بعد“ رضوانہ کوثر کی ”ماں جابا میرا“ نفیسہ فضل کی ”ایک زندگی ایک جہت“ محمد حسین کنول کی ”محبت کی بھینٹ“ سلسلی غزل کی ”انتقام کی آگ“ عائشہ صدیقہ ضمیر کی ”انسان بکتے ہیں“ محمد فہیم کی ”کامنٹی“ سمار کی ”روح“ علی صبا کی ”فقیر بابا کا خواب“ عمر خطاب خان کی ”دل کا کیا قصور؟“ ڈاکٹر فوزیہ کی ”کیا کیا میں نے؟“ غلام محمد جو کھیو کی ”کوئی راستہ نہیں“ تمام کہانیاں بہت زبردست تھیں بہت پسند آئیں۔ سلیم فاروقی کی ”آتش جنوں“ ارشد علی ارشد کی ”مکھنسی“ بہت زبردست جا رہی ہیں۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے۔ مسئلہ یہ ہے اچھا ہے۔ آپ کی ڈائری نقد ہنر خیال آرائی اور پسند اپنی اپنی سب دوست زبردست چھائے رہے۔ رضوانہ کوثر کے پچا کی وفات کا پڑھ کر افسوس ہوا۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں جگہ نصیب فرمائے اور لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ دُعا ہے اللہ تعالیٰ قمر علی عباسی کو اپنے جوار رحمت میں جگہ نصیب فرمائے۔ آمین! خالد زرینہ جو نیچو کو سالگرہ کی مبارک باد۔ آخر میں تمام دوستوں، دوست نما دشمنوں کو دل کی گہرائیوں سے سلام قبول ہو۔ (ضیاء الرحمان! ایسا لگتا ہے کہ تم نے سچی کہانیاں کی فہرست دیکھ کر تمام کہانیوں کی سلسلے وار تعریف کر دی۔ بندہ خدا! کچھ تبصرہ بھی کر لیا کرو۔)

✉ کراچی سے شہینہ ناز کا اظہار یہ! سلیم فاروقی صاحب! السلام علیکم! سچی کہانیاں سے وابستہ ہر فرد کو السلام علیکم! سب سے پہلے میں تہ دل سے آپ کی مشکور ہوں کہ آپ نے مجھے اپنی محفل احوال میں شامل کیا۔ اللہ رب العزت آپ کو دنیا اور آخرت کی ہر دولت سے مالا مال کر دے کوئی غم آپ کو چھو کر نہ گزرے۔ آمین! غم آمین! ایشل مشرقی حسن کا شاندار نمونہ پیش کر رہا تھا۔ سب سے پہلے اپنی من پسند سلسلے دار کہانی ”مکھنسی“ پڑھی۔ ارشد علی ارشد نے دین و دنیا کو یکجا کر کے انسانیت کو نیکی اور بدی کا بڑی خوبصورتی سے درس دیتے ہوئے کہا کہ والدین اور بچے ایک تسبیح کی طرح ہوتے ہیں بڑا دانہ والدین اور بانی دانے اولاد ہیں۔ تسبیح کے کچھ دانے بڑے دانے کے بہت قریب ہوتے ہیں اور کچھ دور مگر حیثیت و اہمیت سب کی یکساں ہوتی ہے۔ خوب مثال دی ہے۔ مصنف نے بڑی باریک بینی سے خانہ بدوش لڑکی کے دل کا حال بیان کیا ہے برائی کو اچھائی ختم کرتی ہے برائی کو برائی نہیں۔ انکل ناصر رضا کا ادارہ بے حس دل میں اتر گیا۔ ”آتش جنوں“ میں سلیم بھائی جو بھی لکھتے ہیں قلم کا حق ادا کر دیتے ہیں۔ سلیم بھائی نے ان پیرئس کی خامیوں کو اجاگر کیا ہے جو پیسا کمانے کی ہوس میں اندھے ہو جاتے ہیں مائیں فیشن شو اور پارٹیز سے اپنی اولاد کے لیے فرصت ہی نہیں نکال باتیں بنے ان کی محبت کو ترستے ہیں۔ شہید کی ڈائری میں شہید نے بڑی سادگی سے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ چنیلی کی بھینٹی بھینٹی خوشبو ماں جی منکے کے گرد چنیلی کے پھول دھاگے میں باندھ دیتی۔ اس نے تو ہمیں بھی مہکا دیا۔ مریم شاہ بخاری کی ”کالی رات کے بعد“ میں احمد رضا نے ظالم ملک اللہ یار کو کیف کر دار تک پہنچا کر دلربا کو ہمیشہ کے لیے اپنے دل میں قید کر لیا۔ اور لیس مسج کی ”اب کیسے ممکن ہے؟“ غضب کی تھی۔ ”اب پچھتائے کیا ہوتو“ میں ریاض کے بگڑنے میں والدین کا ہاتھ زیادہ تھا ان کا بے جالا ڈیپارٹمنٹ کا ماس کی حوصلہ افزائی کرنا بگڑنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اللہ پاک! انسانوں کو صراطِ مستقیم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین! ”کوئی راستہ نہیں“ میں محمد جو کھیو خود پسندی اور حسد کی



اگست 2013ء

# احوال

میں سچی کہانیاں کی کہانیوں پر سیر حاصل تبصرہ اپنی تصویر کے ساتھ ارسال کر رہا کر رہی ہوں۔ اس خط کو احوال میں شامل کر لیں۔

نام اور مکمل پتا:

اگست 2013ء

## سچی کہانیاں

میں اپنی پسند کا تراشہ بھیج رہا/ رہی ہوں جسے میں نے  
نامی کتاب کے صفحہ نمبر..... سے اتارا ہے۔  
میرا نام و پتا:

MINI  
MAG

اگست 2013ء

## پسند اپنی اپنی

میرا پسندیدہ شعر الگ کاغذ پر ہے اسے شائع کر دیں

شاعر:

شعر بھیجنے والے کا نام:

پتا:

آگ میں جل کر انتقام لینے کے لیے ساجد اور نرگس میں طلاق کرادی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کھیل ہی کھیل میں ضمیر کی عدالت میں گناہ کر بیٹھے گا۔ اس کا انجام دو انسانوں کی موت ہوگا۔ ”ہالی ووڈ کی ساحرہ“ میں انجیلینا جولی کی کہانی بڑی دردناک اور سبق آموز تھی۔ انسانیت سے دی محبت ہی اس کی زندگی میں عروج کا سبب بنی۔ ڈاکٹر فوزیہ کی ”کیا کیا میں نے؟“ میں بعض اوقات انسان زندگی اور حالات سے لڑتے لڑتے نیکی اور ہمدردی کے درمیان جھٹک جاتا ہے اور مسیحائی کرنے والے ہاتھ موت کا باعث بن جاتے ہیں۔ بہر حال اس نے اپنی غلطی کا مداوا کیا۔ اللہ معاف کرنے والا ہے وہ بڑا غفور الرحیم ہے۔ ”فقیر بابا کا خواب“ بہترین کہانی تھی۔ دیویا بھارتی کی کہانی نے شمارے کو چار چاند لگا دیئے۔ ”ذکر جل پری کا“ میں ڈنمارک کا سفر نامہ وہاں موسم گرما میں خواتین کا لباس سے پرہیز، اخلاقیات کے علاوہ معاشیات پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔ میاں نواز شریف خوش نصیب شخصیت ہیں۔ نیلے پانیوں کے جزیرے کو پن بیگن میں صدیق ملک کے کمرے میں لگی میاں نواز شریف کی تصویر ان سے محبت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ”نام کی زندگی“ میں غبارے والا کی کہانی بڑے خوب صورت انداز میں پیش کی گئی ہے۔ نفسیہ فصل کی ”ایک زندگی ایک جہت“ اس ماہ کی ٹاپ کلاس کہانی ہے۔ حمیدہ کی فریاد سسرال کی خدمتوں کا صلہ اللہ پاک نے خوب دیا۔ عروہ عدنان کی ”زندگی کے بازار میں“ نے دل دہلا کر رکھ دیا۔ ایک عورت جسے وہ اپنی محسن سمجھتی تھی اس نے اسے 14 سالہ بچی کو کوشے پر بیچ دیا اس کا خاندان زلزلے کی نذر ہو گیا تھا۔ ”محبت کی بھینٹ“ میں زمیندار اپنے دوست کی دوستی کو بالائے طاق رکھ کر سات بے گناہ انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے۔ ”انتقام کی آگ“ میں نازش کو مرد ذات سے نفرت ہوتی ہے مگر شوہر اور ساس کے اعلیٰ ظرف اور بلند کردار کی وجہ سے نفرت کے آگے ہتھیار ڈال دیتی ہے۔ انسان بکتے ہیں وہ ماں بھی، کاٹی کماری کی روح یہ سب بھی اچھی تھیں۔ شاہد حسین کی ”شیطان محبت“ بہتر تھی۔ صائمہ سحر کو میری جانب سے شادی کی ڈھیروں مبارک باد۔ خیال آرائی میں اصفاء فیصل کے خیال نے دل کو چھو لیا۔ نقد ہنرمیں ثانیہ بھٹی کی نظم ”اچھا لگتا ہے“ بہت شاندار ٹھنڈی ہوا کے جھونکے کی ماندگی۔ آپ کی ڈائری میں احمد کمال کا حسن انتخاب کمال کا تھا۔ میں اپنی ایک کہانی اور قطعہ بھیج رہی ہوں۔ اگر آپ کے معیار پر پوری اترے تو شمارے میں ضرور جگہ دیتیجیے گا اور اپنی رائے سے ضرور آگاہ کیجیے گا۔ ”سچی کہانیاں“ کے ذریعے معاشرے میں چھپا سچ کھل کر سامنے آتا ہے یہ دہلی انسانیت کی بڑی خدمت ہے۔ (تمہاری کہانی ابھی پڑھی نہیں ہے۔) ”سچی کہانیاں“ کی ساری ٹیم اور تمام قارئین کرام کو رمضان المبارک کی بابرکت اور مقدس آمد پر ڈھیروں خوشیاں مبارک ساتھ میں بیٹھیں عید مبارک! (ہاں احوال کے ہر خط کے ساتھ تصویر بھیجنا ضروری نہیں ہے۔)

اس ماہ کی گیارہ تاریخ تک جو خطوط ہمیں ملے تھے وہ ہم نے ”احوال“ میں شامل کر لیے ہیں۔ یاد رکھیں ہمیں خط موصول ہونے کی آخری تاریخ ہر ماہ کی دس ہے۔ ایک بات اور ”احوال“ کے خط پہ اور کچھ نہ لکھیں مثلاً ”نظم خیال آرائی یا آپ کی ڈائری وغیرہ۔ ہر چیز کے لیے علیحدہ کاغذ استعمال کریں۔

اس کے ساتھ ہی ہمیں اجازت دیں۔ بہ شرط زندگی آئندہ ملاقات ہوگی۔ اُس وقت تک اللہ حافظ!

آپ کی دعاؤں کا طالب  
سلیم قادری

☆☆☆

## شہید کی اڈا

### مذہب

کیا روتی ہوئی تھی سارا گاؤں اٹھا ہوا ہوتا تھا ہر گھر سے پراٹھوں کی خوشبو آ رہی  
ہوتی تھی۔ مسجد میں بھی خوب رٹ ہوتا گاؤں کا ہر شخص جو مسجد میں موجود ہوتا تھا  
پھر کھڑا کر میں ملی تان کر سو جاتا۔ ماں جی بھی سونے دیتیں۔۔۔۔۔

### شہید کی سوچ بچی ایک دل کا رستہ

عزیز ہم وطنو!۔۔۔۔۔

رمضان مبارک! میں دل سے دعا کرتا ہوں کہ یہ رمضان آپ سب کی زندگیوں میں بہترین تبدیلیاں لائے اور تمام  
مسلمان اس بابرکت مہینے میں بے حساب رحمتیں برکتیں اور بخشش سمیٹ سکیں۔ (آمین!) اللہ اس بابرکت ماہ کے صدقے  
میرے وطن اور میرے ہم وطنوں کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔ بہت خوشی کی بات ہے کہ اس بار پورے ملک میں ایک ساتھ  
رمضان شروع ہوا۔ آپ سب عید بھی اچھی منائیں گے شروعات تو بہت اچھی ہوئی ہے۔ جب میں دنیا میں موجود تھا  
تب تو رمضان کا چاند اور عید کا چاند پورے وطن میں ایک ساتھ ہی نظر آتا تھا۔ جو رمضان گھر پر ماں جی اور ابا جی کے ساتھ  
گزرتا تھا اس کی تو کیا بات تھی۔ ماں جی سحری میں گرم گرم پرائے کھن کے پیڑے کے ساتھ دیتیں ساتھ میں بڑا سا لکڑی کا  
گلاس بھر میں اور ابا جی فجر کی نماز کے لیے مسجد جاتے۔ کیا روتی ہوئی تھی سارا گاؤں اٹھا ہوا ہوتا تھا ہر گھر سے پراٹھوں کی  
خوشبو آ رہی ہوئی تھی۔ مسجد میں بھی خوب رٹ ہوتا گاؤں کا ہر شخص جو موجود ہوتا تھا پھر گھر آ کر میں ملی تان کر سو جاتا۔  
ماں جی بھی سونے دیتیں۔ وہ جانتی تھیں کہ نوکری پر نیند پوری نہیں ہوتی۔ ویسے بھی اگر تو م کے محافظ سو گئے تو ملک اور قوم کا  
کیا ہوگا؟ ہمیں تو سوتے میں بھی جاگنا پڑتا تھا۔ ذمے داری بھی تو بہت بڑی تھی۔ اصل روتی تو افطار پر ہوتی۔ سب لوگ  
افطاری تیار کر کے کسی ایک کے گھر جمع ہو جاتے، مل کر افطار کرنے کا جو مزہ ہے وہ اکیلے میں کہاں۔ بڑا مزہ آتا تھا۔ چچی  
پیاز والے کچوڑے بہت مزے کے بناتی تھیں۔ ماں جی کے مھالے والے کچھولوں کا تو پورے گاؤں میں مقابلہ نہیں  
تھا۔ لڑکیاں بالیاں موسیقی پھیل کاٹ کر کھیتیں، لیموں شربت پیتے ہی ساری تھکن اتر جاتی تھی۔ مجھ میں لازماً نہ سے لایا تھا۔  
سب کو تازہ اور تھنڈ جیسے میٹھے مہجور بڑے پسند آتے تھے۔ مغرب کی نماز بڑھ کر روٹی کھانے کے بعد ماں جی الچی والی چائے  
ضرور بناتی تھیں۔ عشاء کی نماز بڑھ کر میں چار پانی پر لپٹ کر تارے گنتا رہتا۔ ماں جی بار بار پانی کا گلاس تھماتی رہتیں۔  
”پتر۔۔۔۔۔! پانی تو کم پیتا ہے۔ یہ تو اللہ کی سب سے اچھی نعمت ہے خوب پیا کر۔“ اور پھر میں اپنی بیٹی بیٹی کو ہاتھوں کو سننے  
سننے سو جاتا۔ اب تو یادیں ہیں۔۔۔۔۔ آپ لوگ خوش نصیب ہیں کہ رمضان کا بابرکت ماہ آپ کے درمیان ہے۔ خوب  
عبادت کیجیے۔ سحری اور افطار میں آس پاس موجود لوگوں کو ضرور شامل کیجیے۔ عبادت کی عبادت اور سعادت کی سعادت۔

خوش رہیے  
مہینہ

## جہانگیروں سے محلات ہنگ

### راجہ محمود

مصائب و آلام کے اس دور میں جب بھوک و محنت نے اتفاق فاؤنڈریز کو کھوٹی تحویل میں  
لے لیا تھا اور شریف خاندان کا ایک زیر پولیٹ پر آ گیا تھا اس وقت میں شریف  
کے بڑے صاحبزادے نواز شریف نے سیاست میں آنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔۔۔۔۔

### دراغی اس میں شریف کی مصائب

محنت، جدوجہد، منزل پر نظر، مشکلات و مصائب  
اجداد کی جینز میں شامل تھی۔ یہ خاندان کشمیر النسل  
قدیم اور حلیہ مندی سے ڈٹے رہتا، یہ وہ خوبیاں  
تھا۔ خاندان کے ایک بزرگ میاں رمضان محنت



مزدوری کر کے غربت کے عفریت سے برسرِ پیکار  
ہوتی چلی آ رہی تھیں۔ اس خاندان کی تاریخ  
حوصلوں، امنگوں، جذباتوں، کامیابیوں سے عبارت  
انہوں نے ہجرت کی ٹھانی۔ وہ اپنے آبائی گاؤں





وزیر اعظم نواز شریف اور بیگم کلثوم نواز اپنے گھر کے لان میں

کے دو صاحب زادے تھے، چھوٹے کا نام شہباز شریف تھا۔ وہ مصائب و آلام کے اُس دور میں جب بھٹو حکومت نے اتفاق فائڈریز کو حکومتی تحویل میں لے لیا تھا اور شریف خاندان یکا یک زیرِ دپوائنٹ پر آ گیا تھا اس وقت میاں شریف کے بڑے صاحب زادے نواز شریف نے سنجیدگی سے سیاست میں آنے کا فیصلہ کر لیا تھا حالانکہ اُن کے خاندان میں کسی کا سیاست سے دور دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ والد تو ایک کاروباری شخص تھے جنہوں نے زندگی میں سب کچھ اپنے کاروبار اور محنت سے حاصل کیا تھا۔ نواز شریف کے چچا اور دوسرے رشتے دار بھی سیاست کے نزدیک بھی نہیں گئے تھے تاہم نوجوان نواز شریف کا سیاست میں آنے کا فیصلہ ان حالات کا نتیجہ تھا جو اُن دنوں خاندان پر گزر رہے تھے۔ اُن کے ذہن کے کسی گوشے میں شاید اس خیال نے جڑ پکڑ لی تھی کہ پیسے کے ساتھ پاور بھی ہونا ضروری ہے۔ وہ 1972ء کا زمانہ تھا جب بھٹو نے شریف خاندان کی انڈسٹری کو نیشنلائز کیا تھا۔ نواز شریف کو اس بات کا شدید دکھ تھا کہ اُن کے والد کی شب و روز کی محنت یوں اچانک حکومتی دسترس میں

کو بھارت کے ٹائنا گروپ کے مقابلے کی فرم بنانے کے خواہش مند تھے۔ ان کا یہ ایسا خواب تھا جس کی تعبیر قریب قریب نامکن تھی مگر انہوں نے اپنی محنت کا رو باری سوجھ بوجھ اور وقت و مواقع کے بہترین استعمال سے اپنے اس خواب کو سچ کر دکھایا اور ایک دن آ یا کہ ان کی فرم ٹائنا گروپ کے عمر کی فرم بن گئی۔ ان کے خاندان کا شمار پاکستان کے 22 امیر ترین خاندانوں میں ہونے لگا۔ وہ اور ان کے بھائی کئی ملکوں کے مالک بن چکے تھے۔ وقت کا پیسہ گھومتا رہا پاکستان میں حکومتیں بدلتی رہیں 71ء میں بھٹو کا راج آیا، بھٹو حکومت نے تمام صنعتوں کو قومی تحویل میں لے لیا۔ ان میں اتفاق فائڈریز بھی شامل تھی۔ وہ وقت شریف خاندان پر انتہائی کڑا تھا۔ حکومت کے اس اقدام سے میاں شریف اچانک عرش سے فرش پر آ گئے تھے۔ تمام اپنی حوصلوں کے مالک میاں شریف نے ہمت ہارنا نہیں سیکھا تھا۔ ان مصائب بھرے حالات میں بھی انہوں نے 'صفر' سے کام کا آغاز کیا اور بھٹو دور میں ہی دوبارہ پانچ ٹیلیس لگا کر ثابت کر دیا کہ وہ غیر معمولی انسان ہیں اور ان کے حوصلے کو شکست دینا آسان نہیں، تاہم ابتلا کے اس دور میں میاں شریف کے بڑے صاحب زادے کی سوچ میں نمایاں تبدیلی آئی تھی۔

27 سالہ نواز شریف ایک لائق ذہن و فطین اور کچھ کرنے کے جذبوں سے سرشار میاں شریف کا بڑا سپوت تھا جو خاندان کے کاروباری امور بہت مہارت سے چلاتا تھا۔ اس نوجوان کے دو ہی شوق تھے، بزنس کو آگے بڑھانا اور کرکٹ کھیلنا۔ یہ نوجوان اعلیٰ تعلیم سے لیس تھا۔ اس کے پاس بزنس اور آرٹ کی ڈگری بھی تھی جو اس نے گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور سے حاصل کی تھی جبکہ قانون کی ڈگری پنجاب یونیورسٹی لاہور سے حاصل کی تھی۔ میاں شریف

رہا، اس عرصے میں باقی تین بھائی بھی لاہور آ گئے اور اسی بھٹی پر ملازمت کرنے لگے۔ نو برسوں میں انتھک محنت کرتے ہوئے ان بھائیوں نے اتنی رقم جمع کر لی تھی کہ اپنی بھٹی لگانے پر غور کرنے لگے۔ تمام بھائیوں میں محمد شریف چونکہ پڑھے لکھے تھے چنانچہ ان کی قیادت میں باقی تین بھائیوں نے ایک کاروباری ادارے کی بنیاد رکھی جس کا نام "شریف برادرز" رکھا گیا۔ اُن دنوں دوسری جنگ عظیم زوروں پر تھی جس کے باعث لوہے کی مانگ میں بے حد اضافہ ہو گیا تھا لہذا لوہے کا کاروبار خوب پھل پھول رہا تھا۔ شریف برادرز کا کاروبار بھی تیزی سے ترقی کرنے لگا۔ تھوڑے عرصے بعد بھائیوں نے باہمی مشورے سے اپنے ادارے کا نام "شریف برادرز" سے بدل کر "اتفاق برادرز" رکھ دیا۔ اُس زمانے میں کاروبار پر ہندوؤں کی اجارہ داری تھی۔ مسلمان بہت کم تجارت کرتے تھے مگر محمد شریف نے اس معاملے میں ہندوؤں کو بھی مات دے دی تھی۔ انہوں نے اپنے چھ بھائیوں کے ساتھ مل کر اس ہندو کی بھٹی خرید لی جہاں وہ مزدوری کیا کرتے تھے۔ یہ 1937ء کا دور تھا۔ 1947ء تک یعنی دس برسوں کے اندر اندر ان بھائیوں نے اپنی انتھک محنت، جدوجہد اور آگے بڑھنے کی جستجو میں کاروبار کو تیزی سے ترقی کی جانب ہمکنار کیا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد میاں شریف نے قائد اعظم کے کہنے پر اپنے کاروبار کو عبادت سمجھ کر آگے بڑھایا۔ قائد اعظم کی خواہش تھی کہ مسلمان صنعت و حرفت اور تجارت میں آگے آئیں کیونکہ اُس وقت مسلمان اس شعبے کی جانب راغب نہیں تھے۔ میاں شریف نے اپنے قائد کے حکم پر لبیک کہتے ہوئے آگے بڑھنے کی ٹھانی۔ ان کی شبانہ روز محنت سے اتفاق برادرز پھلتا پھولتا چلا گیا۔ میاں شریف اپنے کاروبار



منظور احمد وٹو، جنرل ضیاء الحق اور نواز شریف

شوبیاں سے نکلے اور مشرقی پنجاب کے شہر امرتسر کے ایک گاؤں جاتی امر اکارن کیا۔ یہاں رہتے ہوئے وہ محنت مزدوری کر کے حالات کا مقابلہ کرتے رہے۔ میاں رمضان کے سات بیٹے تھے۔ ساتوں کے ساتوں محنتی فرماں بردار تھے۔ پنجاب میں جس کے سات بیٹے ہوتے تھے وہ خوش قسمت کہلاتا تھا۔ واقعی خوش بختی دولت و خوش حالی کی صورت ان کے در پر دستک دینے والی تھی۔ یہ 1930ء کا زمانہ تھا، ان ہی دنوں میاں رمضان کے دو بیٹوں برکت اور شفیع نے روزگار کی غرض سے لاہور جانے کی ٹھانی۔ باپ نے یہ خوشی اجازت دے دی کہ بیٹوں میں کچھ کرنے اور آگے بڑھنے کی لگن تھی۔ لاہور پہنچنے پر دونوں بھائی ایک بھٹی پر ایک روپیہ پورے ملازم ہو گئے۔ دونوں بھائی اس بھٹی پر انتہائی محنت سے کام کرتے تھے۔ وہ دوسرے مزدوروں سے کئی گھنٹے زیادہ کام کرتے۔ شبانہ روز اس محنت کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کے پاس کچھ پیسے جمع ہونے لگے۔ کچھ عرصے بعد ان دنوں نے اپنے دو چھوٹے بھائیوں محمد شریف اور محمد بشیر کو بھی لاہور بلوا کر وہیں ملازمت دلوا دی۔ محمد شریف کو بڑے کا بہت شوق تھا لہذا اسے ایک مقامی اسکول میں داخل کر دیا گیا۔ وقت گزرتا



مکہ نبوی میں نماز کے بعد نواز شریف لوگوں سے ملاقات کرتے ہوئے

میں بھی کوئی رکاوٹ پیدا نہ کی جائے کیونکہ یہ ان کا جمہوری حق تھا۔ انتظامیہ میں بہت سوں نے اس فیصلہ کو ناپسند کیا ان میں جرنیل بھی شامل تھے اور اس فیصلے کو نواز شریف کی سیاسی نا تجربہ کاری پر محمول کیا گیا۔ بے نظیر کو لاہور ایئر پورٹ پر اتارنا تھا پھر بے نظیر آئیں اور لاکھوں کے مجمع نے ان کا پر جوش استقبال کیا مگر کسی بھی قسم کی کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی پولیس نے بھی ان کے ساتھ کوئی برا سلوک نہیں کیا۔ اس حسن عمل پر بے نظیر سمیت پیپلز پارٹی کے سب ہی لیڈر حیران تھے۔ نواز شریف کا یہ فیصلہ جس پر سب ہی نے ناک بھوں چڑھائی تھی اس کے نتائج بہت اچھے نکلے تھے۔ نواز شریف اپنی فراست کے پہلے امتحان میں کامیاب ہو گئے تھے گوکہ نواز شریف نے اچھی سیاسی روایت قائم کی تھی مگر اس اقدام پر ان کے خلاف مخالفانہ پروپیگنڈہ شروع ہو گیا کہ نواز شریف تو بے نظیر کے ساتھ مل گیا ہے۔ جرنل ضاء کو نواز شریف کے حوالے سے بھڑکایا گیا۔ پاکستان کی اسٹیبلشمنٹ اور زمیندار کلاس نواز شریف کے خلاف ہونا شروع ہو گئی تھی۔ دراصل میاں نواز شریف پرانی ڈگر کی سیاست پر نہیں چل رہے تھے بلکہ سیدھی

یقینی ہو کیونکہ ہمارے یہاں لوگوں کے ذہنوں میں بد قسمتی سے یہ سوچ رائج ہوئی ہے کہ ہارنے والے امیدوار کو ووٹ دینے سے ان کا ووٹ ضائع ہو جائے گا۔ نواز شریف کی مقبولیت کا ایک سبب ان کے والد میاں شریف کا ایماندار و دیانت دار ہونا بھی تھا۔ میاں شریف اپنے ابتدائی ایام میں جب سریا اور گارڈ رو غیرہ بیچا کرتے تھے تو وہ ناپ تول کے سخت پابند تھے حالانکہ لوہے کے کاروبار میں کم تولنا عام سی بات تھی۔ اس کے علاوہ میاں شریف کاروباری لین دین میں بھی کھرے تھے اسی لیے ان کی مارکیٹ میں بہت اچھی ساکھ تھی۔ باپ کی یہی ساکھ برسوں بعد نواز شریف کے کام آ رہی تھی چنانچہ الیکشن ہوئے تو نواز شریف واضح اکثریت سے اپنے حلقہ انتخاب میں کامیاب ہوئے تھے۔ انہوں نے 63,000 ہزار ووٹ لیے تھے جبکہ ان کے نزدیک ترین امیدوار کے محض چھ ہزار ووٹ تھے۔ نواز شریف نا صرف صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے بلکہ کچھ دنوں بعد صوبہ پنجاب کے وزیر اعلیٰ کی مسند پر بھی بیٹھ گئے جبکہ مرکز میں محمد خان جوینجو کی حکومت قائم ہوئی۔ ان دنوں سیاسی طور پر ماحول انتہائی کشیدہ تھا گوکہ ملک میں جمہوریت بحال ہو چکی تھی مگر یہ ایک جرنل زدہ جمہوریت تھی۔ سختیوں اور پابندیوں کا یہ عالم تھا کہ کوئی سیاسی آدمی ایک صوبے سے دوسرے صوبے میں نہیں جاسکتا تھا۔ لوگ مذاق میں کہا کرتے تھے کہ سندھ سے پنجاب سفر کرنے کے لیے جرنل ضاء کے ویزے کی ضرورت ہے۔ ان حالات میں بے نظیر بھٹو وطن واپس آ رہی تھیں۔ بے نظیر کا پاکستان آنا وزیر اعلیٰ نواز شریف اور وزیراعظم محمد خان جوینجو کے جمہوری اعضاء کا امتحان تھا لہذا حکومتی سطح پر یہ فیصلہ کیا گیا کہ بے نظیر بھٹو کی آمد میں روڑے نہ اٹکائے جائیں ان کے جلسے، جلوسوں

آغاز ہوا۔ 1985ء میں غیر جماعتی انتخابات ہوئے تو پیپلز پارٹی سمیت بہت سی دیگر جماعتوں نے ان کا بائیکاٹ کر دیا۔ نواز شریف نے لاہور کے ایک حلقے سے صوبائی اور قومی اسمبلی کے الیکشن لڑنے کا اعلان کیا۔ انہوں نے اپنے حلقہ انتخاب میں بہت زبردست کمپین چلائی۔ اس سلسلے میں انہوں نے ایک فرم کو ٹھیکہ دیا تھا جس نے وکٹس بینرز کے ذریعے ان کی الیکشن مہم کو چار چاند لگا دیے۔ یہی نہیں بلکہ بینرز اور اسٹیکرز پر بہترین الفاظ اور نعروں کی عبارت کے لیے اعلیٰ ذہین دماغوں کے مشورے سے باقاعدہ الیکشن مہم کا اہتمام کیا گیا۔ نواز شریف خود چل کر گھر گھر جاتے تھے اور لوگوں سے ووٹ کی اپیل کرتے تھے۔ واضح رہے یوں ووٹ مانگنے کا یہ کام ایک ایسا نوجوان کر رہا تھا جو ایک صنعت کار کا بیٹا تھا تاہم نواز شریف کو اندازہ تھا کہ برنس کچھ اور ہوتا ہے اور سیاست و کھری ٹائپ کی شے کا نام ہے جس کے تقاضے بھی وکھری ٹائپ ہوتے ہیں۔ نواز شریف جس علاقے سے انتخاب لڑ رہے تھے وہاں ان کی کشمیری برادری اور آرائیں برادری کی اکثریت تھی۔ ان دنوں آرائیں برادری کے سرخیل میاں محمد اظہر ان کے ساتھ تھے۔ نواز شریف کی مقبولیت اپنے حلقے میں بہت تیزی سے اوپر کی جانب جا رہی تھی جس سے یہ تاثر ابھر رہا تھا کہ کوئی بھی امیدوار ان کا مقابلہ نہیں کر سکے گا اور وہ با آسانی جیت جائیں گے تاہم یہ بات صرف چند قریبی لوگوں کے علم میں تھی کہ اس تاثر کو پھیلانے کے لیے بھی نواز شریف نے ایک ٹیم تشکیل دی تھی جس کے ارکان کا کام ہی یہ تھا کہ پبلک مقامات پر بیٹھ کر نواز شریف کی جیت کے تاثر کو لوگوں کے ذہنوں میں بٹھادیا جائے کیونکہ الیکشن میں عام طور پر پبلک اُسی امیدوار کو ووٹ دیتی ہے جس کی جیت



شہید بینظیر بھٹو اور نواز شریف میثاق جمہوریت کے موقع پر

چلی گئی تھی۔ نواز شریف نے ہوش سنبھالتے ہی اپنے والد کو ہمیشہ محنت کرتے ہی دیکھا تھا۔ انہیں اس بات کا اندازہ تھا کہ والد نے ان صنعتوں کو اپنے خون جگر سے سیچا تھا پھر بھلا نوجوان نواز شریف کو کیسے گوارہ ہوتا کہ والد کی دن رات کی محنت سے بنائی ہوئی امپائر اس طرح کسی کی تحویل میں چلی جائے خواہ وہ حکومت ہی کیوں نہ ہو چنانچہ انہوں نے سیاست کے میدان میں قدم رکھنے کا فیصلہ کر لیا۔ شروع میں نواز شریف نے بھٹو مخالف سیاست دانوں سے راہ و رسم بڑھائی لیکن پھر بھی سیاست میں کچھ زیادہ فعال یا عملی طور پر حصہ نہیں لیا۔ نواز شریف نے ایئر مارشل (ر) اصغر خان کی جماعت تحریک استقلال میں شمولیت ضرور اختیار کی تھی مگر وہ بیک گراؤنڈ ہی میں رہے۔ 1977ء میں جرنل ضاء الحق نے جب بھٹو حکومت کا تختہ الٹا تو جرنل غلام جیلانی پنجاب کے گورنر بنے۔ گورنر موصوف نے اپنی کابینہ میں نوجوان نواز شریف کو بھی بطور صوبائی وزیر داخلہ شامل کر لیا۔ اس طرح نواز شریف کے سیاسی سفر کا





نواز شریف پارٹی درکار کے ہمراہ

سادہ سیاسی پگڈنڈی پر دواں دواں تھے جبکہ اقتدار کی گدی پر ایسی شخصیت کی ضرورت ہوتی ہے جو ظلم کے پہاڑ توڑنے، جلے جلوس نہ کرنے دے اور ہر ایک کو اپنے جوتے کی نوک پر رکھے جبکہ یہ نیا نیلا حکمران جس کا نام نواز شریف تھا، اس فریم میں فٹ نہیں بیٹھ رہا تھا۔ وہ سیدھا سادہ ساحاکم تھا جس کا مقصد صرف اور صرف اپنی رعایا کی خدمت اور اُن کے مسائل حل کرنا تھا۔

بہر حال غیر جماعتی انتخابات سے معروض وجود میں آنے والی اسمبلیوں کے اراکین کو جماعتی شکل دی جا چکی تھی اور اس سرکاری جماعت کا نام پاکستان مسلم لیگ رکھا گیا تھا۔ اسمبلی کے چند ایک اراکان کے سوا سب ہی اس جماعت کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے تھے۔ یہ جماعت کیا تھی بلکہ بھان متی کا کنبہ تھا جس کی نہ کوئی سمت تھی نہ قائد۔ صوبہ کی حد تک اس کی راہبری میاں نواز شریف کو سونپ دی گئی تھی۔ دراصل ایک فوجی آمر نے اپنی حکومت چلانے کے لیے جمہوریت کا یہ سواگت رچایا تھا۔ ان حالات میں نواز شریف بہت کڑھتے تھے، وہ اپنی فطرت کے مطابق کوئی غلط کام نہیں کرنا چاہتے تھے

مگر مجبوراً انہیں اپنے ممبران کے لیے بعض بے ضابطگیاں برداشت کرنا پڑتی تھیں۔ ایک آمر کے اس ناپص نظام کو آگے بڑھانے کے لیے وہ ممبران کے خڑے سہتے تھے۔ یہ ایک عجیب صورت حال تھی، آمر پس منظر میں چلا گیا تھا اور عوامی غیض و غضب کا سامنا کرنے کے لیے نواز شریف جیسے سیاسی مہرے سامنے تھے۔ اقتدار کی پر خار کرسی پر بیٹھے میاں صاحب کے لیے اصل مسئلہ پیپلز پارٹی بنی ہوئی تھی جو عوام میں مقبول ہو رہی تھی اور اس نظام کو جعلی قرار دے رہی تھی۔ اس موقع پر نا تجربہ کار نواز شریف کی سیاسی و ذاتی بصیرت کا امتحان تھا کہ وہ

معاملات کو کیسے سنبھالتے ہیں۔ میاں صاحب نے انتہائی دانش مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے حالات کو قابو میں کیا تھا۔ وہ کام جو مارشل لاء کی سختیاں نہیں کر سکتے تھے، وہ نواز شریف کی شرافت، نفاست، عزم اور انتظامی صلاحیت نے کر دکھایا تھا۔ نواز شریف بطور حاکم، سیاسی عناصر کے لیے نرم گوشہ رکھتے تھے مگر عادی مجرموں کے لیے وہ بہت سخت تھے۔ فوری اور سخت انصاف ان کی ترجیح ہوتا تھا۔ وہ جرائم سے پاک معاشرے کے خواہاں رہتے تھے۔ وہ معاملات کو طاقت کی بجائے دانش و حکمت پر سلجھانے پر یقین رکھتے تھے۔ نواز شریف کی اس سوچ پر ایک نہایت ہی زیرک سیاست دان نے طنز کرتے ہوئے کہا تھا۔ ”نواز شریف بہت بھولا آدمی ہے، اسے کیا خبر کہ پنجاب کا مزاج کیا ہے؟ پنجاب کا آدمی جوتے کے نیچے ٹھیک رہتا ہے۔“

اس قسم کی باتوں، طعنوں تشنوں کے باوجود نواز شریف کی پالیسی کامیاب رہی اور چند ہی دنوں میں امن ہو گیا۔ میاں صاحب نے چیف منسٹر بننے ہی سب سے پہلے شہروں، چکی آبادیوں کو پختہ کرنے کا فیصلہ کیا اور گاؤں میں غریب، غیر کاشت کاروں کے لیے تین اور پانچ مرلہ ہاؤسنگ اسکیموں اور



بشیر مریم نواز کے ہمراہ

حکومت کا امیج خراب ہو گا کہ میاں صاحب کے متعلق یہ باتیں بے بنیاد اور جھوٹ پر مبنی تھیں مگر پروپیگنڈہ کا اپنا اثر ہوتا ہے اسی لیے لوگوں نے ان باتوں پر یقین کرنا شروع کر دیا، تاہم میاں صاحب کو ان باتوں کی قطعی کوئی پروا نہیں تھی، وہ صرف اتنا ہی کہتے کہ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے، یہ جھوٹ اپنی موت آپ مر جائے گا۔ کچھ دنوں بعد پروپیگنڈہ کرنے والوں کے حوصلے مزید بڑھ گئے اور میاں صاحب کے خلاف باقاعدہ پمفلٹ چھپنا شروع ہو گئے۔ میاں صاحب کے مخالفین میں سیاسی لوگ ہی نہیں، زمیندار طبقہ بھی شامل تھا۔ دراصل یہ طبقہ اس امر پر خوش نہیں تھا کہ کوئی شہری بابو یا سرمایہ دار پنجاب کا حاکم بنے۔ ان لوگوں کی طرف سے یہ بات کہی جانے لگی کہ حکمرانی کا تجربہ بلکہ حق صرف زمیندار کلاس ہی کو ہے حالانکہ اس ملک کے بانی حضرت قائد اعظم بڑے کلاس سے تعلق رکھتے تھے۔ اصل میں زمیندار کلاس کو یہ خوف تھا کہ اگر نواز شریف اسی طرح کامیابی سے حکومت چلاتے رہے تو ان کا حق حکمرانی ختم ہو جائے گا۔ ان شدید مخالفوں کے باوجود نواز شریف تعمیر و ترقی کے کاموں میں جتے رہے۔ انہوں نے اپنے ترقیاتی

پلانوں کا اجرا کیا۔ میاں صاحب اپنے اس فیصلے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے خود شہر گئے اور چکی آبادیوں کو پختہ کر کے ہی دم لیا۔ ان آبادیوں میں پانی، بجلی سمیت ہر سہولت کا بندوبست کیا۔ ان میں ایک خاص عادت تھی کہ جو کام کرنے کی ٹھان لیتے تھے، اسے مکمل کر کے ہی چھوڑتے تھے۔ مزدور طبقہ کے لیے ہسپتال بنوائے، ان کے بچوں کے لیے اچھی سن کالج کے معیار کے اسکول تعمیر کرائے۔ اس طرح مزدوروں کی کایا پلٹ گئی۔ ضیاء کے دور میں مزدور آئے دن ہڑتال کیا کرتے تھے نواز شریف کی وزارت اعلیٰ میں یہ ہڑتالیں ختم ہو گئیں، اس کی وجہ مزدوروں کی بہبود کے وہ کام تھے جو نواز شریف نے ان کے لیے کیے تھے۔ ضیاء دور حکومت میں طلباء کے بھی مسائل تھے، طلباء میں آئے روز تصادم ہوتا جس میں ہلاکتیں بھی ہوتی تھیں۔ میاں صاحب نے اس پر قابو پانے کے لیے میر جیون خان کو سیکریٹری تعلیم لگایا جن کی سربراہی میں کالج، یونیورسٹی کی سطح پر باقاعدہ میٹنگز ہوتیں جس کی رپورٹ پیش کی جاتی۔ یوں اس مسئلے کا جڑ سے خاتمہ ہو گیا۔ یہ سب نواز شریف کی ذاتی کوشش کا نتیجہ تھا۔ میاں صاحب میں انتظامی صلاحیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، ان میں معاملہ فہمی بھی تھی اور وہ حاضر جواب بھی تھے، ان خوبیوں کے ساتھ تھوڑے ہی عرصے میں میاں نواز شریف کی انتظامی و سیاسی کامیابی کی دھاک بیٹھ گئی اور پنجاب کی سطح پر حکومتی معاملات میں بہتری آنے لگی لیکن سیاسی مخالفین کی طرف سے ان کے خلاف عجیب قسم کا پروپیگنڈہ شروع ہو گیا، ان کے بارے میں کہا جانے لگا کہ وزیر اعلیٰ ہر کام پیسے سے کرتے ہیں، کوئی کہتا، نواز شریف جتنے ان پڑھ ہیں، انگریزی نہیں بول سکتے، تقریر کرنا نہیں جانتے، اس قسم کی باتیں اس لیے پھیلائی جا رہی تھیں تاکہ نئی



پروگرام کا نام ”تعمیر وطن“ رکھا۔ انہیں سڑکیں بنانے کا شوق تھا اور وہ انفراسٹرکچر کو ترقی کی بنیاد سمجھتے تھے۔ انہوں نے ملک میں موٹر ویز کا جال بچھانے کے لیے سروے اور نقشے تیار کرنے کا کام اپنی وزارت اعلیٰ کے دنوں میں ہی شروع کر دیا تھا جو بعد میں اُس وقت کام آیا جب وہ وزیر اعظم کے عہدے پر براجمان ہوئے۔

نواز شریف کی شخصیت کے بہت سے پہلو تھے وہ نہایت ملنسارزم کو معاملہ فہم فیاض مددگار اور

شرائستہ تھے مگر کچھ باتیں ضرورت سے زیادہ ہی اُن میں تھیں ان میں سے ایک خود پسندی بھی تھی میاں صاحب کی یہ صفت زندگی بھر انہیں نقصان پہنچانی رہی۔ وہ بہت وفا شعار تھے اور دوسروں سے بھی اس کی توقع رکھتے تھے۔ اپنے وعدے کو ہر حال میں نبھاتے

تھے۔ سرکاری معاملات میں بھی اُن کا یہی رویہ تھا حالانکہ ریاست کے کام قاعدے قانون سے جڑے ہوتے ہیں۔ ان کی نظر نظام سے زیادہ انسان پر ہوتی تھی۔ کسی سے غما ہوئے تو کنارہ کشی کر لیتے اور بچوں کی طرح ملنا جلتا بند کر دیتے۔ میاں صاحب میں عجلت پسندی کی عادت بھی تھی لہذا بعض اوقات وہ انتظام و انصرام میں عجلت پسندی بلکہ بے صبری تک کا مظاہرہ کر جاتے تھے یہ عجلت پسندی کبھی ان کے لیے سودمند رہی تو کبھی اس سے ناقابل تلافی نقصان بھی پہنچا۔ انہوں نے جس برق رفتاری سے سڑکیں اور پل بنوائے اُس پر دنیا جیران رہ گئی مگر اپنا اقتدار بھی

اتنی ہی تیزی سے گر آیا۔ اُن کی شخصیت میں خوبیاں اور خامیاں دونوں تھیں مگر وہ بے ایمان نہیں تھے۔ ایک بار بی بی سی نے اپنے ایک پروگرام میں انہیں شرافت کی سیاست کا مبتدی قرار دیا تھا۔ وہ عمل کے آدمی تھے انہوں نے اپنی حکمرانی میں پنجاب کا نقشہ بدل کر رکھ دیا پارکس بنوائے نئے جنگلات اور شجرکاری ہم شروع کر دوائیں سڑکوں کے جال بچھانے کے منصوبے تیار ہوئے دیہالوں میں کچے مکان پختہ ہوئے نئے اسکول اور شفا خانے بنے یوں تو مہتری کی راہوں پر گامزن ہو گئی۔

وقت کی گردش اپنی مخصوص رفتار سے جاری رہی اسی دوران 17 اگست 1988ء کا دن آ گیا اُس روز جنرل ضیاء الحق اپنے دیگر جرنیلوں کے ہمراہ ایک فضائی حادثے میں جاں بحق ہو گئے۔ ضیاء کے حادثے کے وقت نواز شریف کوہ مری میں تھے اطلاع ملتے ہی راولپنڈی کے لیے روانہ



ہو گئے۔ اس حادثے کی وجہ سے صدر کا عہدہ خالی ہو گیا۔ ملک میں یکدم اقتدار کا خلا پیدا ہو گیا۔ غلام اسحاق خان اُس وقت سینیٹ کے چیئرمین تھے لہذا آئین کے مطابق عارضی طور پر صدارتی ذمہ داریاں اُن کے کاندھوں پر آن پڑیں۔ اس سانحے نے منظر نامہ یکسر بدل کر رکھ دیا اب تک نواز شریف ایک شاگرد کی طرح جنرل ضیاء الحق کے سائے تلے سیاست کی راہوں پر چل رہے تھے مگر اب یہ سہارا نہیں رہا تھا۔ لوگوں نے کہنا شروع کر دیا کہ نواز شریف کمزور پڑ جائے گا جو نیچے بھاگ جائے گا مگر کوئی نہیں جانتا تھا کہ میاں صاحب کے ستارے

درخشاں ہیں پاکستانی سیاست میں وہ بہت اہم رول ادا کرنے والے ہیں اس حادثے کے بعد تمام مسلم لیگ اب نواز شریف کے ساتھ تھے۔ وہ چونکہ پنجاب کے وزیر اعلیٰ تھے لہذا اکثریت ان کے ہمراہ تھی جبکہ حامد ناصر چھٹہ اور شجاعت حسین وغیرہ جو نیچو کے ساتھ تھے۔ غلام اسحاق کی نئی حکومت نے تمام معاملات جنرل ضیاء کے فیصلوں کے مطابق چلانے کا اعلان کرتے ہوئے کہا کہ طے شدہ الیکشن اپنے وقت مقررہ پر 16 نومبر کو ہی کرائے جائیں گے۔

اس نئی صورت حال سے بننے کے لیے میاں صاحب نے تیاریاں کرنا شروع کر دیں۔ انہوں نے اپنی تمام تر قوت اس بات پر لگادی کہ پیپلز پارٹی نہ جیت سکے۔ اس کے لیے انہوں نے محمد خان جو نیچو سے اپنے تمام اختلافات بھلا کر جو نیچو کو پاکستان مسلم لیگ کا صدر



سابق بھارتی وزیر اعظم واجپائی سے ہاتھ ملاتے ہوئے

کیا پھر انتخابات ہوئے جس کے نتیجے میں مرکز میں پی پی کا پلہ بھاری تھا جبکہ پنجاب میں مسلم لیگ کامیاب ہوئی تھی۔ سندھ سے دو قومی اُبھریں اندرون سندھ پی پی کامیاب ہوئی اور کراچی حیدر آباد ایم کیو ایم کے نام رہا۔ سرحد میں پی پی کا پلہ بھاری رہا اور بلوچستان قبائلی سرداروں کے ہاتھ آیا۔ سندھ سے مسلم لیگ بری طرح بھاری تھی حتیٰ کہ غلام مصطفیٰ جتوئی اور محمد خان جو نیچو جیسے زیرک سیاستدان بھی اپنی اپنی نشستیں ہار گئے تھے۔ سرحد میں بھی مسلم لیگ کو شکست ہوئی۔ انتخابی نتائج سے واضح تھا کہ وفاق میں پی پی کی حکومت بنے گی مگر اسمبلی مشنٹ بے نظیر کار راستہ روکنے کے لیے نواز شریف کو وزیر اعظم بنانے کا ارادہ رکھتی تھی مگر نواز شریف کی وہ حکومت انتہائی کمزور ہوتی دوسرے سندھ کے عوام غم و غصہ سے پاگل ہو سکتے تھے

اس طرح مشرقی پاکستان جیسے حالات کا خدشہ تھا۔ ان ممکنہ خدشات اور سنگم عوام کے رد عمل کو دیکھتے ہوئے نواز شریف نے وزیر اعظم بننے سے انکار کرتے ہوئے کہا تھا۔ ”میں پاکستان کی قیمت پر کسی وزیر اعظم نہیں بن سکتا“ میں ایسی پرامن فٹنری پر لعنت بھیجتا ہوں۔۔۔۔۔“ چنانچہ نواز شریف نے پنجاب ہی میں رہنے کو ترجیح دی اور یہ فیصلہ حالات کا تقاضہ تھا۔ 2 دسمبر 1989ء کو بے نظیر بھٹو نے بحیثیت وزیر اعظم پاکستان کا حلف اٹھایا اور پھر بے نظیر اور نواز شریف کی سیاسی چپقلش کا آغاز ہو گیا۔ نواز شریف پنجاب کے وزیر اعلیٰ بن گئے تھے چنانچہ

بنادیا۔ اس دوران وہ جماعت اسلامی اور مصطفیٰ جتوئی سے بھی قریب ہو گئے تھے اور ان کے ساتھ مل کر اکٹھے الیکشن لڑنے کا سوچ رہے تھے۔ جرنیلوں کی لگائی گئی بنییری میں پینے والا نواز شریف اُس وقت تک سیاسی طور پر بالغ نظر ہو چکا تھا اور پھر آئی سے آئی یعنی ”اسلامی جمہوری اتحاد“ کے نام سے ایک سیاسی اتحاد وجود میں آ گیا جس کا ایک جھنڈا ایک منشور اور ایک نشان تھا۔ یوں نواز شریف کی کوششوں سے پیپلز پارٹی مخالف قوتیں ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو گئیں۔ ان انتخابات کی تیاری میں نواز شریف نے ترقیاتی فنڈ کو بڑی مہارت سے استعمال



مرکزی حکومت نے صوبائی حکومت کے معاملات اور کاموں میں روڑے انکارنے شروع کر دیئے۔ بے نظیر اپنی تقریروں میں نواز شریف کا ذکر بہت حقارت آمیز انداز میں کرتی تھیں جس پر نواز شریف خاصے برہم ہوتے تھے۔ اسی دوران پی پی کی



سیاحن کے مقام پر سابق صدر جنرل پرویز مشرف اور وزیراعظم نواز شریف ایٹھ دنوں کا ایک یادگار منظر

حکومت نے نواز شریف کے خاندان کا کاروبار تباہ کرنے کی ٹھانی اور تمام بینکوں کو ہدایت کر دی گئی کہ اتفاق فاؤنڈریز کو کسی بھی قسم کا قرض نہ دیں سرکاری بینکوں نے خاصا احتجاج کیا کیونکہ اتفاق لمیٹڈ بہت ہی اچھی پارٹی تھی جس کی وجہ سے بینکوں کا کاروبار بھی چل رہا تھا مگر وفاقی حکومت پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اس اقدام سے شریف فیملی کے کاروباری معاملات میں مشکلات پیدا ہونے لگیں۔ بینکوں نے حکومت کے خوف سے شریف فیملی کو قرضے دینے سے انکار کر دیا حتیٰ کہ نیشنل بینک نے ایک ٹیکسی ایل سی جو صرف تین ہزار روپے کی تھی وزیراعظم کے خوف سے یہ کہہ کر کھولنے سے انکار کر دیا کہ پارٹی کی مالی حیثیت ”مشکوک“ ہے۔ وہ پارٹی جس کا

تھی جس کے لیے اوجھے ہتھکنڈے استعمال کیے گئے۔ ان حالات نے جہاں میاں صاحب کو مشکلات میں ڈالا وہیں ان کی شخصیت کی پختگی کا بھی سامان ہوا۔ وہ سیاست کی آلودگیوں اور میڈی میٹھی ناہموار پگڈنڈیوں سے واقفیت حاصل کر رہے تھے۔

حالات نے میاں صاحب کو ایک بڑے لیڈر کے روپ میں ڈھالنا شروع کر دیا تھا۔ ان پر طرح طرح کے الزامات لگے مگر وہ ہر قسم کی آلائش سے صاف ستھرے ہو کر نکلے۔ ذاتی طور پر ان کا دامن صاف تھا، وہ آزمائش کی ہر گھڑی میں ثابت قدم رہے۔ پی پی کی طرف سے جب زیادتیوں کی انتہا ہو گئی تو نواز شریف کے ساتھیوں نے جوابی حملے کے لیے میاں صاحب پر زور دینا شروع کر دیا کہ بے نظیر حکومت کو عدم اعتماد کے ذریعے گرایا جائے مگر میاں صاحب اس طرح کی سیاست سے گریزاں تھے۔

16 اگست 1990ء کو غلام اسحاق خان نے بے نظیر حکومت برخاست کر دی یہ حکومت کرپشن کے الزامات کے تحت برطرف کی گئی تھی۔ غلام مصطفیٰ جتوئی کو عبوری وزیراعظم بنایا گیا۔ غلام حیدر وائیں پنجاب اور جام صادق علی سندھ کے وزرائے اعلیٰ مقرر کیے گئے۔ مگر اس حکومت میں احتساب کا شور بھی بلند ہوا جس میں بے نظیر کے ساتھ ساتھ نواز شریف کی بھی انکوائریاں ہوئیں حالانکہ وہ بے نظیر حکومت میں تختہ مشق بن چکے تھے۔ بہر حال نواز شریف نے ان انکوائریوں کا مقابلہ کیا اور ان کے خلاف کچھ ثابت نہ ہوا۔ میاں صاحب تو ایک سختی مزدور کے چشمہ و چراغ تھے۔ ان کا گھر انہ حق حلال کی کمائی پر یقین رکھتا تھا البتہ سیاست کے کھیلوں نے اس خاندان کو بدنام کر دیا تھا۔ نواز شریف کی نظریں آئندہ انتخابات پر تھیں جس کے لیے وہ پی پی مخالف ووٹ کو یکجا کرنے کی کوشش میں تھے۔ ویسے بھی پی



زندگی کا انتہائی کٹھن دور

پی کی بدترین حکومت کے باعث عوام اس سے نالاں تھے اور نواز شریف ایک نمایاں لیڈر کے طور پر ابھر رہے تھے۔ 1990ء کے الیکشن ہوئے اور پنجاب نے نواز شریف کو بھرپور میڈیٹ دیا۔ سندھ ایم کیو ایم اور پیپلز پارٹی میں بٹ گیا۔ سرحد اور بلوچستان کا پہلے جیسا ملا جلا رزلٹ آیا۔ نواز شریف کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ وہ جہاں بھی گئے وہ سیٹ ان کی جماعت یا اتحاد cop کے حصے میں آئی۔ اس طرح کامیابی کا تمام تر سہرا نواز شریف کے سر جاتا تھا یوں نواز شریف 1990ء میں بڑے بڑے سیاسی بازی گروں کو چھٹا کر پاکستان کے وزیراعظم بنے۔ جب میاں صاحب نے وزیراعظم کا عہدہ سنبھالا اس وقت کے ملکی و بین الاقوامی حالات انتہائی خراب تھے۔ ملکی سطح پر بیوروکریسی اور فوج کی مرضی کے خلاف میاں صاحب وزیراعظم بنے تھے جبکہ ادھر خلیج میں جنگ کے بادل منڈلا رہے تھے۔ عراق نے کویت پر قبضہ کر لیا تھا جس کے اثرات پاکستان پر بھی پڑے تھے۔ گویا مسائل کا ایک انبار تھا جو نونائب وزیراعظم کے سامنے تھا۔ میاں صاحب کے لیے اس وقت سب سے بڑا مسئلہ مشرق وسطیٰ



میں عراق کویت جنگ کا درپیش تھا جس کے لیے انہوں نے عرب امارات اور سعودی عرب کا دورہ کیا جس کے خاطر خواہ نتائج نکلے۔ دوسرے غلام اسحاق خان اور اسلم بیگ نے ملکی نیوکلیئر پروگرام امریکی دباؤ کی وجہ سے بند کروا دیا تھا۔ میاں صاحب نے نہایت خاموشی سے یہ پروگرام دوبارہ شروع کروایا پھر چاروں صوبوں کی منتخب قیادت کو اکٹھا کر کے ملک کے سب سے اہم مسئلے دریاؤں کے پانی کی تقسیم کو حل کرنے کے اقدامات کیے پھر صوبوں کے درمیان مالی وسائل کی تقسیم کے مسئلے کا نہایت قابل قبول حل نکالا جس میں چاروں صوبوں کی رضامندی



حوصلہ مند باپ کی پر عزم بیٹی: مریم نواز

شامل تھی۔ انہوں نے بلوچستان کے آبی وسائل کو بہتر کرنے کے لیے وہاں ٹیوب ویل لگانے کی وسیع اسکیمیں شروع کرائیں جس سے صوبے کی زراعت کو زبردست مہمیز ملی۔ صوبہ سندھ کا ایک بہت پرانا مسئلہ بے زمین ہاریوں کا تھا۔ میاں صاحب نے اس مشکل کام میں بھی ہاتھ ڈالا اور بے زمین ہاریوں کو مالکانہ حقوق اور فصل اگانے کے لیے

قرضوں کی سہولت کا اہتمام کیا۔ میاں صاحب نے اپنی وزارت عظمیٰ کے زمانے میں جو سب سے بنیادی اور بڑا کام کیا وہ بڑی بڑی صنعتوں کی نجکاری کا عمل تھا۔ اسی طرح نواز شریف حکومت نے انکم ٹیکس کی مد میں بھی کئی انقلابی اصلاحات کیں اور خود کار تشخیص کا طریقہ متعارف کر کے محکمہ انکم ٹیکس

کے محکمہ اعمال کے صوابدیدی اختیارات کم کر دیے۔ ان اقدامات پر بیوروکریسی نے انہیں بدنام کرنا شروع کر دیا مگر میاں صاحب کو اس کی قطعی پروا نہیں تھی وہ عمل کے آدمی تھے۔ انہوں نے بے روزگار نوجوانوں کے لیے یلیٹ ایکسپریس شروع کی تو کہا گیا پڑھے لکھے نوجوانوں کو ٹیکسی ڈرائیور بنا دیا گیا۔ حالانکہ اس اسکیم سے بہت سے نوجوانوں کو نہ صرف روزگار ملا بلکہ عوام کے ٹرانسپورٹ کا بھی مسئلہ حل ہو گیا پھر انہوں نے سڑکوں کے متعلق اپنی زندگی کے خوابوں کو عملی تعبیر دینے کے لیے قدم بڑھایا اور دیکھتے ہی دیکھتے لاہور، اسلام آباد، موٹروے پر

باقاعدہ کام شروع ہو گیا۔ وزیراعظم نواز شریف خود باقاعدہ ہر ہفتے اس کام کا معائنہ کرتے تھے۔ میاں صاحب نے اسی سچ پر اسلام آباد، پشاور اور پشاور سے نوڈیر، گوار، تنک موٹرویز پر بنیادی کام شروع کروا دیا تاکہ ہمارا ملک ترقی کی راہ پر گامزن ہو سکے۔ میاں صاحب ان سڑکوں کے ذریعے پاکستان کو وسطی ایشیاء کی نئی بنی آباد ہونے والی اسلامی ملکوں سے ملا کر اسلامی معیشت کا ایک طاقتور بلاک بنانے کا ارادہ رکھتے تھے تاکہ اسلامی دنیا میں ہمیں بھارت سے بڑھ کر وسعت مل سکے۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے (Water Ways) کی طرف دھیان دیا تاکہ پاکستان کے اندر بار برداری کا ایک نہایت ہی سستا اور تیز رفتار

نظام شروع کیا جاسکے۔ اس معاملے کی جانب پہلے کسی بھی حکمران نے دھیان نہیں دیا تھا۔ میاں صاحب نے معیشت کی طرف بھی رخ کیا جس کے نتیجے میں ملکی مردہ معیشت روز بروز رو بہ صحت ہونے لگی۔ ہر طرف کاروبار کی ریل پیل ہو گئی اور تاجروں کا اعتماد بحال ہو گیا۔ برآمدات میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔ ان بڑے بڑے کاموں کے علاوہ ان کی نظر میں چھوٹے چھوٹے کاموں پر بھی لگی رہتی تھیں۔ انہوں نے گاؤں گاؤں پختہ سڑکیں بنوائیں، گلیاں پختہ بنوائیں، بجلی اور ٹیلی فون تک ہر گاؤں اور دور دراز علاقوں میں پہنچا دیے۔ نواز شریف کے دور حکومت میں کمپیوٹر اور فیکس کا سب سے پہلا استعمال 1987ء میں اُس وقت ہوا جب اسپیکل برانچ میں نواز شریف نے یہ چیزیں لگوائیں۔ اس سے پہلے فیکس مشین کا استعمال خلاف قانون تھا۔ اس کی منظوری نواز شریف نے وفاقی حکومت سے ذاتی سطح پر لی تھی۔ وہ ایسی محرک شخصیت تھے جدھر اُن کی نگاہ اُٹھتی اُدھر ہی وہ کام شروع کرا دیتے۔ نواز شریف نے ہی نہروں کی بھل صفائی کا کام عوامی شرکت سے شروع کرایا تھا۔ ان سے پہلے یہ کام کبھی نہیں ہوا تھا۔ میاں صاحب کو صرف ترقیاتی کاموں ہی کا شوق نہیں تھا وہ نظام عدل اور امن و امان کے معاملات میں بھی گہری دلچسپی لیتے تھے۔ وہ انصاف میں تاخیر پر بہت کڑے تھے اسی لیے فوری سماعت کی عدالتوں کے شدید حامی تھے۔ وہ سفارش کے بھی قائل نہیں تھے۔ ملک کے گھاگ سیاست دانوں نے جب دیکھا کہ نواز شریف بہت بنیادی قسم کے کام کر رہے ہیں اور بہت کامیاب جا رہے ہیں تو وہ ان کے جانی دشمن بن گئے ساتھ ہی فوج سے بھی نواز حکومت کے اختلافات ہو گئے اور صدر مملکت بھی میاں صاحب کے مخالف ہو گئے تھے۔

ان ہی دنوں وینا حیات کیس کا غفلت اٹھا جسے صدر غلام اسحاق خان کے داماد اور اُس وقت کے وزیر داخلہ عرفان اللہ مروت کے کہنے پر زیادتی کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ بظاہر الزام یہی تھا۔ نواز شریف ایسے معاملات کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ اس واقعہ پر اتنا غصہ میں آئے کہ استعفیٰ تک دینے کے لیے تیار ہو گئے۔ بڑی مشکل سے انہیں ٹھنڈا کیا گیا۔ اُس وقت میاں صاحب کا کہنا تھا کہ مجھے وزیراعظم رہنے کا کوئی شوق نہیں۔ میرے زمانے میں اس طرح کے واقعات ہوں میں حکومت سے چمٹا ہوں یہ ممکن نہیں ہے۔ وہ صدر غلام اسحاق خان اور جنرل آصف نواز پر سخت ناراض تھے اور عرفان اللہ مروت کو سزا دلوانے کے خواہاں تھے تاہم میاں صاحب اپنے ساتھیوں کے سمجھانے پر غصہ پی گئے مگر وہ دل ہی دل میں کڑے رہتے تھے۔ وہ نواز حکومت کا مشکل ترین وقت تھا حالات کو بھانپتے ہوئے بے نظیر نے لاگ مارچ کا اعلان کر دیا کہ وہ اسلام آباد پر چڑھائی کر کے نواز شریف کی حکومت کو گرائیں گے تاہم یہ مارچ ناکام ہو گیا۔ بعد میں پی پی کی جانب سے روڈ مارچ کا شوشا چھوڑا گیا اس کا بھی یہی حشر ہوا مگر ایوان صدر میں نواز حکومت گرانے کے لیے سازشیں شروع ہو گئیں۔ ان ہی دنوں پاکستان مسلم لیگ کے صدر محمد خان جو نجوکی وفات سے نواز شریف پارٹی کے صدر بنے تو اس ایشیو کو اچھال کر مسلم لیگ میں پھوٹ ڈال دی گئی۔ اس دوران نواز شریف پاکستان میں زیادہ سے زیادہ بیرونی سرمایہ لانے کی خاطر کبھی جرمنی جا رہے تھے تو کبھی سوئٹزرلینڈ، کبھی سعودی عرب تو کبھی عرب امارات تاکہ ان کے ملک میں خوشحالی آ سکے لیکن سازشی ٹولہ اپنے کام میں لگا ہوا تھا چنانچہ نواز شریف ایک مدبر سیاست دان کے طور پر صدر صاحب سے



جا کر ملے اور ملکی مفاد کی خاطر تمام اختلافات بھلانے کو کہا۔ غلام اسحاق خان نے اسے نواز شریف کی کمزوری جانا اور نہایت تحارت سے اس آفر کو ٹھکرا دیا۔ میاں صاحب مفاہمت چاہتے تھے مگر صدر صاحب نے ایک نہ مانی لہذا میاں صاحب آخری اقدام کے طور پر عوام کے پاس چلے گئے۔ ریڈیو، ٹیلی وژن پر قوم سے خطاب میں انہوں نے صدر کی مختلف سازشوں کا پردہ چاک کر ڈالا۔ نواز شریف کی یہ تقریر 17 اپریل 1993ء کو ہوئی نشر اور اگلے دن صدر نے آٹھویں آئینی ترمیم کا سہارا لیتے ہوئے قومی اسمبلی ختم کر کے نواز حکومت برطرف کر دی اور تمام گورنرز بھی بدل دیئے۔ حکومت کے خاتمے کے بعد میاں صاحب کے پاس دوراستے تھے ایک تو یہ کہ وہ خاموش ہو کر بیٹھ جائیں اور دوسرا استیسیا جدوجہد کا تھا۔ اکثریت کا خیال تھا کہ وہ ایک امیر خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اور اسٹیبلشمنٹ کی گود سے اٹھے ہیں اس لیے اب وہ خاموش بیٹھ جائیں گے اور اپنے خاندان کے وسیع کاروبار میں جُت جائیں گے مگر نواز شریف اپنے مفاد کی خاطر سیاست میں نہیں آئے تھے وہ پاکستان کو ایک جدید مملکت دیکھنے کا خواب دیکھتے تھے اس لیے وہ چین سے نہیں بیٹھے انہوں نے دستور اور عوام کی عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا اور ٹرین میں سوار ہو گئے۔ جب لوگوں کو معلوم ہوا کہ ان کا محبوب لیڈر نواز شریف ٹرین سے لاہور جا رہا ہے تو راولپنڈی سے لاہور تک عوام ہی عوام تھے ہر اسٹیشن پر ان کا شاندار استقبال ہوا۔ نواز شریف جنہیں اسٹیبلشمنٹ کا بندہ کہا جاتا تھا وہ عوام کے دلوں کی دھڑکن بن گیا اور قومی لیڈر بن گیا۔ میاں صاحب نے عدالت عظمیٰ کے دروازے پر دستک دی اور ایک دستوری درخواست اسمبلی اور حکومت کی بجالی کے لیے دی کہ ان کی حکومت بلاوجہ برطرف کی گئی ہے۔ نواز حکومت ختم ہوتے ہی تمام ترقیاتی کام یکنخت بند

کر دیئے گئے۔ پلوں، شاہراہوں، واٹر ویز، ریلویز، مواصلات انٹرچینج حتیٰ کہ معمولی معمولی کام بھی بند ہو گئے۔ سندھ کے جن باریوں میں میاں صاحب نے زمینیں تقسیم کی تھیں ان پر زندگی تنگ کر دی گئی۔ انہیں گاؤں چھوڑ کر شہروں میں پناہ لینی پڑی۔ عدالت عظمیٰ نے اس دستوری مقدمے کی طویل سماعت کی اور اس معاملے کے پہلو کو جانچا پرکھا۔ پاکستان کی دستوری تاریخ پر نظر دوڑائی۔ جسٹس منیر اور ان کے جانشینوں کے فیصلے زیر بحث آئے۔ ملک کے بڑے بڑے قانون دانوں اور وکلاء نے باہمی مشورے کیے دلائل دیئے گئے اور پھر نواز حکومت اور اسمبلی بحال کر دی گئی۔ وہ یہ مقدمہ جیت کر ایک بار پھر وزیراعظم بن گئے۔ صدر غلام اسحاق کی آمریت کو شکست ہوئی۔ اس موقع پر بہت سے خیر خواہوں نے صدر اور وزیراعظم میں صلح کرانے کی کوشش کی مگر یہ صلح نہ ہو سکی اور جب یہ جھگڑا بہت زیادہ بڑھا تو فساد سے بچنے کے لیے چیف آرمی اسٹاف کو بیچ میں آنا پڑا۔ یوں صدر اور وزیراعظم دونوں کو جانا پڑا پھر انتخابات ہوئے اور مسلم لیگ کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ نواز شریف ہارے تھے ہارے گئے تھے یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ بہر حال اب وہ مکمل طور پر اقتدار سے باہر تھے۔ کسی صوبہ میں بھی ان کی حکومت نہیں تھی۔ اب وہ حزب اختلاف کے کردار میں تھے۔ بے نظیر وزیراعظم بن چکی تھیں۔ انہوں نے اقتدار سنبھالتے ہی نواز شریف کے شروع کیے گئے تمام پروجیکٹ ختم کر دیئے۔ اس طرح نہ صرف قومی مالی نقصان ہوا بلکہ ترقی کا سفر بھی رک گیا۔ اسلام آباد شہر کے فیض آباد چوک پر ایک انٹرچینج زیر تعمیر تھا یہاں سے راولپنڈی، اسلام آباد، مری، مظفر آباد، لاہور، پشاور اور ملک کے دیگر شہروں کے لیے سڑکیں نکلتی تھیں اسی لیے یہاں ہر وقت

ٹریفک کا رش رہتا تھا۔ اس پروجیکٹ کو جوں کا توں روک دیا گیا۔ یہ کام تب تک رکا رہا جب تک نواز شریف واپس اقتدار میں نہیں آگئے حالانکہ اس کی تکمیل سے عوام کا ایک بڑا مسئلہ حل ہوتا تھا۔ تاجروں کو خاص طور پر ٹرانسپورٹ بنایا گیا کیونکہ ان کا تعلق نواز شریف کی کلاس سے تھا۔ ان حرکتوں سے کاروبار پر بہت برا اثر پڑا اور بزنس ٹھپ ہو گئے۔ بیرون ملک پاکستانیوں کو تنگ کیا گیا تو باہر سے زرمبادلہ آنا بند ہو گیا۔ یوں پی پی حکومت میں ملکی معیشت کا بیڑہ غرق ہو گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے برآمدات سکڑ کر رہ گئیں اور درآمدات کا بل بڑھ گیا جسے پورا کرنے کے لیے عوام کے جمع شدہ زرمبادلہ کا بے دریغ استعمال شروع ہوا۔ رشوت کا بازار گرم تھا، فرقہ واریت زوروں پر تھی، ملک کے بہت سے شعبے بدظمی کا شکار تھے لوگ گمراہ رہے تھے سب سے زیادہ ظلم شریف خاندان پر ہو رہا تھا۔ انہیں ہر قسم کے ظلم و ستم کا نشانہ بنایا جا رہا تھا کہ دوبارہ نہ اٹھ سکیں۔ انہیں مکمل طور پر کرکش کرنے کا پروگرام تھا۔ ان کے کاروبار کا سرمایہ ڈھٹائی سے روک دیا گیا تھا۔ بینکوں پر دباؤ ڈالا گیا کہ وہ اتفاق فاؤنڈریز کو لون نہ دیں، یہ سب جھکنڈے اس لیے روار کھے جا رہے تھے کہ نواز شریف میں سکت باقی نہ رہے۔ اتفاق فیملی کی معاشی تباہی حکومت کا مقصد تھی۔ اس دباؤ کا اثر یہ ہوا اتفاق فیملی میں پھوٹ پڑ گئی ان کے کاروبار ٹھپ ہو کر رہ گئے۔ پی پی حکومت کا اس بار بھی ارادہ تھا کہ شریف خاندان سرنڈر کر جائے۔ اب تو ان کے پاس پنجاب حکومت بھی نہیں تھی۔ شریف خاندان کو کسٹمز، انکم ٹیکس، ریلوے، ٹیلی فون، واٹر اور ایف آئی اے کے چکروں میں الجھایا گیا تھا۔ یہ تمام محکمے ہاتھ دھو کر شریف فیملی کے پیچھے پڑ گئے تھے۔ ان کے تمام کارخانے بند ہو گئے۔ وہ بینکوں کے ڈیفالٹر ہو گئے۔

وہ اتفاق فیملی جو اپنے ٹیکس باقاعدگی سے ادا کرتی تھی اب رحمان ملک جیسے ایڈیشنل ڈائریکٹر جنرل ایف آئی اے کے رحم و کرم پر تھی۔ اسی پر بس نہیں کیا گیا، اتفاق فیملی کی خواتین اور بچوں تک پر سینکڑوں جھوٹے مقدمات بنا دیئے گئے۔ شہباز شریف کو ملک چھوڑ کر لندن جانا پڑا، ان کے نابالغ بیٹے حمزہ شہباز کو جیل میں بند کر دیا گیا حتیٰ کہ نواز شریف کے 80 سالہ باپ میاں شریف جن کا تمام کاروباری دنیا احترام کرتی تھی، انہیں بھی بے دردی سے جیل میں بند کر دیا گیا۔ وہ دل کے مریض تھے انہیں جیل میں دل کا دورہ بھی پڑا۔ میاں شریف کی جیل میں طبیعت کی خرابی کی خبر اخبارات میں شائع ہوئی تو ملک بھر میں غم و غصے کی لہر دوڑ گئی۔ اس پر حکومت کو جان کے لالے پڑ گئے اور پھر منتیں کر کے میاں شریف کو چھوڑا گیا۔ نواز شریف نے اپنی فیملی اور والد کی گرفتاری پر لوگوں کو ہر طرح کے احتجاج سے منع کر دیا تھا کہ یہ ہمارا ذاتی معاملہ ہے۔ ہم اسے سیاسی مسئلہ نہیں بنائیں گے۔ وہ کہتے تھے۔ میں اپنی پارٹی کے ورکروں، نوجوانوں اور خواتین کو اپنے نجی مسئلہ کے لیے آگے نہیں لگاؤں گا اور نہ ہی انہیں لٹھیاں کھانے اور ٹھوکریں سہنے کو کہوں گا۔ تاہم وہ اپنے والد کی اس تذلیل پر بہت رنجیدہ اور پریشان تھے۔ انہوں نے ایک پولیس آفیسر سے انتہائی دگرفنہ انداز میں پوچھا تھا۔ انہوں نے ابا جی کے ساتھ ایسا کیوں کیا؟ پولیس والوں نے ابا جی کے ساتھ ایسی بدتمیزی کیوں کی؟ مذکورہ پولیس آفیسر کے پاس سوائے سر جھکانے کے ان کے سوالوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔

پی پی دور میں صرف اتفاق فیملی ہی انتقام کا نشانہ نہیں بنی تھی بلکہ پاکستان مسلم لیگ کے لیڈر اور ورکرز بھی تختہ مشق بن رہے تھے۔ ہزاروں مقدمات مسلم لیگ کے لوگوں کے خلاف بن رہے تھے اور



جلیس بھری جا رہی تھیں۔ یہ وہ کٹھن دن تھے جب وفاقی حکومت کے کہنے پر میاں منظور وٹو نے میاں نواز شریف کی لاہور میں ذاتی رہائش گاہ پر حفاظتی باڑیں اور جنگلے تک اکھڑا دیئے تھے گھر کا پانی اور بجلی تک بند کر دی گئی تھی مگر ملک کے قائد حزب اختلاف نے یہ سب زیادتیاں صبر سے برداشت کیں اور اپنے ورکروں سے فقط یہی کہا کہ یہ میرا ذاتی معاملہ ہے آپ اس ایشیو پر بالکل احتجاج نہیں کریں گے۔ اسی دوران مہران بینک اسکینڈل منظر عام پر آ گیا جس میں ایم ڈی مہران بینک یونس حبیب نے صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ آفتاب شیر پاد اور چند دوسرے پی پی پی کے کارپردازوں کو کروڑوں روپیہ رشوت دی تھی۔ صدر مملکت فاروق لغاری کو کروڑوں کا فائدہ پہنچا تھا۔ یہ ثبوت مسلم لیگ کے ہاتھ لگے۔ مسلم لیگ نے پریس کانفرنس کر کے یہ باتیں پریس کو بتادیں۔ اس طرح قومی اخبارات میں یہ سب چھپ گیا۔ ان ہی دنوں رشوت کمیشنوں اور بدعنوانی کے بہت زیادہ اسکینڈلز طشت از باہم ہونے لگے اور لوگ بے نظیر حکومت کے خلاف ہونے لگے۔ عوام تنگ آ گئے تھے اور ہر طرف سے آوازیں اٹھ رہی تھیں کہ نواز شریف، قدم بڑھاؤ، ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ نواز شریف آوازِ خلق بن گئے تھے۔ وہ سیاسی طور پر مضبوط ہو رہے تھے مگر معاشی و نجی طور پر کمزور تھے۔ اتفاق قیلمی کے تمام کارخانے بند تھے۔ کسی کو پتا نہیں تھا کہ اندرونی طور پر ان کا کیا حال ہے؟ اسی دوران بے نظیر نے کسی ثالث کے ذریعے لندن میں موجود شہباز شریف سے رابطہ کیا اور انہیں پیغام بھجوایا کہ اگر وہ مخالفت بند کر دیں تو حکومت ان کے ذاتی و کاروباری معاملات کی سختیاں ختم کر دے گی، جواب میں شہباز شریف نے کہا کہ وہ سوچ کر جواب دیں گے۔ شہباز

شریف نے یہ بات اپنے والد کو بتائی تو میاں شریف شدید غصے میں آ گئے اور بیٹے کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔ ”تم نے یہ کیوں کہا کہ سوچ کر جواب دوں گا؟ اس سے بیٹا تمہاری کمزوری ظاہر ہوتی ہے۔ ہمیں جو کچھ دیا ہے اللہ نے دیا ہے اور جو کچھ واپس لیا ہے وہ اللہ نے لیا ہے۔ بے نظیر کون ہوتی ہے لینے دینے والی؟ اسے جب منظور ہوگا، وہ ہمیں سب کچھ دے دے گا۔“ ایسی بات حقیقتاً ہی شخص کر سکتا ہے جو سیلف میڈ آدمی ہو اور اللہ پر کامل بھروسہ رکھتا ہو۔

گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ ملک میں ایسی صورت حال بن چکی تھی کہ لوگ پی پی پی حکومت سے تنگ آ گئے تھے۔ حکومت کی بدعنوانیوں کی داستانیں زبان زد عام تھیں۔ کراچی کی عجیب صورت حال تھی، جنرل نصیر اللہ باہر کی سربراہی میں حکومت نے ایم کیو ایم کے کارکنوں کی ماورائے عدالت ہلاکتوں کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ کراچی کے ہر گھر میں کھرام چا ہوا تھا رشوت اور ظلم کا بازار گرم تھا۔ یہ وقت تھا جب پوری قوم کراچی تاخیر پٹی پی حکومت کی بدعنوانیوں و غرتو توں سے بلبل رہی تھی۔ قوم نجات چاہتی تھی۔ ان حالات میں عوام کی نگاہ نواز شریف کی جانب اٹھتی تھی۔ اسی دوران کراچی میں بے نظیر بھٹو کے بھائی میر مرتضیٰ بھٹو پولیس کے ہاتھوں قتل ہوئے تو حکومت کے لیے مزید مشکلات پیدا ہو گئیں چنانچہ صدر پاکستان فاروق لغاری نے اٹھاون ٹوٹی کا استعمال کرتے ہوئے بے نظیر حکومت پر طرف کر ڈالی اور نئے انتخابات کا اعلان کر دیا پھر الیکشن ہوئے اور میاں نواز شریف بھاری میٹھیٹ حاصل کر کے اقتدار کی کرسی پر براجمان ہو گئے۔ 3 فروری 1997ء کو انہوں نے دوسری بار وزیر اعظم کے عہدے کا حلف اٹھایا اور اپنی تقریر میں اچھی حکمرانی کے عزم کا بھر پور اظہار کیا۔ پنجاب کی وزارت اعلیٰ ان کے بھائی شہباز شریف کے حصے میں آئی۔ تشکیل

حکومت کے مراحل سے گزرنے کے بعد نواز شریف نے سب سے پہلے کراچی کو چڑ سے اکھاڑنے کا مکمل شروع کیا جس کے باعث پاکستان اس حوالے سے دوسرے نمبر سے دوبارہ چودھویں نمبر پر آ گیا۔ میاں صاحب نے تعمیر وطن کے اپنے کام دیں سے شروع کیے جہاں چھوڑ گئے تھے۔ انہوں نے چند ماہ میں لاہور اسلام آباد موڑ دئے مکمل کراچی اور شروع بھی کر دادی۔ ہائی ویز اور انٹر چینج کا کام مکمل کیا گیا۔ اب ہر طرف ترقیاتی کام جاری تھے۔ نہروں کی مرمت اور بھل صفائی ہو رہی تھی تو بارشوں میں ایک بار پھر زمینیں تقسیم ہو رہی تھیں۔ ٹیلی کمیونیکیشن کا انقلاب ایک دفعہ پھر رواں دواں تھا۔ عدلیہ اور انتظامیہ ایک بار پھر مل جل کر عدل و انصاف اور امن کی بہتری کے لیے کام کر رہی تھیں۔ قومی بینک جو گھائے میں جا رہے تھے اب منافع بخش بن گئے تھے۔ میاں صاحب نے نہ صرف ترقیاتی کام کیے بلکہ بہت سے ایسے مشکل کام بھی کیے جو کوئی بھی سیاسی حکومت نہیں کر سکتی تھی۔ ملک میں خاصے عرصے سے مردم شماری نہیں ہو سکی تھی۔ لوگ کہتے تھے یہ کام کوئی سیاسی حکومت نہیں کر سکتی۔ مردم شماری پر صوبوں میں شدید اختلافات تھے مگر یہ مشکل کام میاں صاحب نے فوج کی مدد سے بہت عرصے سے کروا دیا۔ دوسری طرف پنجاب میں شہباز شریف نے زبردست کام کیا انہوں نے وہ کام جو چپاس برسوں میں نہیں ہو سکے تھے وہ مہینوں میں کر کے دکھادیئے۔

اس دوران بھارت نے اپنی دھاک بٹھانے کے لیے 12 مئی 1998ء کو پوکھران کے مقام پر پانچ ایٹمی دھماکے کر ڈالے اور پھر بھارت کا رویہ پاکستان کے ساتھ انتہائی جارحانہ ہو گیا۔ ایل کے ایڈوائس نے تو کشمیر پر چڑھ دوڑنے کی دھمکی بھی دے ڈالی۔ اس صورت حال میں عوام کا دایا پاکستانی حکومت پر بڑھنے لگا کہ وہ بھی جوانی ایٹمی دھماکے کرے مگر بین الاقوامی قوانین پاکستانی حکومت کو ایسا کرنے سے روک رہی تھیں۔ صدر کنتنن اور ٹوٹی

بلیئر بار بار نواز شریف کو فون کر رہے تھے۔ وہ دھمکی آمیز انداز میں پاکستان کو ایٹمی دھماکے کرنے سے باز رکھنا چاہتے تھے مگر نواز شریف نے کسی دھمکی یا ترغیب کی پروا نہ کرتے ہوئے ایک عظیم قائد ہونے کا ثبوت پیش کرتے ہوئے 28 مئی کو ایٹمی دھماکے کر دیئے اور یوں بھارت کی چند روز کی بالادستی ختم ہو گئی۔ ان دھماکوں کے نتیجے میں پاکستان پر معاشی پابندیاں لگ گئیں اور نواز شریف کو بہت سے مشکل فیصلے کرنا پڑے۔ دھماکے کے بعد امریکہ ناراض ہو گیا، جی ایٹ ممالک مخالف ہو گئے، ورلڈ بینک نے منہ پھیر لیا۔ اس وقت نواز شریف کے اسلامی دنیا سے جو تعلقات تھے وہ کام آئے۔ ان کی اعلیٰ فراست سے یہ مشکل وقت گزر گیا مگر پھر نواز شریف کے لیے مشکل وقت شروع ہوا۔ ان ہی دنوں معرکہ کارگل رونما ہوا جو سراسر جنرل پرویز مشرف کا ایڈونچر تھا جس پر نواز حکومت مشکل میں آ گئی۔ یہ وہی جنرل مشرف تھے جنہیں نواز شریف نے خوب ٹٹول کر چیف آف آرمی اسٹاف مقرر کیا تھا۔ اسی مشرف نے حکومت کو اعتماد میں لیے بغیر اپنے طور پر کارگل ایڈونچر کر دیا تھا اور اب سیاسی حکومت کو مشکل میں ڈال دیا تھا۔ اس واقعے پر وزیر اعظم نواز شریف اور جنرل مشرف میں اختلافات ہو گئے جو ہر گزرتے دن کے ساتھ شدید سے شدید تر ہوتے چلے گئے چنانچہ نواز شریف نے جنرل مشرف کو برطرف کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس فیصلے کی سن گن مشرف کو ہو گئی اور پھر 12 اکتوبر 1999ء کا دن آ گیا۔ نوج نے اُس شام نواز شریف حکومت کو برطرف کر کے پورے ملک کا کنٹرول سنبھال لیا۔ نواز شریف، شہباز شریف اور ان کی کابینہ کے بیشتر ارکان کو نظر بند کر دیا گیا۔ نواز شریف کو اُس وقت گرفتار کیا گیا جب وہ پاکستان ٹیلی وژن سینٹر اسلام آباد میں اپنے مقرر کردہ چیف آف آرمی اسٹاف جنرل خواجہ فیاض الدین کو جنرل کا ریک لگانے آئے تھے۔ نواز شریف نے کارگل



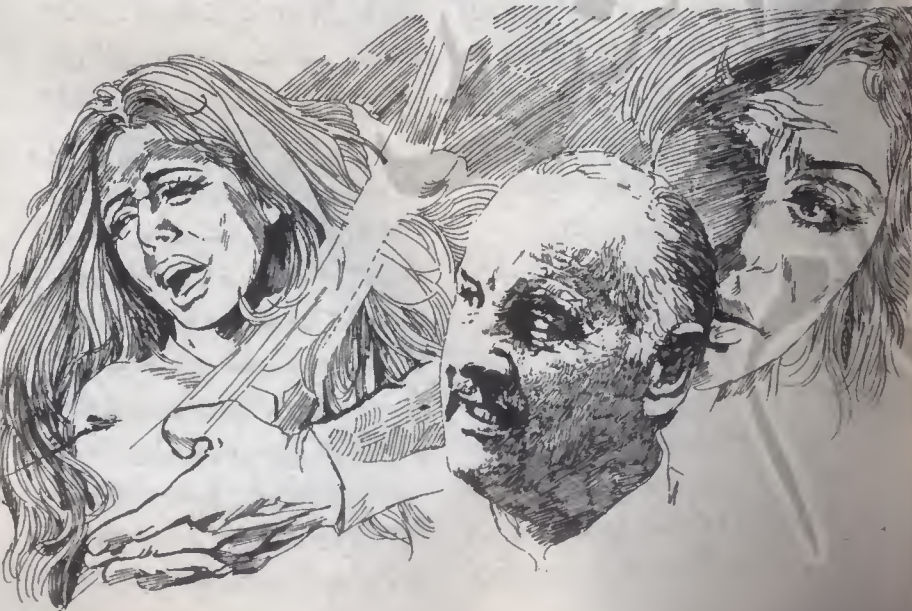
بے لے لے خصوصی کہانی  
قارئین کے لیے مختصر خاص

## چھپر چھاؤں

نگہب انور

سریندر کب اسٹیشن سے باہر آئی اور کب تک سڑک پر بھاگتی رہی اسے کچھ ہوش نہ تھا۔ اس کے ایک پاؤں میں جوتی تھی دوسرا اور جوتی کہاں رہ گئے اسے کچھ خبر نہ تھی پھر اس نے ٹوکرو دیکھا.....

کوہاٹ سے مختصر خاص



فقیر المٹال استقبال کیا۔ اُن دنوں ملک میں الیکشن کا دور دورہ تھا مگر اُن الیکشن کمپن کے دوران محترمہ بے نظیر بھٹو کو شہید کر دیا گیا۔ اب قومی اُفق پر نواز شریف کی صورت میں صرف ایک ہی لیڈر بانی رہ گیا۔ 18 فروری 2008ء کو ملک میں عام انتخابات ہوئے جس میں پیپلز پارٹی کو اقتدار ملا۔ نواز شریف زرداری کے ساتھ مل کر حکومت چلانے پر راضی ہو گئے مگر بعد میں زرداری اُن وعدوں سے ٹکر گئے جو ”میشاقی جمہوریت“ میں نواز بے نظیر نے کیے تھے چنانچہ نواز شریف پی پی حکومت سے علیحدہ ہو گئے اور مؤثر حزب اختلاف کا کردار ادا کیا۔ پی پی حکومت کا یہ دور ہر اعتبار سے انتہائی بدترین رہا۔ ہر طرف کرپشن کا دور دورہ تھا، ملک معاشی انتظامی ہر لحاظ سے انحطاط کی جانب گامزن رہا، انرجی بحران شدت اختیار کر گیا، لوٹ مار کا بازار گرم ہو گیا، ملک میں عجیب افراتفری کا عالم ہو گیا، عوام تنگ آ گئے، چنانچہ 11 مئی 2013ء کو جب ایک بار پھر الیکشن ہوئے تو عوام نے اپنے محبوب لیڈر نواز شریف پر بھرپور اعتماد کرتے ہوئے ان کے حق میں فیصلہ دے دیا اور یوں وزارت عظمیٰ کا ہما ایک بار پھر نواز شریف کے سر پر بیٹھا۔ ان الیکشن میں بیٹی بار نواز شریف کی بیٹی مریم نواز شریف نے بھی انتخابی مہم میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور قریہ قریہ چپہ چپہ جا کر مسلم لیگ کے ووٹرز کو متحرک کیا۔ عوام نے اپنے محبوب قائد کی بیٹی کو بھی ہاتھوں ہاتھ لیا اور انہیں مایوس نہیں کیا۔

آج میاں محمد نواز شریف مسند اقتدار پر بیٹھے توانائی بحران دہشت گردی خراب معیشت جیسے دیوبیکل مسائل کو حل کرنے کی تگ دو میں مصروف ہیں اور ملک کی گاڑی کو دوبارہ ترقی کی پٹری پر چڑھانے کے لیے کوشاں ہیں۔ اگر وہ خلوص نیت سے کام کریں گے تو کوئی وجہ نہیں کہ یہ مسائل حل نہ ہو سکیں کیونکہ دنیا کا کوئی مسئلہ ایسا نہیں جس کا حل نہ ہو۔

☆☆☆

کے معاملے پر ملک کو بحران سے بچایا تھا جس کی سزا شرف نے اُن کی حکومت ختم کر کے اور انہیں گرفتار کر کے دی تھی۔ نواز شریف کے ساتھ وہ سلوک کیا گیا جو نازی جرمن جنگی قیدیوں کے ساتھ کرتے تھے۔ انہیں مری لے جایا گیا جہاں قید خانے میں انہوں نے اپنے بھائی کی آواز سنی۔ ان کے ساتھ غیر انسانی سلوک کیا گیا، ان کا بیٹا حسین نواز اس قید خانے کی ایک بیکر میں قید تھا۔ ایک روز انہوں نے اپنے بیٹے کی آواز سنی جو تلاوت کر رہا تھا۔ میاں صاحب کو اُن کے بیٹے سے نہیں ملنے دیا گیا پھر میاں صاحب کو ملیر جھاؤنی میں رکھا گیا جہاں سے ڈسٹرکٹ جیل ملیر منتقل کر دیا گیا۔ میاں صاحب کے گھر کے تمام مردوں کو گرفتار کر لیا گیا پھر چند روز بعد نواز شریف کو اہل خانہ سمیت زبردستی جلاوطن کر دیا گیا۔ مشرف نے میاں صاحب سے دس سالہ جلاوطنی کا معاہدہ کیا تھا، تاہم نواز شریف اس قسم کے کسی بھی معاہدے سے ہمیشہ انکاری رہے۔ اپنی جلاوطنی کے عرصے میں میاں صاحب نے بے نظیر بھٹو کے ساتھ ایک معاہدہ کیا جسے ”میشاقی جمہوریت“ کا نام دیا گیا۔ اس معاہدے کے تحت دونوں رہنماؤں نے اس بات کا عہد کیا تھا کہ آئندہ ملک میں کسی بھی فوجی مہم جوئی کی حوصلہ شکنی کی جائے گی اور جمہوریت پر شب خون مارنے والے آمر کا مقابلہ کیا جائے گا۔ دوران جلاوطنی نواز شریف خود احتسابی بھی کرتے رہے اور اپنی اُن غلطیوں پر غور کیا جو بطور حاکم اُن سے ہوئی تھیں۔ 23 اگست 2007ء کو سپریم کورٹ آف پاکستان نے حکم دیا کہ نواز شریف اور اُن کے بھائی شہباز شریف دونوں پاکستان آ سکتے ہیں مگر جب عدالت کے اس فیصلے پر دونوں بھائی لندن سے اسلام آباد واپس آئے تو ایئر پورٹ سے ہی انہیں دہلی ڈی پورٹ کر دیا گیا، تاہم 25 نومبر 2007ء کو نواز شریف بالآخر وطن واپس آ گئے جہاں لاکھوں چاہنے والوں نے اُن کا



مسلمانوں نے قیام پاکستان کے لیے بہت کوششیں کیں اور آخر کار جب وہ اپنے مقصد کے حصول میں کامیاب ہوئے تو اُن کی خوشی کی انتہا نہ تھی۔ اپنا گھر اپنا ہی ہوتا ہے جہاں آزادی ہوتی ہے سکون ہوتا ہے انسان ہر کام اپنی مرضی اور منشاء کے مطابق کر سکتا ہے۔ تقسیم کے وقت جو علاقے پاکستان میں شامل تھے وہاں کے لوگ تو خوش تھے ہی جو اقلیتی علاقے پاکستان میں شامل ہونے سے رہ گئے تھے وہاں کے مسلمان بھی مطمئن تھے کہ پاکستان سے اُن کا تعلق اور رابطہ تو رہے گا مگر کوئی نہیں جانتا تھا کہ اب کتنا بڑا طوفان سر اٹھانے والا ہے اور اس کے بعد کیسی کیسی کہانیاں جنم لیں گی؟ ہندو اس تقسیم پر اندر ہی اندر کڑھ رہے تھے ان کی خواہش اور کوشش یہی تھی کہ پاکستان جلد ہی دوبارہ بھارت کا حصہ بن جائے۔ وہاں کے انتہا پسند لوگوں نے سکھوں کو ساتھ ملا لیا اور لوٹ مار کا بازار گرم کر دیا مسلمانوں کے گھر جلائے گئے مردوں کو قتل کیا گیا اور جوان لڑکیوں کو اٹھا کر لے گئے۔ لٹے پٹے مسلمانوں کا بے سوسامانی کی حالت میں پاکستان کی طرف ہجرت کا سفر جاری تھا۔

جب سرحد کے اُس پار مسلمانوں پر ظلم و ستم ہوا تو یہاں کے لوگ بھی غصے میں اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھے اور جوانی کا رروائی میں ہندوؤں اور سکھوں کے ساتھ وہی سلوک کیا جو بھارت میں مسلمانوں کے ساتھ ہو رہا تھا۔ انہوں نے یہ نہ سوچا کہ کسی بھی مسلمان کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ کسی بے قصور سے کسی ظالم کا بدلہ لے۔ سچ ہے کہ غصے میں انسان سب کچھ بھول جاتا ہے صرف انتقام یاد رہتا ہے۔ بہر حال ہندوؤں اور سکھوں کی بھی ایک بڑی تعداد پاکستان سے بھارت کی طرف ہجرت کر رہی تھی

یہاں والے اُن کے قافلوں اور ریل گاڑیوں پر حملہ کر کے انہیں موت کے گھاٹ اتار دیتے اور جوان عورتیں اور لڑکیاں اغھالتے تھے۔

راولپنڈی شہر سے کئی ہندو اور سکھ گھرانے بھارت جانے کے لیے انڈیشن پر پہنچے تھے۔ اُن میں گوپال سنگھ کا گھرانا بھی تھا جن میں گوپال سنگھ کی بیوی سرجیت اُس کے دو بیٹے رندھیر سنگھ اور رنجیت سنگھ اور اکلوتی بیٹی سریندر کور شامل تھے۔ سریندر کور ماں باپ اور بھائیوں کی بہت لاڈلی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اسے صرف حسن کی دولت سے ہی مالا مال نہیں کیا تھا ذہانت بھی اس میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ سرجیت کور نے اسے گھر کے ہر کام میں طاق کیا تھا کہ دوسرے گھر جا کر اسے سرایوں کے طعنے نہ سننے پڑیں۔

اُس دور میں کسی بھی لڑکی کو کالج میں داخل کرانا کوئی آسان بات نہ تھی۔ مسلمان لڑکیاں تو بہت ہی کم تعداد میں کالج تک پہنچتی تھیں اور سکھوں کا بھی یہی حال تھا۔ گوپال سنگھ نے خاندان کی پروا کیے بغیر سریندر کو کالج میں داخلہ دلایا تھا۔ سرجیت کور اکثر بڑبڑاتی رہتی کہ..... لڑکی کی شادی کی عمر گزری جا رہی ہے یہ زیادہ پڑھ جائے گی تو اس کے جوڑ کا لڑکا کہاں سے ڈھونڈو گے؟

گوپال ہمیشہ یہ کہہ کر بات ختم کر دیتا تھا کہ ”واکبرو کی کرپا سے ہماری سریندر کو ایسا برے لگے جس کی خاندان بھر میں مثال نہ ہوگی۔“

سرجیت کہتی۔ ”سریندر کے لدھیانہ سے کتنے ہی رشتے آرہے ہیں تم کہیں ہاں تو کرو تا کہ جب وہ بارہ پاس کر لے تو ہم فوراً اس کی شادی کر دیں۔“ گوپال سنگھ نے جواب دیا۔ ”دیکھ بھلی لوک میں اپنی سریندر کو اپنے سے دو نہیں کر سکتا اس کا بیاہ میں نہیں پنڈی میں ہی کروں گا یہاں دور پرے

کے بہت سے رشتے دار ہیں اس کا رشتہ ان میں ہی دیکھیں گے تو ابھی سے اس کی چٹا چھوڑ دے جب وقت آئے گا دیکھی جائے گی۔“

سرجیت سر جھٹک کر بولی۔ ”میں بھی لدھیانے سے یہاں تیرے گھر آ کے بسی ہوں۔ تیرا بس چلے تو تو اس کا بیاہ ہی نہ کرے ایسا بھی کیلاڈا اس کے ساتھ کی سکھیاں سہیلیاں دو دو تین تین بچوں کی مائیں بن گئی ہیں اور یہاں مومنے کی بھی ہمت نہیں ہے۔“

اور..... اب یہ گھر انہ اپنے دوسرے رشتے داروں کے ساتھ شہر گھریا اور ساز و سامان سب کچھ چھوڑ کر جا رہا تھا۔ گوپال اور سرجیت آگے تھے اس کے پیچھے سریندر بارہ سالہ رندھیر اور آٹھ سالہ رنجیت دونوں بھائیوں کو تھامے چل رہی تھی۔ گوپال سرجیت رندھیر اور رنجیت کو گاڑی پر سوار ہو گئے مگر سریندر کو تو گاڑی پر سوار ہونا نصیب نہ ہوا بس اچانک ہی چار جوان لڑکے نعرے لگاتے اور شور مچاتے گاڑی کی طرف بڑھے اور سریندر کو قابو کرنے کی کوشش کی مگر اس سے پہلے کہ اس کا بازو کسی لڑکے کے ہاتھ میں آتا وہ تیزی سے جھوم کو چیرتی ہوئی بھاگی۔ عزت بچانے کی آرزو اور خوف نے جیسے اس کے پیروں میں بجلیاں بھردی تھیں ویسے بھی اوپچی لمبی مضبوط جسم کی تحت مندر سریندر کے مقابلے میں وہ لڑکے خاصے کمزور سے تھے۔ سریندر نے آگے پیچھے دائیں بائیں کچھ نہ دیکھا بس بھاگتی ہی چلی گئی۔ وہ لڑکے جو جھوم میں گھر گئے تھے راستہ بنانے کے لیے لٹھیاں چلاتے اس طرف بھاگے جہاں سریندر گئی تھی۔ غصے کی شدت سے ان کی رفتار میں وہ تیزی نہی مگر وہ جلد از جلد اس لڑکی تک پہنچنا چاہتے تھے تاکہ اس سے اپنی اُن مسلمان بہنوں اور بیٹیوں کا انتقام لے سکیں جنہوں نے اپنی عزت بچانے کے

لیے اپنی جان دے دی یا پھر ان بھڑیوں کے ہاتھوں ہمیشہ کے لیے داغدار ہو گئیں۔

سریندر کب انڈیشن سے باہر آئی اور کب تک سڑک پر بھاگتی رہی اسے کچھ ہوش نہ تھا۔ اس کے ایک پاؤں میں جوتی تھی دوپٹہ اور جوتی کہاں رہ گئے اسے کچھ خبر نہ تھی پھر اس نے سڑک دیکھا لمبی سڑک پر دور اسے کچھ نقطے سے نظر آئے۔ وہ پیچھے آ رہے ہیں۔ اس نے سوچا اور پھر دائیں طرف بنے ریلوے کے کوارٹروں کی طرف مڑ گئی۔ ان کوارٹروں کے آخر میں ایک چھوٹا سا بنگلہ تھا باہر کا گیٹ کھلا تھا۔ چھوٹا سا باغچہ عبور کر کے وہ دروازے تک پہنچی اور اسے دھکیلا دروازہ کھلا تھا اس لیے اپنی ہی جھونک میں وہ اندر جا گری لیکن گرنے سے چوٹ کا تو کوئی احساس نہ ہوا تھا وہ فوراً اٹھی اور دروازہ بند کر کے کٹدی لگائی۔ دروازے کے ساتھ کمر لگائی اور پھر بے دم ہو کر بیٹھتی چلی گئی آنکھیں بند کیں اور سانس درست کرنے لگی مگر پھر خوف کی ایک لہر اس کے بدن کو لڑائی۔

اس نے سوچا میں اتنے اطمینان سے بیٹھی ہوں اب جانے اس گھر میں کون رہتا ہے؟ اگر کوئی مرد اکیلا ہوا تو پھر جس عزت کی حفاظت کے لیے میں نے اتنی دوڑ دھوپ کی وہ تو گئی..... اس نے گھبرا کے آنکھیں کھولیں اور اٹھ کر کھڑی ہو گئی تب ہی اس کی نظر کے سامنے کھڑی ایک خوبصورت باوقار خاتون برپڑی۔ انہوں نے سر اور چہرے کے گرد سفید براق نمل کا دوپٹہ لپیٹ رکھا تھا جس نے اُن کے وقار اور پاکیزگی میں اور اضافہ کر دیا تھا۔ وہ خاتون آگے بڑھیں۔ سریندر کے سر پر ہاتھ رکھا اور کہا۔

”میں نے تمہیں جس حال میں دیکھا ہے یہ تو سمجھ گئی ہوں کہ تم کون ہوں اور کس طرح یہاں تک پہنچی ہو آؤ میرے ساتھ وہ لوگ یقیناً تمہارا پیچھا کرتے



## ترجیح

نوجوان۔ میں آپ کی صاحبزادی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔

لڑکی کا باپ۔ کیا تم میری بیوی سے مل چکے ہو؟

نوجوان: جی ہاں! مگر میں آپ کی صاحبزادی کو قابلِ ترجیح سمجھتا ہوں۔

صاحبک۔ پشاور رحل کے اندر آن پاک رکھا تھا۔

خاتون نے سریندر کو ہاتھ سے پکڑ کر بڑی محبت سے بستر پر بٹھایا اور خود بھی سامنے بیٹھتے ہوئے بولیں۔

”میرا نام زہرہ خاتون ہے۔ میرے دو بچے ہیں۔ ایک بیٹی ہے۔“ پھر سامنے بستر پر سوئے ہوئے خوبصورت گول منٹول بچے کی طرف اشارہ کر کے بولیں۔

”یہ میرا پوتا محمد لقمان ہے۔ میں اپنے بارے میں باقی باتیں بعد میں بتاؤں گی اب تم مجھے اپنے بارے میں بتاؤ۔“

سریندر نے پہلے اپنا نام بتایا اور پھر اپنی کہانی سناتے لگی۔ اس دوران اس کی آواز بھرا گئی مگر وہ ضبط سے کام لیتے ہوئے بولتی رہی مگر ٹرین پر مسلمان لڑکوں کے حملے اور اپنے یہاں تک پہنچنے کے بارے میں بتاتے ہوئے تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی اور سسکیاں لیتے ہوئے بولی۔

”زب جانے“ میرے ماں باپ اور بھائی زندہ بھی ہوں گے یا نہیں؟“

زہرہ خاتون نے اسے گلے لگایا اور جب رونے کے بعد اس کا دل کچھ ہلکا ہوا تو بولیں۔

”اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھو۔ وہ لوگ ٹھیک ہوں گے اور تم ان سے ضرور ملو گی۔“

سریندر کا دکھ بہت گہرا اور صدمہ بہت بڑا تھا مگر

خاتون بولیں۔ ”تم اپنی توبہ پر ثابت قدم رہو۔ وہ ذاتِ بابرکات غفور الرحیم ہے وہ اپنے بندوں کو معاف فرماتا ہے۔“

سریندر اسٹور میں بیٹھی تمام گفتگوں رہی تھی وہ حیران تھی کہ یہ خاتون کیا اسی زمین پر بسنے والے انسانوں میں سے ہیں یا کوئی اور ہی مخلوق ہیں؟ ان کی آواز میں ایک خاص منہاس تھی لہجے میں رعب تھا ان کی باتوں نے ان لڑکوں پر تو اثر کیا ہی تھا سریندر کے بھی دل میں اترتی چلی گئیں۔ اسی لمحے دل کی گہرائیوں سے ایک دُعا نکلی۔ ”ربا! مجھے بھی ان کی طرح بنادے۔“

اتالے کے کھٹنے کی آواز کے ساتھ ہی سریندر نے کنڈیاں کھول دیں۔ اب اسے کوئی خوف نہیں تھا۔ رب نے اسے محفوظ کر دیا تھا۔ وہ خاتون بولیں۔ ”آ جاؤ بیٹی.....! وہ لوگ چلے گئے ہیں اب لوٹ کر کبھی نہیں آئیں گے۔“ سریندر ان کے ساتھ ایک سادہ مگر صاف ستھرے کمرے میں آگئی تھی۔

اُس کمرے میں سامنے کی دیوار میں دو بڑی بڑی کھڑکیاں تھیں باہر باغیچے کے اس حصے میں پھولوں اور پھولوں کے پودے تھے۔ پورے کمرے میں ان کی ہلکی ہلکی میٹھی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔

کھڑکیوں کے نیچے دو چار پائیاں بچھی تھیں۔ ان پر صاف ستھرے بستر تھے۔ دونوں چار پائیوں کے درمیان میں ایک میز تھی جس پر ترتیب سے کچھ کتابیں رکھی تھیں ان پر ایک عینک تھی۔ چار پائی کے ساتھ دو کرسیاں اور ایک میز تھی۔ سامنے کی دیوار کے ساتھ زمین پر ایک گدار کھا تھا جس پر دو کرسیاں اور ایک گاؤں تھی۔ اس کے ساتھ ہی تخت پوش تھا جس پر جائے نماز بچھی تھی جس کا ایک کونہ موڑا ہوا تھا۔ اوپر دیوار پر ایک چھوٹی سی خوبصورت چھتی تھی جس پر

زیادتی کیوں کر رہے ہو؟“ ایک لڑکے نے غصے سے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”اماں جی.....! آپ کو پتا تو ہوگا کہ وہ لوگ بھی ہمارے مظلوم اور بے گناہ مسلمان بہن بھائیوں کے ساتھ یہی سلوک کر رہے ہیں تو کیا ہمیں ان سے بدلہ لینے کا حق نہیں؟“

خاتون بولیں۔ ”دیکھو بیٹا بے شک اسلام میں بدلہ لینا جائز ہے آنکھ کے بدلے آنکھ جان کے بدلے جان کی اجازت ہے مگر جو ظلم کرے بدلہ اسی سے لیا جاتا ہے۔ اب اصولاً تو یہ ہونا چاہیے کہ بھارت میں جو لوگ مسلمانوں کے ساتھ زیادتی کر رہے ہیں تم انہیں قتل کر دے لوگ ان کے ہم مذہب ضرور ہیں مگر ان کا تو کوئی تصور نہیں بلکہ یہ لوگ تو ہمارے سامنے مجبور اور بے بس ہیں ظلم اور برائی کو روکنے یا ختم کرنے کے لیے ظالم اور برے نہیں بنتے بلکہ تمہیں تو دنیا کے سامنے غفور و گزیر کی ایسی مثال پیش کرنی چاہیے کہ دنیا انہیں ملامت کرے اور سب یہ کہنے پر مجبور ہو جائیں کہ مسلمان واقعی عظیم قوم ہیں۔ دیکھو بیٹا! ہم تو اس نبی کے پیروکار ہیں جو جنگ کے دوران اپنے مجاہدوں کو یہ نصیحت فرماتے تھے کہ بوڑھوں بچوں عورتوں اور درختوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہیے یعنی جن کے ساتھ مقابلہ ہوا انہیں قتل کرو پھر ہم یہ تعلیمات بھول کر بے گناہوں کی جان و مال اور عزت کے درپے کیسے ہو گئے؟“

ان باتوں سے ان لڑکوں کے سر شرم سے جھک گئے۔ ایک لڑکا بولا۔ ”اماں جی.....! ہم واقعی غلطی پر تھے ہم آپ سے معافی مانگتے ہیں اور توبہ کرتے ہیں کہ آئندہ ایسا فعل سرزد نہیں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ہماری غلطیوں کو معاف فرمادے گا ناں!“

ہوئے یہاں تک پہنچ جائیں گے تم نے میرے گھر میں پناہ لی ہے۔ خدا کے فضل و کرم سے تمہاری حفاظت میرا فرض بن گئی ہے۔ چلو آؤ میرے ساتھ۔“

سریندر روٹ کی طرح قدم اٹھاتی ان خاتون کے پیچھے چلنے لگی۔ وہ اسے لے کر چھت پر گئیں۔ ایک کمرے کا تالا کھولا اندر کاٹھ کباڑ بھرا پڑا تھا۔ ایک طرف رضائیوں والی پیٹیاں تھیں مگر کمرہ صاف ستھرا تھا۔ بے ترتیبی نہیں تھی۔ سریندر ایک پیٹی پر چڑھ کر بیٹھ گئی اور خاتون نے دوبارہ باہر سے تالا لگایا۔ جب اس قسم کے حالات ہوں تو انسان چاہنے کے باوجود کسی پر اعتبار نہیں کر سکتا دل نے کہا۔ ”سریندر تو خوش نصیب ہے کہ ایک فرشتہ صفت خاتون کی پناہ میں آگئی ہے۔“ مگر فوراً ہی دماغ نے کہا۔

”کیا پتا یہ خاتون ابھی کسی کو لے کر آجائیں اور مجھے ان کے حوالے کر دیں؟“ سریندر نے فوراً چھلانگ لگائی اور اندر سے دونوں کنڈیاں لگالیں اور پھر کوئی ایسی چیز تلاش کرنے لگی جس سے خطرے کے وقت وہ اپنی جان لے سکے۔

ٹھک ٹھک ٹھک دروازے پر دستک کی آواز جیسے ہی سریندر کے کان میں پڑی اس آواز سے زیادہ زور زور سے اس کا دل دھک دھک کرنے لگا جسم کے ہر مسام سے پسینہ پھوٹ پڑا اور بدن آہستہ آہستہ لرزنے لگا پھر اس کے کانوں میں آواز آئی۔

”اماں جی.....! ایک سکھ لڑکی ہم سے بھاگ کر اس علاقے میں آئی ہے کہیں آپ کے گھر میں تو نہیں گھس گئی؟“

خاتون نے جواب دیا۔ ”بیٹا! مجھے ایک بات تو بتاؤ تم لوگ کمزور اور بے گناہ لوگوں کے ساتھ یہ



زہرہ خاتون کی محبت اور دلجوئی سے وہ آہستہ آہستہ سنبھلنے لگی۔ اب تو وہ کام کاج میں ان کا ہاتھ بھی بٹانے لگی تھی۔ اُسے اس بات کا بے حد دکھ تھا کہ اُن کی بہو عائشہ معذور ہو گئی تھی اور چل پھر نہیں سکتی تھی۔ زہرہ خاتون نے بتایا تھا کہ..... بیٹے کی پیدائش کے بعد خدا جانے اُن کی ٹانگوں کو کیا ہو گیا تھا کہ بالکل شل ہو کر رہ گئی تھیں۔ گزشتہ تین سال سے انہوں نے علاج میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی مگر کوئی افاقہ نہیں ہوا تھا۔ اب تو ڈاکٹروں نے کہہ دیا تھا کہ یہ تمام عمر ایسے ہی رہیں گی۔

عائشہ بہت ہنس مکھ اور باتونی تھی۔ سریندر کے ساتھ خوب گپ شپ کرتی مگر سریندر نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں ایک اداسی سی کھڑی تھی۔

وہ سریندر سے اکثر کہتی کہ..... ”مجھے عبدالستار کی وجہ سے دکھ ہوتا ہے کہ بجائے اُس کے کہ میں اُن کا خیال رکھوں وہ ہر وقت میرے لیے پریشان رہتے ہیں“ میں چاہتی ہوں کہ وہ دوسری شادی کر لیں اور خوش و خرم زندگی گزاریں مگر وہ مانتے ہی نہیں۔“

وقت گزرتا گیا، حالات نارمل ہو گئے۔ اگرچہ مہاجرین کی آمد کا سلسلہ اب بھی جاری تھا مگر عوام کے ساتھ مل کر حکومت نے اس مسئلے پر کسی حد تک قابو پایا تھا۔ سریندر زہرہ خاتون اور عائشہ کے ساتھ ٹھہر گئی تھی۔ عبدالستار بھی اس کی بہت عزت کرتا تھا اور ننھا لقمان تو ہر وقت سریندر کے ساتھ رہتا تھا۔ اُس سے فرمائش کر کے چیزیں پکواتا، ضد کرتا، اُس کے ساتھ کھیلتا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جب زہرہ خاتون قرآن پاک کی تلاوت کرتیں ترجمہ پڑھتیں تو سریندر بہت دلچسپی سے سنتی اور پھر زہرہ خاتون سے اس بارے میں سوالات کرتی۔ وہ تفصیل سے اس کے ہر سوال کا جواب دیتیں اور واقعات

سناتیں۔ رفتہ رفتہ یہ باتیں اس کے دل میں گھر کرتی چلی گئی تھیں۔

سچ ہے، اللہ تعالیٰ جب کسی کو ہدایت دیتا ہے تو راستے خود بہ خود کھلتے چلے جاتے ہیں۔ سریندر کو کیا پتہ تھا کہ اس کا اس طرح اپنے گھر والوں سے بچھڑنا، اس کی زندگی میں کتنا خوبصورت انقلاب لانے والا ہے اور پھر اس نے ایک فیصلہ کیا کہ وہ دائرہ اسلام میں داخل ہو کر زہرہ خاتون کی طرح عملاً ایک بہترین مسلمان اور انسان بننے کی کوشش کرے گی۔

زہرہ خاتون کو محلے بھر کے لوگ عزت کی نظر سے دیکھتے تھے وہ ہر کسی کے کام آنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتی تھیں۔ اُن کی زبان اور عمل سے کسی کو کبھی کوئی تکلیف نہیں پہنچتی تھی۔ جب مثال اتنی زبردست ہو تو کیوں نا سریندر جیسے لوگ اُن کی طرف کھنے چلے جائیں۔ جب سے سریندر اُن کے گھر آئی تھی لوگ انہیں اور بھی عزت دینے لگے تھے۔

سریندر نے ابھی زہرہ خاتون کو اپنے فیصلے کے بارے میں بتایا نہیں تھا کہ حکومت کی طرف سے اعلان ہوا تھا کہ..... سرحد کے دونوں طرف جو لڑکیاں اور خواتین رہ گئی ہیں انہیں اُن کے گھر والوں کے سپرد کیا جائے گا۔ تمام رشتے دار بارڈر پر آئیں گے اور اُن عورتوں کو اُن کے رشتے داروں کے حوالے کر دیا جائے گا۔

عبدالستار نے یہ بات اپنی ماں زہرہ خاتون کو بتائی تھی تو انہوں نے یہ خوشخبری سریندر کو سنائی تھی کہ..... ”چلو اب تم اپنے گھر والوں کے پاس چلی جاؤ گی۔“

سریندر نے مسکرا کر کہا۔ ”ماں جی! اب یہ بات میرے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتی کیونکہ میں نے

اسلام قبول کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے اس لیے میں اب کہیں نہیں جاؤں گی۔ یہ فیصلہ تو میں نے کئی دن پہلے کیا تھا مگر کہنے کی ہمت اس لیے نہیں ہوئی کہ جانے آپ اور دوسرے لوگ اس کا کیا مطلب لیں؟ میں موقع کی تلاش میں تھی اور وہ موقع اللہ تعالیٰ نے آج دیا ہے۔ اس نے مجھے ہدایت کا راستہ دکھایا ہے تو میں اس پر چلنے کے لیے آپ سب کا ساتھ چاہتی ہوں۔“

زہرہ خاتون کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو بہنے لگے۔ انہوں نے سریندر کو گلے سے لگایا، پیار کیا اور پھر بولیں۔ ”مگر میں پھر بھی جا ہوں گی کہ تم اپنے ماں باپ سے ضرور ملو پھر تم جو چاہو گی، ویسا ہی ہوگا۔“ جس تاریخ کو دونوں طرف بارڈر پر دونوں طرف رشتے دار جمع ہوئے اور کارروائی کی گئی عبدالستار اور زہرہ بیگم سریندر کو لے کر گئے تھے۔

بارڈر پر حالات دیکھ کر سریندر حیران ہو گئی تھی بہت سے والدین نے اپنی بیٹیوں کو لینے سے انکار کر دیا تھا۔ لڑکیاں روتی ٹپکتی رہیں مگر انہیں رحم نہ آیا۔ بہت سی لڑکیاں اپنے اپنے والدین اور رشتے داروں کے ساتھ چلی گئیں، بہت سی لڑکیوں نے اپنے والدین کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا، اتنے لوگوں میں سریندر کے ماں باپ اور خونی رشتوں میں سے کوئی نہ آیا تھا۔ اگرچہ سریندر اپنے گھر والوں کے ساتھ نہ جانے کا فیصلہ کر چکی تھی مگر اپنے گھر والوں کو نہ دیکھ کر اُس کی آنکھیں بھر آئی تھیں اور اسے یقین ہو گیا تھا کہ اُس دن کے حملے میں اُس کے گھر والے مار دیئے گئے ہوں گے کیونکہ یہ تو ہو نہیں سکتا تھا کہ وہ جو اپنے ماں باپ اور بھائیوں کی لاڈلی تھی، اُسے وہ بھول گئے ہو گئے، قانونی کارروائی کے بعد وہ لوگ سریندر کو لے کر واپس آ گئے تھے۔

چند روز کے بعد ایک چھوٹی سی باوقار تقریب میں سریندر نے اسلام قبول کیا تھا۔ مولانا صاحب نے جب اس کا نام رکھنے کے لیے کہا تو زہرہ خاتون نے فخر النساء نام تجویز کیا اور کہا کہ میری یہ بیٹی مسلمان عورتوں کے لیے فخر کا باعث ہوگی۔

زہرہ خاتون، اُن کی بیٹی سارہ بانو، عبدالستار اور عائشہ سب ہی بہت خوش تھے اور فخر النساء کے تو خوشی سے پاؤں ہی زمین پر نہ ٹکتے تھے۔ اس کے بعد تو اُس گھرانے کی محلے بھر میں عزت اور بڑھ گئی۔ فخر النساء نے نماز سیکھی اور اس کی پابندی کو ہر کام پر فوقیت دی۔ قرآن پاک کی تجوید شروع کی۔ گھر کے کام کاج اور اراکان اسلام کی پابندی کے علاوہ اس کا دھیان کہیں اور جاتا ہی نہ تھا۔ عبدالستار کی معذور بیوی عائشہ اسے تنہی ہی سے گھر میں سب کی خدمت کرتے دیکھ رہی تھی اور اب جب وہ مسلمان ہوئی تھی تو اس کے دل میں اس خواہش نے شدت سے جنم لیا تھا کہ کاش عبدالستار اس من موہنی سی لڑکی سے شادی کر لیں۔ اس طرح اُس کے دل کا بوجھ بھی کم ہوگا کہ اُس کی وجہ سے اُس کا شوہر ایک خوش و خرم اور بھرپور زندگی گزارنے سے قاصر ہے۔

رات کو جب عبدالستار تھکا ہارا عائشہ کے پاس آیا اور مسکرا کر اس کا حال احوال دریافت کیا، محبت سے اُس کے بال سہلائے تو عائشہ نے اُس سے حتی بات کرنے کا فیصلہ کیا اور اللہ تعالیٰ سے دُعا کی وہ اُسے اُس کے مقصد میں کامیاب کرے۔

جب عائشہ نے عبدالستار سے سوال کیا کہ..... ”آپ مجھ سے بہت زیادہ محبت کرتے ہیں؟“ عبدالستار نے ہنس کر کہا۔ ”کیا تمہیں ان نو سالوں میں بھی میری محبت کا یقین نہیں آیا؟“ عائشہ نے کہا۔ ”مجھے آپ کی محبت پر تو خود سے



## پسند

ایک گویے نے اپنے ایک دوست کی دعوت کی اور پھر اسے شام تک گھر میں بٹھائے رکھا۔ وہ اس سے مختلف راگ راگینوں پر گفتگو کرتا رہا۔ مغرب کے بعد گویے نے ہارمونیم سنبھالا اور اپنے دوست سے کہا۔ ”تمہیں میری جان کی قسم یہ بتاؤ کہ تمہیں کون سی بے پسند ہے تاکہ میں تمہیں وہی سناؤں۔“ دوست نے جل کر جواب دیا۔ ”مجھے تو بس ہنڈیا بھننے کی آواز پسند ہے۔“

حمیرا ظفر۔ رحیم یار خان

آتے ہیں اور نہ ہی اکٹھے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انسان کو لعتیں دیتا ہے اور جب چاہے لے بھی لیتا ہے۔ اس طرح وہ اپنے بندوں کو آزماتا ہے کہ وہ کس حد تک صابر و شاکر ہیں۔ اب اگر تم ہر وقت دکھی اور غم زدہ رہو گے تو اس آزمائش پر پورے نہیں اترو گے اور اللہ تعالیٰ ناراض ہوگا۔ زندگی بھی رکتی نہیں اپنے پیاروں سے بچھڑنے کا دکھ تو ہوتا ہے مگر برداشت کرنا اور اپنے فرائض ادا کرتے رہنا ہی زندگی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ وہ کسی پر اس کی ہمت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا یعنی کسی کو آزمائش میں ڈالتا ہے تو اُسے برداشت کی طاقت بھی عطا فرماتا ہے مگر جو لوگ دل چھوڑ بیٹھے ہیں وہ خود کو اور دوسروں کو اذیت دینے کے سوا کچھ نہیں کرتے۔ صبر کرو اب اسے تمہارے رونے دھونے کی نہیں بلکہ بخشش کی دعاؤں کی ضرورت ہے اور یہ دعا میں ہی تمہاری عانت سے محبت کا ثبوت ہوں گی!“

وقت سے بڑا امر ہوئی نہیں ہوتا“ کتنا ہی بڑا دکھ کتنا ہی گہرا گھاؤ کیوں نہ ہو وقت کے ساتھ بھر جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ دکھ دیتا ہے تو صبر اور حوصلہ بھی عطا کرتا ہے۔ ملک عبدالستار بھی آہستہ آہستہ نارل زندگی کی طرف آنے لگے تھے۔

ایک روز سارہ بانو نے ماں سے کہا کہ.....

جلدی سے لائٹ آن کی تو کمرے کا منظر ہی بدلا ہوا تھا۔ عبدالستار نے جلدی سے چیمڑ میں پھنسی عانت کو نکالا تو وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔ اُس کے سر یا جسم کے کسی حصے سے خون نہیں نکلا تھا اس لیے انہیں اندازہ ہی نہ تھا کہ چوٹ کس قدر شدید تھی۔ بہر حال فوراً اُسے ریلوے ہسپتال پہنچایا گیا۔ ڈاکٹروں نے چیک کیا۔ بظاہر تو کچھ بھی معلوم نہیں ہو رہا تھا انہوں نے مختلف ٹیسٹ تجویز کیے اور عانت کو ٹیسٹ کے لیے لیبارٹری لے کر جانے لگے مگر صرف ایک جھٹکے سے عانت ٹیسٹوں اور علاج معالجے سے بے نیاز ہو کر مالک حقیقی سے جا ملی۔ ملک عبدالستار تو جیسے پاگل ہی ہو گئے ایک تو اپنی پیاری شریک حیات کے جانے کا دکھ دوسرے یہ بوجھ کہ اگر انہوں نے اُسے ڈانٹنے کی بجائے پیار سے بات کی ہوتی تو شاید یہ سب کچھ نہ ہوتا۔ وہ اس کا ذمہ دار خود کو سمجھ رہے تھے۔

دن پر دن گزرتے جا رہے تھے مگر عبدالستار کو کسی پل فرار نہ آ رہا تھا۔ انہیں یہ غم کھائے جا رہا تھا کہ ان کی جو متاع عزیز کھو گئی ہے وہ اب بھی نہیں ملے گی۔ ایک دن زہرہ خاتون نے عبدالستار سے کہا۔

”دیکھو بیٹا! میں تمہاری حالت سمجھ سکتی ہوں مگر تم جانتے ہو میاں بیوی نہ تو اس دنیا میں اکٹھے

کی ڈانٹ کے بعد عانت خود کو بدل لے گی اور اس کی ندامت اور دکھ ختم ہو جائے گا“ وہ بھی چاہتے تھے کہ عانت نارل رہے اُن کے ساتھ بسے بولے اور پہلے کی طرح اچھی ساتھی بن جائے۔

عبدالستار تو مطمئن ہو کر سو گئے مگر عانت اور بھی دکھی ہو گئی۔ گزرے نو برس میں پہلی مرتبہ عبدالستار اُس سے اتنے سخت لہجے میں بولے تھے۔ وہ تو بہت ہی نرم دل اور نرم گفتار انسان تھے تو کیا اس کی بیماری نے انہیں چڑا بنا دیا ہے؟ وہ کانی دیر تک روتی رہی اور مختلف سوچیں اسے پریشان کرتی رہیں۔ اس کے سر میں درد ہونے لگا اور حلق خشک ہو گیا۔ پانی سے بھرا جگ اور گلاس قریب پڑی میز پر دھرا رہتا تھا اگرچہ وہ ہاتھوں کے سہارے اٹھ کر بیٹھ سکتی تھی کیونکہ سوائے ٹانگوں کے اس کا تمام دھڑکتا مند تھا مگر جب بھی اُسے پیاس لگتی وہ عبدالستار کو آواز دے کر پانی مانگ لیتی۔ آج اُسے شوہر پر غصہ تھا اور اس نے تہیہ کیا تھا کہ جب تک وہ خود اُس سے بات نہیں کریں گے وہ نہیں بولے گی اسی لیے اس نے ہاتھوں کے زور سے اٹھنے کی کوشش کی۔ اس کا ایک ہاتھ تو پلنگ پر تھا اور دوسرا پلنگ کی پٹی پر۔ وہ انھی مگر اس کا ہاتھ پٹی سے پھسلا اور وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی اور گھوم کر ایسے گری کہ اس کا ہاتھ پلنگ کے پاس رکھی وہیل چیئر سے ٹکرایا، چیئر پیچھے کھسکی اور پھر سر کا پچھلا حصہ وہیل چیئر کے پائیدان پر لگا، خود کو بچانے کے لیے اُس نے ہاتھ پھیلا یا تو میز پر رکھا جگ گلاس گرا اور پھر وہیل چیئر الٹ کر اس کے اوپر آ رہی۔

ملک عبدالستار اس شور سے ہز ہزاکر اٹھ بیٹھے مگر کچھ دیر تک تو اُن کی سمجھ میں نہ آیا کہ ہوا کیا ہے؟ زہرہ خاتون اور فخر النساء بھاگ کر کمرے میں آئیں

زیادہ یقین ہے مگر آپ سے آج میں اس محبت کا ثبوت مانگوں تو دیں گے؟“

عبدالستار نے کہا۔ ”بات تو وہی ہو گئی ناں! یقین ہو تو کسی ثبوت کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔“

عانت نے کہا۔ ”ملک صاحب! مجھے اپنے معذور ہونے سے زیادہ دکھ اس بات کا ہے کہ میری وجہ سے آپ کی زندگی ٹھہری گئی ہے میں آپ سب کو کوئی خوشی دینے کی بجائے سب پر بوجھ بن گئی ہوں ہر وقت اندر ہی اندر کڑھتی رہتی ہوں ماں جی اور فخر النساء کو مجھے ایک بچے کی طرح سنبھالنا پڑتا ہے جو کچھ ہوا یہ میرے نصیب میں تھا۔ مجھے اللہ تعالیٰ سے کوئی شکوہ نہیں مگر میری خوشی اسی میں ہے کہ آپ فخر النساء سے شادی کر لیں۔ کیا آپ میری یہ خوشی پوری نہیں کریں گے؟“

عبدالستار کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا، وہ بولے۔ ”دیکھو عانت! میں نے تمہیں ہمیشہ سنبھایا ہے کہ تم اس موضوع پر مجھ سے کوئی بات نہیں کرو گی اگر تمہاری جگہ میری یہ حالت ہوتی تو کیا تم مجھے چھوڑ دیتیں؟ ہم نے چار سال ایک بھر پور زندگی گزارا ہے تم نے مجھے ایک پیارا سا بیٹا دیا ہے اور اب اگر پانچ سال سے اس حال میں ہو تو میں شادی کر لوں یہ محبت تو نہ ہوئی ہوں ہو گئی مگر تم اس موضوع کو چھیڑ کر بار بار مجھے احساس دلانے کی کوشش کرتی ہو کہ میں تم پر کوئی احسان کر رہا ہوں یا یہ کوئی دکھاوا ہے تم میرے دل کو چوٹ پہنچا کر کیا یہ ثابت کرنا چاہتی ہو کہ تم بہت عظیم ہو میرے لیے قربانی دینا چاہتی ہو۔ مجھے تمہارے معذور ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا مگر آئندہ تم نے ایسی بات کی تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔“ یہ کہہ کر ملک عبدالستار نے غصے سے کروٹ بدلی اور آنکھیں بند کر لیں۔ اُن کا خیال تھا کہ آج



”اماں جی! اگر ہم فخر النساء کو اس گھر کی بہو بنالیں تو کیسا رہے گا؟ وہ اس گھر کے طور طریقوں کو سمجھتی ہے، سنگھڑ اور سلیقہ شعار ہے، محبت کرنے والی ہے اور سب سے بڑھ کر لقمان اس سے بہت پیار کرتا ہے، وہ بھی اولاد کی طرح اُسے چاہتی ہے، اُس کی سب فرمائشیں پوری کرتی ہے۔ مجھے یقین ہے، وہ اچھی بہو بھابھی ماں اور بیوی ثابت ہوگی۔“

زہرہ خاتون نور انہی بولیں۔ ”خیال تو میرا بھی یہی ہے مگر میں سوچ رہی ہوں، برسی ہو جائے تو عبدالستار سے بات کروں۔“

سارہ نے کہا۔ ”ماں جی! بھائی اب بالکل نارمل ہو گئے ہیں، میں چاہتی ہوں کہ آپ ابھی بات کر لیں کیونکہ جب برسی پر تمام رشتے دار جمع ہوں گے تو ہم ایک ہفتے کے اندر اندر نکاح کر دیں گے۔ اس طرح مہمانوں کو بھی دوبارہ دوسرے شہروں سے آنے کی زحمت نہیں ہوگی۔ بچوں کی بھی چھٹیاں ہوں گی، ٹھہرنا ان کے لیے مسئلہ نہیں ہوگا اور پھر ہم نے کون سا بہت زیادہ دھوم دھڑکا کرنا ہے، بس سادگی سے تمام رسمیں ادا کر لیں گے۔“

”کہہ تو تم ٹھیک رہی ہو، چلو آج رات ہی بات کرتی ہوں۔ اگر مان گیا تو لوگوں کو برسی کے ساتھ ساتھ نکاح کے بارے میں بھی بتا دیں گے۔“ زہرہ خاتون نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا تھا۔

اُس رات زہرہ خاتون اور سارہ بانو عبدالستار کے کمرے میں گئیں تو وہ کسی کام میں مشغول تھے۔ ماں اور بہن کو دیکھا تو کام چھوڑ کر اُن کے پاس آ بیٹھے۔

ماں نے پوچھا۔ ”بیٹا! اب زندگی کو کیسا محسوس کر رہے ہو؟“

عبدالستار نے جواب دیا۔ ”ماں جی! آپ نے

ہی کہا تھا کہ کسی کے جانے سے زندگی ٹھہرتی نہیں، بس گزر رہی ہے۔“

زہرہ خاتون نے بہت پیار سے کہا۔ ”بیٹا! اس طرح تنہا تو زندگی بس گزرے گی ہی، اب تمہیں زندگی کے لیے ایسے ساتھی کی ضرورت ہے جو زندگی گزارنے میں تمہارا ساتھ دے اور اُسے خوبصورت بنادے اور یہ فیصلہ تمہیں جلد کرنا ہے۔ میں برسی کے فوراً بعد تمہارا نکاح فخر النساء سے کرنا چاہتی ہوں۔ تم صبح مجھے اس بارے میں جواب دینا۔“

سارہ بانو نور انہی بولی۔ ”بھئی! یہ یاد رکھنا کہ آپ کے ساتھ ماں جی اور لقمان کو بھی ایک ساتھی کی ضرورت ہے اس لیے فیصلہ جتنا جلدی اور مثبت کریں گے، اتنا ہی اچھا ہوگا۔“

وہ دونوں ماں بیٹی تو چلی گئیں مگر ملک عبدالستار نے جب بھی اس بارے میں سوچنا چاہا ہنستی مسکراتی عائنہ سامنے آ کھڑی ہوئی اور اس کے الفاظ کانوں میں گونجنے لگے۔ ”میری خوشی اسی میں ہے کہ آپ شادی کر لیں خوش و خرم اور بھرپور زندگی گزاریں۔“ اور پھر ملک عبدالستار ایک فیصلے پر پہنچ گئے تھے۔

دوسرے دن ملک عبدالستار نے والدہ کے پوچھنے پر جواب دیا کہ..... ”اماں! میری زندگی کا عائدہ والا غلطو شاید ہی بھر سکے مگر میں بہت سوچنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ آپ جو سوچیں گی، میری بہتری کے لیے ہی سوچیں گی، مجھے آپ کا ہر فیصلہ منظور ہے۔“

ادھر فخر النساء اپنی ہی دنیا میں مگن تھی، عائنہ کے انتقال کے بعد تو وہ فارغ وقت میں کچھ نہ کچھ پڑھتی اور اُسے بخشی ربتی۔ اماں کی کتابوں سے مختلف وظائف پڑھتی رہتی۔ اس وقت بھی وہ ناشتا بناتے ہوئے دُرود شریف کا ورد کرنے میں مصروف تھی کہ

خلاف معمول زہرہ خاتون اور سارہ بانو کو باورچی خانے میں دیکھ کر حیران ہوئی، اُس کا کام مکمل ہو چکا تھا اور وہ چیزیں سمیٹ رہی تھی کہ زہرہ خاتون نے اُسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”فخر النساء! مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے، میرے کمرے میں آؤ۔“ وہ اُن کے پیچھے پیچھے چل پڑی۔ زہرہ خاتون بستر پر آرام سے بیٹھ گئیں۔ فخر النساء بھی بستر کے کنارے پرنگ گئی اور پھر جب زہرہ خاتون نے اپنا مدعا بیان کیا تو حیرت سے فخر النساء کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا، اس نے اس طرف کبھی سوچا بھی نہ تھا، اس کی آنکھیں نم ہو گئیں، اس نے سوچا، وہ کس قدر خوش قسمت ہے اللہ تعالیٰ اس پر کس قدر مہربان ہے کہ پہلے زہرہ بیگم کی صورت اماں جیسی چھتر چھاؤں دی جس نے اُسے سمیٹ کر زمانے کے سرد گردم سے محفوظ کر دیا، ایک مضبوط اور محفوظ پناہ گاہ دی اور اب ملک عبدالستار جیسا مضبوط سائبان عطا کر رہا ہے۔ اُس کے شکرانے کے نفل پڑھے اور سجدے میں گر کر رو کر اللہ تعالیٰ کی عنایات کا شکر ادا کرنے لگی کہ اس عظیم و بابرکت ذات نے اسے سب کچھ دین مانگے ہی عطا کر دیا تھا۔

برسی کے دو دن بعد ایک سادہ اور پرواقتریب میں ملک عبدالستار اور فخر النساء رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔ نیک اور وفا شعار بیوی بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے انعام ہوتی ہے۔ رفتہ رفتہ ملک عبدالستار کو احساس ہوا کہ..... اماں نے صحیح کہا تھا، فخر النساء نے نہ صرف اُن کے زخموں پر مرہم رکھا بلکہ اب تو وہ غلامی بھرنے لگا تھا۔ فخر النساء، لقمان کو پہلے بھی بیٹے کی طرح چاہتی تھی، اب تو وہ اس کی مکمل ذمہ داری تھا۔ زہرہ بیگم بیٹے، بہو کو خوش دیکھ کر

مطمئن تھیں کہ اُن کا کوئی فیصلہ غلط ثابت نہ ہوا حالانکہ جب انہوں نے سریندر کو گھر میں پناہ دی تھی تو جہاں کچھ لوگوں نے ان کے اس فیصلے کی قدر کی تھی تو کچھ رشتے داروں اور غیروں کی باتیں اُن کے کان میں پڑی تھیں کہ اتنی خوبصورت اور جوان لڑکی کو گھر میں رکھ کر یہ عظیم بننے کی کوشش کر رہی ہیں، پتا تو تب چلے گا جب بیٹا ہاتھ سے نکل جائے گا اور بے چاری معذور بہو بستر پر پڑی پڑی مر جائے گی مگر انہیں اللہ تعالیٰ کی رحمت پر اپنی نیت اور تربیت پر مکمل یقین تھا اور کسی خدشے کے بغیر انہوں نے اپنے فیصلے پر عمل کیا اور آج اسی عمل کے انعام کے طور پر انہیں اتنی اچھی بہول گئی تھی۔

اللہ تعالیٰ نے عبدالستار کو اوپر تلے تین بیٹیاں بدر النساء، قمر النساء اور مہر النساء عطا کیں۔ ہر بیٹی کی پیدائش پر انہوں نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ اس نے ان کے گھر میں رحمت بھیجی۔ دادی، چھوٹی اور فخر النساء تو خوش تھیں ہی، لقمان کو تو جیسے چھوٹے چھوٹے جیتے جاگتے کھلونے مل گئے تھے۔ اگرچہ لقمان اور بدر النساء میں سات سال کا فرق تھا مگر وہ اس ننھی مٹی پیاری سی گڑیا کو ہر وقت گود میں لیے بھرتا اور پھر جب رضوان نے اس آنگن میں آنکھ کھولی تو لقمان کی خوشی کا ٹھکانہ نہ تھا۔ بھائی میں تو جیسے اُس کی جان تھی۔

وقت گزرتا جاتا ہے، کئی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ لقمان اپنی تعلیم مکمل کر چکا تھا اور برسرِ روزگار تھا۔ زہرہ خاتون اپنی نواسی زارا کو لقمان کے لیے بیاباہ کر لے آئیں۔ بدر النساء کی شادی اُن کی ایک بہت پرانی اور عزیز دوست رقیہ کے پوتے سے



## نظم

خُتم بن ساجن عید ادھوری  
خُتم بن ساجن بات ادھوری  
بے رنگ دن اور رات ادھوری  
خُتم بن ساجن پھیکا موسم  
میرے دل سے روٹھا موسم  
خُتم بن ساجن سوکھا سادون  
میری آنکھ سے برسا سادون  
خُتم بن ہے امید ادھوری  
خُتم بن ساجن نیند ادھوری  
نہ ہی تم بن مہندی مہکے  
نہ ہی ہاتھ میں کنکن کھٹکے  
خُتم بن ساجن دید ادھوری  
خُتم بن ساجن عید ادھوری

راحت و فارا چپوت

قمر النساء کی مٹکنی کی تقریب کے بعد سب لوگ  
ٹی وی لاؤنج میں بیٹھے تھے۔ سارہ بانو ان کی فیملی  
بدر النساء اس کے میاں اور سب بچے وہاں موجود  
تھے۔ فخر النساء اور زارا ان کے لیے چائے اور  
دوسرے لوازمات لے کر وہاں پہنچیں تو ٹی وی پر  
خبریں دکھائی جا رہی تھیں کہ اچانک ایک آواز  
فخر النساء کے کانوں میں بڑی..... یہ آواز تو وہ  
لاکھوں آوازوں میں پہچان سکتی تھی ایک سکھ یا تری  
انٹرویو لینے والے رپورٹر سے کہہ رہے تھے۔

”ہمیں بہت خوشی ہے کہ واہگرو نے یہ سعادت  
بخشی کہ ہم پنجہ صاحب اور دوسری مقدس جگہوں کی  
یاترا کے لیے آئے ہیں، ہم یاترا کے بعد پنڈی اپنی  
جنت بھوی بھی جائیں گے وہ کھر اور محلہ دیکھیں گے  
جہاں میں نے بچپن اور جوانی گزاری شاید پرانے  
لوگوں میں سے کچھ لوگوں سے ملاقات بھی ہو  
جائے۔ آج ہم بہت خوش ہیں۔“

”باؤ جی!“ ایک سرسراہٹ آواز فخر النساء کے منہ  
سے نکلی۔ ”بی جی! اس کی آواز دوبارہ نکلی اس آواز پر  
سب نے پہلے فخر النساء کو اور پھر ٹی وی پر دکھائی دینے  
والے ایک بزرگ سکھ جوڑے کو دیکھا۔ فخر النساء اس  
وقت تک انہیں غور سے دیکھتی رہی جب تک وہ  
دونوں بزرگ دکھائے جاتے رہے پھر انگریز شروع  
ہوئی اور فخر النساء بھی اپنی دنیا میں لوٹ آئی۔

عبدالستار اور سارہ بانو کافی دیر سے آہستہ آہستہ  
باتوں میں مصروف تھے فخر النساء نے انہیں دیکھا  
مگر اپنے کام میں مصروف رہی اس نے دھیان ہی  
نہ دیا کہ کیا باتیں ہو رہی ہیں۔ بہن بھائی ہیں کوئی  
اپنی بات ہوگی! فخر النساء نے سوچا تھا۔

دوسرے دن ملک عبدالستار نے بیوی سے کہا

تھا۔ ”فخر النساء آج ہم تینوں حسن ابدال جائیں  
گے اور تمہیں تمہارے باؤ جی اور بی جی سے ملوائیں  
گے۔ کل ہم بہن بھائی اسی موضوع پر بات کر رہے  
تھے۔“

فخر النساء ذرا دیر سنائے کی کیفیت میں رہنے  
کے بعد بڑے دھیمے لہجے میں بولی۔ ”ملک صاحب!  
میرے والدین نے یہ سوچ کر صبر کر لیا ہوگا کہ میں  
اب اس دنیا میں نہیں ہوں میں اب ان سے ملوں گی  
تو نہ جانے ان کا کیا رد عمل ہوگا؟ ایسا نہ ہو مجھے یا  
آپ کو دکھ ہو جب ان سے تعلق ہی نہیں رکھنا تو ملنے کا  
کیا فائدہ؟ وہ کہتے ہیں ناں جس راستے جانا نہیں  
اس کا پتا کیا پوچھنا؟“

ملک عبدالستار نے کہا۔ ”تم نہیں جانتی کہ انہیں  
صبر آیا ہوگا یا پھر عجیب عجیب دوسے انہیں اندر اندر  
کھاتے ہوں گے انہوں نے خاص طور پر پنڈی  
آنے کی بات کی تھی۔ ہو سکتا ہے ان کا خیال ہو کہ  
شاید انہیں تم کہیں دکھائی دے جاؤ۔ تم ان سے ملو گی  
تمہارے بارے میں انہیں پتا چلے گا تو اطمینان  
ہوگا۔ چلو جلدی سے تیار ہو جاؤ آج ان کی مذہبی  
رسومات ختم ہو جائیں گی تو انہیں ساتھ ہی لے آئیں  
گے۔“

فخر النساء اپنے میاں کے ساتھ چل تو پڑی مگر کئی  
خیالات خدشے اور سوالات اس کے دل و دماغ میں  
جسم لے رہے تھے۔ جب یہ لوگ حسن ابدال پہنچے تو  
ملک عبدالستار کو گوپال سنگھ کو تلاش کرنے میں زیادہ  
دشواری نہیں ہوئی تھی۔ ان سے ان کی بیٹی سریندر  
کے بارے میں بات کی تو گوپال اور سرجیت کی  
آنکھوں میں یادوں کے بے شمار چراغ جل اٹھے  
گوپال سنگھ نے بڑی بے چینی سے پوچھا تھا۔

”تم میری بیٹی کو کیسے جانتے ہو؟ وہ کہاں

ہے؟“

ملک عبدالستار نے کہا تھا۔ ”میں اسے اپنے  
ساتھ لایا ہوں۔ جب فخر النساء اپنے ماں باپ کے  
سامنے آئی تو سرجیت نے لپک کر اسے گلے لگالیا  
دونوں ماں بیٹی دیر تک گلے گل کر روتی رہیں۔ یہ منظر  
دیکھ کر وہاں موجود دوسرے سکھ یا تری بھی ان کی  
طرف متوجہ ہو گئے اور ان سے سوالات کرنے لگے۔  
فخر النساء نے تعارف کراتے ہوئے انہیں بتایا  
کہ..... میرے شوہر عبدالستار اور یہ ان کی بڑی بہن  
سارہ بانو ہے۔ اس انکشاف کے بعد کئی خواتین نے  
ناک بھوں چڑھائی اور وہاں سے ہٹ گئیں جبکہ کچھ  
خواتین نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور پیار کیا اس  
دوران میں گوپال سنگھ ایک طرف اس شش وچ میں  
کھڑا تھا کہ..... اس کی بیٹی اس کے پیار کے قابل  
ہے بھی یا نہیں؟

سرجیت نے بیٹی سے پوچھا کہ اُس روز اُس  
پر کیا ہئی تھی اور وہ ان لوگوں تک کیسے پہنچی؟ تو ملک  
عبدالستار نے کہا کہ ”آپ دونوں ہمارے ساتھ گھر  
چلیں پھر آرام سے باتیں کریں گے۔“ یوں وہ  
انہیں ساتھ لے آئے تھے۔

گوپال سنگھ اب بھی خاموش ہی تھا پھر فخر النساء  
نے اپنی زندگی کی تمام کہانی انہیں سنادی تھی۔  
جب فخر النساء کی کہانی ختم ہوئی تھی تو گوپال سنگھ  
نے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تھا۔

”دھیے!..... مجھے افسوس ہے کہ میں اس عظیم  
ہستی سے نہیں مل سکا جو تیرے لیے یہ چھتر چھاؤں  
اور سائبان بنا گئی تھی جس نے تجھے اپنی پناہ میں لے  
کر در بدر لے کر بچالیا۔ آج مجھے فخر ہے کہ رب  
کی مجھ پر خاص کرپا ہے کہ میری نظریں شرم سے  
جھکیں نہیں پھر انہوں نے لدھیانے تک پہنچنے اور



مشکلات سے گزر کر آخر کار آسودہ اور اچھی زندگی گزارنے کی تمام داستان کہہ ڈالی تھی۔

فخر النساء نے اپنے بھائیوں رندھیر اور رنکیر کے بارے میں پوچھا تھا۔ ان کی بیویاں کسی ہیں؟ بچے کتنے اور کیسے ہیں؟ وہ سوالات پر سوالات کرنی جا رہی تھی۔ بچے نانائانی کے گرد بیٹھے بائیں کر رہے تھے۔ وہ انہیں اپنے بچپن کی اپنے بچوں کے بچپن کی بائیں اور شرارتیں سناتے رہے اور پھر جب وہ دونوں واپس جانے لگے تھے تب فخر النساء ماں باپ کے گلے لگ کر اس طرح روٹی تھی جیسے آج ہی میکے سے وداع ہو کر سرال جا رہی ہو۔ گوپال سنگھ نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا تھا اور تسلی دی تھی اب اچانک فخر النساء نے سوال کیا تھا۔

”باؤجی مجھے ایک بات کی سمجھ نہیں آئی، جب آپ لوگ خیریت سے تھے تو پھر بارڈر پر کیوں نہیں آئے تھے؟ جبکہ تقریباً تمام والدین اور رشتے دار وہاں موجود تھے؟ اپنی بیٹیوں کو لے کر گئے یا نہیں وہ الگ بات تھی۔“

”پتر“ جس طرح وہ لڑکے تیرے پیچھے بھاگے تھے، مجھے یقین تھا وہ تجھ تک پہنچ جائیں گے پھر تو نے اپنے آپ کو ختم کر لیا ہوگا یا پھر ان کے ہتھے چڑھ گئی ہوگی، یہ سوچ کر میری آتما کانپ رہی تھی پھر میں نے یہ سوچ کر دل کو سمجھا لیا تھا کہ میری سریندر مر گئی ہوگی، یہی سوچ سوچ کر ہم دونوں روزمرے اور روز جیتے تھے۔ جب حکومت نے اعلان کیا کہ بارڈر پر دونوں طرف کی خواتین کا تبادلہ کیا جائے گا تو میں آنے کی ہمت نہ کر سکا۔ میں نے سوچا اگر تو زندہ ہوگی تو میں تجھے لے کر نہیں جاسکوں گا کیونکہ یہاں تجھے طعنوں کے سوا کچھ نہیں ملے گا۔ تیرا کہیں دیاہ بھی نہ ہوگا، کس کا اتنا بڑا دل ہوگا کہ تجھے اپنا لے گا اور پھر تیرا گھر میں رہتا تیرے بھائیوں کے مستقبل کے لیے بھی رکاوٹ بنے گا، برادری ہمارا حقہ پانی بند

کر دے گی اور اگر تجھے چھوڑ کر جاتا تو زندہ نہیں جاتا“ تیرے ساتھ ہی میری آتما بھی بارڈر پر رہ جانی تھی پھر گھر والوں کا کیا بننا اس لیے بہتر یہی سمجھا کہ تجھے ہی مار ڈالا جائے، یہ سوچ کر کچھ تو تسلی ہو گئی تھی اور پھر گوپال سنگھ نے فخر النساء کو عادیے ہوئے کہا تھا۔

”دھی رانی، رُب تجھے خوش اور آباد رکھے۔ زہرہ خاتون کی دبی ہوئی چھپر چھاؤں تجھے زمانے کے ہر دکھ اور پریشانی سے محفوظ رکھے۔ تیرا سائبان سلامت رہے۔ اب شاید زندگی میں ہماری دوبارہ ملاقات نہ ہو مگر اب میں اس اطمینان کے ساتھ مروں گا کہ رُب نے میری دھی کے لیے نیک سبب کیا ہے اور وہ عزت کی زندگی جی رہی ہے۔ اچھا پتر، رُب را کھا!“

وہ لوگ چلے گئے، فخر النساء بہت خوش اور مطمئن تھی، وہ اللہ کا شکر ادا کر رہی تھی کہ مالک ہمیشہ اس پر اپنی رحمت کی بارش برساتا رہے۔ آج اس نے میرے والدین کو مجھ سے ملوایا۔ اذان کی آواز کے ساتھ ہی وہ نماز کے لیے اٹھی تھی۔ ہر نماز کے بعد شکرانے کے نوافل پڑھنا اس کا معمول تھا مگر اب اس نے والدین سے ملنے کی خوشی میں شکرانے کے نفل پڑھے تھے۔ ان کی صحت و تندرستی اور خوشیوں کے لیے دعائیں مانگی تھیں۔ والدین چاہے غیر مسلم ہوں ان کے حقوق تو واجب ہوتے ہیں۔ اٹھارہ سال تک انہوں نے اس سے محبت کی تھی، اس کی حفاظت کی تھی، اس کے لیے چھتر چھاؤں بنے تھے، انہوں نے یقیناً اس کی بہتری اور راسی کے لیے دعائیں مانگی ہوں گی، شاید اسی لیے اللہ تعالیٰ اس پر مہربان تھا اور زہرہ خاتون جیسی نیک ہستی کو اس کی بہتری اور سیدھا راستہ دکھانے کا وسیلہ بنایا اور وہ اس کے لیے چھپر چھاؤں بن گئیں !!

### سلسلہ خاص

ہولی کرڈن تیر کر دینے والی  
مدون بارہ جانتے والی تھلکوں پر کہانی

ایک نامور لکھاری کی پرکشش اور مضمنی خبر تیر

## آتش لکھنوں

سلیم فاروقی

”تم تو انتہائی گھٹیا ذلیل اور کمینے آدمی ہو۔ تم اس زمین پر بوجھ ہو۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنا ماؤز رسیدھا کیا اور اس سے پہلے کہ میں اسے روکتا اس نے فائر کر دیا۔ گولی حاکم خان کی.....

ایک شہادت لو جوں کی سرگزشت۔ قسط نمبر 17





عمران اور ارسلان دو بھائی ہیں ایک دوسرے سے شدید عبت کرنے والے نہایت جرأت مند اور اپنی عزت و انانہ کے لیے زمانے سے لڑ جانے والے..... ارسلان کچھ لالباہی ہونے کے ساتھ بہت زیادہ جذباتی بھی ہے جبکہ عمران بہت سمجھدار اور سوچ سمجھ کر فیصلے کرنے والا۔ عمران کا ایک دوست راشد ہے جس کی سمندر میں لائیں جلتی ہیں۔ عمران اور ارسلان راشد کی لاچ پر سمندر کی سیر کے لیے جاتے ہیں۔ سفر کے دوران ان کا راشد کی لاچ پر کام کرنے والے ایک جہاز پر شرملازمین اور اس کے ساتھیوں سے بھٹکا ہوتا ہے۔ غنی راشد کی لائیں میں اس کی لاچ کو غیر قانونی کام کے لیے استعمال کر رہا ہوتا ہے۔ راشد انہیں پولیس کے حوالے کر دیتا ہے۔ اس عمل کے بعد راشد کے پاس دھمکی آمیز فون آتے ہیں جن سے اعزاز ہوتا ہے کہ غنی کسی بڑے جرائم پیشہ گروہ کا آلہ کار ہے۔ ایک روز راشد کے گھر پر جب عمران اور ارسلان بھی موجود ہوتے ہیں اس جرائم پیشہ گروہ کے کچھ افراد حملہ آور ہوتے ہیں اور ان کا دونوں بھائیوں سے مقابلہ ہوتا ہے۔

معلوم یہ ہوتا ہے کہ راشد کے گھر حملہ کرنے والوں کا تعلق ایک ایرانی علی اکبر مشہدی سے ہے جو ایک بین الاقوامی گینگ کا ڈان ہے۔ پولیس کی آمد ہوتی ہے اور وہ ان مجرموں کے ساتھ عمران اور ارسلان کو بھی پولیس اسٹیشن لے جانا چاہتی ہے۔ ان کے درمیان منہ ماری ہوتی ہے اور راشد کے ایک اعلیٰ پولیس افسر سے رابطے کے باعث پولیس انہیں قاتلے میں بیان ریکارڈ کرنے کا کہہ کر چلی جاتی ہے۔ دوسرے دن راشد کا مرنے والا ہوا ہے اور پھر مشہدی کے آدی عمران اور ارسلان کی بہن شائستہ کو گھر سے اغوا کر کے لے جاتے ہیں۔ دوسری طرف پولیس عمران کو قاتلے لے جا کر شہید شدہ دانش نہایتی ہے۔

قاتلے میں عمران پر شدید تشدد کا سلسلہ جاری ہوتا ہے کہ ارسلان اپنے ساتھیوں کے ساتھ اسے وہاں چھڑانے آ جاتا ہے اور آزاد کر کے کسی نامعلوم مقام پر لے جاتا ہے۔ یہاں عمران کو ارسلان بتاتا ہے کہ ان کی بہن شائستہ کو مشہدی نے کراچی سے باہر کہیں منتقل کر دیا ہے۔ عمران جب گھر پہنچتا ہے تو اس کے گھر والے خصوصاً چھوٹا بھائی عدنان اس کی حالت پر سخت پریشان ہو جاتا ہے۔ اسی دوران پولیس عمران کے گھر پر ریڈ کرتی ہے اور اس کے گھر سے ہیر و دن بردار کرتی ہے۔ عمران کی ماں کی اس صورت حال میں طبیعت بگڑتی ہے اور ان کی موت واقع ہو جاتی ہے۔

ستم یہی نہیں ہوا کہ عمران کی والدہ کا انتقال ہوا اس کے والد بھی اس غم کے باعث زندگی چھوڑ کر موت کے مہمان ہو گئے تھے عمران اور ارسلان غم سے بڑھ چلے تھے جبکہ ان کے چھوٹے بھائی عدنان پر تو سکتہ ساری ہو گیا تھا۔ ماں باپ سے محرومی کے بعد ان کی دہشت گردوں اور پولیس سے جنگ جاری ہوتی ہے کہ انہیں پید لگتا ہے عدالت میں ان کا کیس لڑنے والا بیرسٹر بھی پولیس کے ساتھ لیا گیا ہے۔ ارسلان بیرسٹر بخاری کو اغوا کر کے لے آتا ہے اور پھر ایک مقام سے اس کی لاش ملتی ہے۔ ایسے میں ان کے پاس ان کی اغوا شدہ بہن شائستہ کا فون آتا ہے اور پھر انہیں اطلاع ملتی ہے کہ شائستہ نے خودکشی کر لی ہے..... عمران اور ارسلان اپنی بہن کے اغوا کر مشہدی سے اپنی بہن شائستہ کی ڈیڈ باڈی کا مطالبہ کرتے ہیں.....

راستے میں تیمور اور عمران شیر خان پر قابو پا لیتے ہیں یہاں تک کہ وہ باہر خان کے پاس پہنچتے ہیں اور وہاں تیمور ایک ریوالور نکال کر باہر خان کی کٹنی پر رکھ دیتا ہے۔ باہر خان سکتے کی کیفیت میں تیمور کو دیکھنے لگتا ہے۔

فانکوں کے حصول کے بعد عمران اور تیمور گھر آتے ہیں تو ان کے گھر پر بم سے حملہ ہو چکا تھا۔ اس حملے میں ان کا بھائی ارسلان بھی کام آ جاتا ہے اس کو کوئی پتا نہیں ملتا یہ سب کچھ مشہدی نے کرایا تھا۔ جوانی دار کے طور پر عمران اور تیمور مشہدی کے ایک قریبی ساتھی جان محمد کی دوستیوں کو اغوا کر کے اسے اطلاع دیتے ہیں کہ وہ ان کی بہن کے بارے میں بتاتے ہیں تو اس کی بیٹیوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔

جان محمد کی بیٹیاں ندا اور حرا عمران کو بھائی کہہ کر مخاطب کرتی ہیں تو وہ بھی جذباتی ہو کر انہیں بہن کا درجہ دے کر ان کے گھر چھوڑ کر آنے کا وعدہ کرتا ہے۔ اسی دوران میں عمران کے بھائی عدنان کی آمد ہوتی ہے جسے وہ مردہ تصور کر چکا تھا۔ اسے چل کر عمران تیمور اور نادیا اپنے دشمن باہر خان کو اغوا کرتے ہیں اور عمران اسے معذور کر دینے کی دھمکی دیتے ہوئے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

دوسری طرف مشہدی تھا۔ نادیا عمران کو بتاتی ہے اسے علم ہو گیا ہے کہ میں آپ کے ساتھ کام کر رہی ہوں۔ مشہدی کا دو بار فون آتا ہے اور وہ نادیا کو جاب آفر کرتا ہے۔ نادیا انکار کر دیتی ہے۔ جان محمد کا فون آتا ہے اور وہ عمران کو بتاتا ہے کہ وہ اب مشہدی کے ساتھ نہیں ہے۔ نادیا اور عمران ایک دوسرے کے قریب آ جاتے ہیں۔ تیمور ہاشم خان کو گولی مار دیتا ہے۔ عدنان کی امریکہ روانگی کے اختتامات مکمل ہو جاتے ہیں مگر روانگی کے وقت اسے روک لیا جاتا ہے کہ اس کے پاس آتش گیر مادہ ہے۔ یہ اطلاع غلط ہوتی ہے لیکن عدنان کی فلاحت میں ہو جاتی ہے۔ تیمور عمران کو بتاتا ہے کہ یہ غلطی کی سازش تھی۔ مگر آتے ہیں تو نادیا عمران کو اپنی کہانی سناتی ہے۔ دوسرے دن تیمور عمران کو لے کر لاریٹ میں موجود مشہدی کے گھر پہنچتا ہے اور وہاں تیمور پر جاکر غلام رسول کے بارے میں معلوم کرتا ہے۔

غلام رسول جھلی والے سے ملاقات کے دوران وہ انہیں کسی خطرے سے خبردار کرتے ہوئے اپنے خاص آدمی کے ذریعے روانہ کرتا ہے جہاں ان کا ایک گینگ سے بھٹکا ہوتا ہے۔ وہ لوگ انہیں مار بیٹھتے ہیں راستے میں ان کا ایک جھلی پولیس انسپکٹر سے رابطہ ہوتا ہے اور پھر کہانی میں ایک نئے کردار غنی بلوچ کا اضافہ ہوتا ہے۔

عمران اپنی بہن کی تلاش میں اس کی دوست وردہ کے گھر پہنچتا ہے جہاں وردہ کے والد بتاتے ہیں کہ رات میں کسی لڑکی کا فون آیا تھا فون نمبر کی انکوائری پر معلوم ہوتا ہے وہ نمبر انہیں کے قریب کسی بی بی ادا کا ہے۔ عمران اور نادیا کینٹ انٹرنیشنل پہنچتے ہیں جہاں نادیا کو اغوا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ عمران ان اغوا کاروں کو پکڑ کر پوچھ گچھ کرتا ہے۔

”وہ نچلے درجے کا جرائم پیشہ آدمی تھا لیکن اس وقت اس کے لیے سب سے لگ رہا تھا کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہا ہے۔“

”تم مشہدی کے ساتھ کام کرنا چاہو گے؟“ میں نے بعد میں اسے آزمانے کو پوچھا۔

”میں بھلا اس کے ساتھ کیا کام کر سکتوں گا؟ وہ دنیا کا ہر جائز اور ناجائز کام کرتا ہے۔ اس کے پاس کام کرنے والوں کی ایک فوج ہے۔ اس کا نیٹ ورک دنیا بھر میں پھیلا ہوا ہے۔ میری وہاں کیا منجائش؟“

”فرض کرو میں تمہیں وہاں بھیج دوں؟“ میں نے کہا۔

”صاحب! آپ مجھ سے مذاق کر رہے ہیں۔“ اس نے غیر یقینی انداز میں کہا۔

”میں تم سے بالکل مذاق نہیں کر رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”میں پولیس کا ایک اعلیٰ افسر ہوں اور مشہدی کے کسی لوگ میرے رابطے میں ہیں۔ اگر تم چاہو تو میں تمہیں وہاں بھیجوا سکتا ہوں۔“

”نہیں صاحب!“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”میں نے سنا ہے کہ مشہدی کے آدمی تو انسانوں کو بھی

کھینچوں کی طرح مار دیتے ہیں۔ مجھ میں کسی کا خون کرنے کی ہمت نہیں پھر وہ اسلحہ اور مناشات کی اسمگلنگ کرتا ہے۔ صاحب! میں بہت بردار آدمی ہوں بہت گناہ گار ہوں لیکن میں کبھی اسمگلنگ جیسا کام نہیں کر سکتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ اپنے وطن سے غداری ہے۔“

”تم کچھ بڑھے لکھے بھی ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”میں نے کبجیشن کیا ہے صاحب! نوکری کی تلاش میں دھکے کھانے کے بعد میں نے گاڑیوں کا بزنس شروع کر دیا۔ میں پرانی گاڑی لے کر اسے رنگ و روغن کرنے کے بعد کسی کوچ دیتا ہوں۔ اس سے مجھے بھی پانچ ہزار اور کبھی دس ہزار مل جاتے ہیں پھر میں نے خود بھی گاڑیوں کا کام سیکھ لیا لیکن شیطان تو ہر آدمی کے ساتھ لگا ہوا ہے مجھے بھی ہمیشہ یہ خیال ستاتا تھا کہ میں جو کچھ کارہا ہوں وہ میرے لیے ناکافی ہے۔ مجھے اپنے ہی ہم خیال



کچھ لوگ بھی مل گئے اور ہم نے چھوٹی موٹی وارداتیں شروع کر دیں۔“

”تم جانتے ہو کہ تمہاری گاڑی کے دونوں ٹائر کیسے برست ہوئے تھے؟“ میں نے پوچھا۔

”ہم لوگ وہی تو معلوم کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ دونوں ٹائر ایک ساتھ کیسے پھٹ گئے؟“ اس نے کہا۔  
میں سمجھ گیا کہ وہ اس میدان میں ابھی بالکل اناڑی ہے۔ کوئی گھاگ قسم کا مجرم ہوتا تو فوراً سمجھ جاتا کہ اس کی گاڑی کے ٹائروں پر فائر کیا گیا ہے۔

میں نے اسے رہا کرنے کا فیصلہ کر لیا پھر میں کہاں کا منصف تھا جو اس کے خلاف فیصلہ کرتا۔ ہاں! اگر اس کی ذات سے مجھے کوئی نقصان پہنچتا تو میں یقیناً اس کے بارے میں کچھ سوچتا۔ میری یہ سوچ منفی تھی لیکن اب میں نے وقت کے ساتھ قدم ملا کر چلنا سکھ لیا تھا۔ میری محنت اور ایمان داری نے مجھے کیا دیا تھا؟ والدین اور بھائی کی موت، گھر کی تباہی اور بہن کا اغواء ہاں! یہ ضرور تھا کہ میں اب بھی کسی کمزور اور بے تصور پر ظلم کرنے کا روادار نہیں تھا۔ کسی قسم کا جرم کرنے کے بارے میں تو سوچ ہی نہیں سکتا تھا لیکن اگر کوئی مجھے چھیڑتا تو پھر میں قانون ہاتھ میں لینے پر ذرا بھی نہیں ہچکچاتا۔

اچانک میں نے نادیہ سے کہا۔ ”نادیہ! گاڑی روکو۔“

اس نے گاڑی روک دی۔

”چلو بھاگ جاؤ۔“ میں نے اس سے کہا۔

اس نے غیر یقینی سے میری طرف دیکھا پھر گڑا کر بولا۔ ”صاحب.....! مجھے معاف کر دیں۔“

## قارئین متوجہ ہوں

### کیا آپ کو پرچہ نہیں ملتا؟

کچھ عرصے سے کئی شہروں سے یہ شکایات موصول ہو رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچہ نہیں ملتا۔

ایجنٹ حضرات کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے قارئین سے ہماری التماس ہے کہ پرچہ نہ ملنے کی صورت میں

ادارے کو خط لکھ کر یا فون کے ذریعے درج ذیل معلومات فراہم کریں۔

بکس اسٹال کا نام۔ جہاں پرچہ دستیاب نہیں۔ شہر اور علاقے کا نام۔ اگر ممکن ہو تو بک اسٹال کا سیل نمبر یا لینڈ لائن نمبر

رابطے اور مزید معلومات کے لیے

محمد اقبال زمان

0300-2313256

پرل پبلی کیشنز ”چی کہانیاں“ ”دو شیزہ“

110- آدم آرکیڈ۔ شہید ملت روڈ/ بہادر شاہ ظفر روڈ کراچی۔

”تمہارا نام کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”میرا نام یعقوب ہے صاحب!“ وہ اب باقاعدہ آنسو بہا رہا تھا۔

”تم کس بات کی معافی مانگ رہے ہو یعقوب؟“ میں نے کہا۔ ”میں تم سے کہہ رہا ہوں کہ بھاگ جاؤ۔“

”صاحب! میں نے ایسے بہت واقعات سنے ہیں پولیس والے مظلوموں کو پکڑ کر ویرانے میں لے جاتے ہیں پھر ان سے بھاگنے کو کہتے ہیں۔ جب وہ بھاگتے ہیں تو وہ پیچھے سے ان پر فائرنگ کر دیتے ہیں اور یہ کہا جاتا ہے کہ مظلوم پولیس کی حراست سے بھاگنے کی کوشش کر رہا تھا یا پھر اس واقعے کو پولیس مقابلہ دکھایا جاتا ہے۔“  
مجھے اس کے رونے پر ہنسی آ گئی۔ اچھا خاصا حکیم حکیم اور طاقتور مرد عورتوں کی طرح ٹسوے بہا رہا تھا۔

”ایسا کچھ نہیں ہوگا یعقوب!“ میں نے کہا۔ ”میں نے جب تم سے جانے کو کہا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ تم آزاد ہو جاؤ، کہیں میں اپنا فیصلہ نہ بدل دوں۔“

اس نے پھر سہم کر میری طرف دیکھا۔ میں نے اپنا رویہ اور بھی بغلی ہو لیسٹر میں رکھ لیا تھا۔ اس نے ایک نظر میرے ہاتھوں پر ڈالی پھر سہمے ہوئے انداز میں گاڑی کا دروازہ کھول کر نیچے اتر گیا۔ وہ بھاگنے کی بجائے آہستہ آہستہ چل رہا تھا اور خوف زدہ انداز میں مڑ مڑ کر پیچھے دیکھ رہا تھا۔ کچھ دور جانے کے بعد وہ اچانک پوری قوت سے بھاگ اٹھا۔ اس کے بدن میں گویا دگنی توانائی آ گئی تھی۔ وہ ایسا جان توڑ کر بھاگا کہ لحوں میں میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

آس پاس سے گزرنے والے لوگ حیرت سے اسے دیکھ رہے تھے۔ ان میں سے کسی کو بھی اندازہ نہیں تھا کہ وہ مجھ سے خوف زدہ ہو کر بھاگ رہا ہے۔ میں نے گاڑی کے شیشے چڑھا لیے تھے اور پیچھے سے بیٹھے ہی بیٹھے اچھل کر پینجر سیٹ پر چلا گیا تھا۔

اس کے بھاگنے پر میں دیر تک ہنستا رہا۔ نادیہ بھی اپنے مخصوص انداز میں ہنس رہی تھی۔ ہنسنے ہوئے اس کے گالوں پر ڈسپل پڑ رہے تھے اور چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

”تمہارے ایک ذرا سے غصے نے کیا گل کھلایا؟“ میں نے نادیہ سے کہا۔

”میرے غصے نے؟“ نادیہ نے منہ بنا کر کہا۔ ”مجھ سے گاڑی سے اترنے کو کس نے کہا تھا؟“

”گاڑی روکنے کو کس نے کہا تھا؟“ میں نے اسی لہجے میں سوال کیا۔

”میں نے کہا اور تم نے گاڑی روک دی؟“ نادیہ نے تنک کر کہا۔

”میں نے گاڑی روک دی اور تم اتر گئیں؟“ میں نے بھی لڑا کا عورتوں کی طرح کہا۔ ”وہ تو شکر کرو کہ میں فوراً ہی وہاں سے چلا نہیں گیا، وہیں ایک طرف گاڑی روک کر کھڑا ہو گیا ورنہ ہمیں معلوم ہی نہ ہوتا کہ وہ لوگ تمہیں کہاں لے گئے اور تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا؟“ پھر میں نے اس سے انتہائی لگاؤٹ بھرے انداز میں کہا۔ ”نادیہ جان.....! کیا تم اب بھی مجھ سے ناراض ہو؟“

”میں تم سے ناراض ہو سکتی ہوں؟“ اس نے الٹا مجھ سے سوال کر دیا۔ ”پھر تم سے ناراض ہو کر میں جاؤں گی بھی کہاں؟“

”تو پھر تم گاڑی سے کیوں اترتی تھیں؟“ میں نے پوچھا اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

”ارے کیا کر رہے ہو؟ میں ڈرامیونگ کر رہی ہوں گاڑی کہیں ٹکرا جائے گی۔“ پھر وہ نفرت سے ہونٹ

سکوڑ کر بولی۔ ”وہ لوگ مجھے ایسی گھٹیا اور بدچلن سمجھ رہے تھے اور تم نے اس مردود کو جانے دیا؟“  
 ”قصور ان کا نہیں ہے وہ علاقہ ہی ایسا ہے کہ وہاں بن ٹھن کر اس قسم کی گھٹیا لڑکیاں کھڑی ہوتی ہیں۔“  
 ”میں بن ٹھن کر کھڑی تھی؟“

”ارے تم تو معمولی لباس میں بھی انتہائی خوبصورت لگتی ہو۔“ میں نے ایک مرتبہ پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر  
 گاڑی بری طرح لہرائی۔

اس نے گاڑی سڑک کے کنارے روک دی اور بولی۔ ”اب تم خود ہی ڈرائیونگ کرو۔“  
 ”جو حکم سرکار.....!“ میں نے ہنس کر کہا اور اتر کر ڈرائیونگ سیٹ پر چلا گیا۔ نادیہ اندر ہی اندر پنجرہ  
 کھسک گئی۔

”اب جانا کہاں ہے؟“ نادیہ نے پوچھا۔

”تمہارے اغوا سے پہلے ہم لوگ شاید کراچی کینٹ اسٹیشن جارہے تھے؟“ میں نے کہا۔

”اب چونکہ میرا اغوا نا کام ہو گیا اس لیے اب تم وہاں نہیں جاؤ گے۔“ نادیہ طنزیہ انداز میں بولی۔

”ارے یار اس تیمور لنک کو تو ٹیلی فون کرو۔ وہ کہاں غائب ہے؟“

میں نے سیل فون جیب سے نکالا تو مجھے دھچکا سا لگا۔ میرا سیل فون آف تھا۔

”میرا سیل فون تم نے آف کیا تھا نادیہ؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں میں نے آف کیا تھا۔“ نادیہ نے کہا۔ ”تم اس وقت ڈرائیونگ کر رہے تھے اس لیے میں نے

سیل فون آف کر دیا کہ اگر تیمور کو کال کرنا ہوگی تو وہ میرے نمبر پر کرے گا۔“

”لیکن اس نے تو تمہارے نمبر پر بھی کال نہیں کی۔“ میں نے کہا۔

”کیسے کرتا؟“ نادیہ نے کہا۔ ”ان حرام زادوں کی ہاتھ پائی کی وجہ سے میرا سیل فون میرے ہاتھ سے گر گیا تھا

”اب سب سے پہلے تو تم اپنی سم بند کراؤ۔“ میں نے کہا اور اپنا سیل فون اس کی طرف بڑھا دیا۔

اس نے سیل فون آن کیا ہی تھا کہ لگا تاریج کی ٹون بجنے لگی۔ ایک کے بعد ایک کل سات میسج آتے۔

”کس کے میسج ہیں نادیہ؟“ میں نے پوچھا۔

”تیمور کے علاوہ اور کس کے ہو سکتے ہیں؟“ نادیہ نے میسج پڑھتے ہوئے کہا اور بولی۔ ”تیمور ہماری

گم شدگی سے بہت پریشان ہے۔ وہ پہلے تمہیں اور مجھے سیل فون پر کال کر رہا ہوگا۔ تمہارا سیل فون آف

میرا سیل فون گر چکا تھا۔ اس صورت میں تو اس کی پریشانی بچاے۔ اس نے ہر میسج میں یہی کہا ہے کہ تم

بھائی! آپ کہاں ہیں؟ آپ خیریت سے تو ہیں؟ آپ کا سیل فون بھی آف ہے اور نادیہ کے سیل فون سے

کوئی جواب نہیں آ رہا ہے۔

نادیہ ابھی میسج پڑھ رہی تھی کہ میرے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔

نادیہ مسکرا کر بولی۔ ”تیمور کی کال ہے۔“ پھر اس نے مٹن دبا کر سیل فون کان سے لگا لیا۔ ”ہیلو..... ہم

ہم لوگ خیریت سے ہیں۔“ میں نے سائیڈ پر گاڑی روک لی کیونکہ میں جانتا تھا کہ اس وقت تیمور نادیہ کے

میں نہیں آئے گا۔

میں نے نادیہ سے سیل فون لے لیا اور بولا۔ ”ہاں تیمور کہاں ہو تم؟“



”بھیا! آپ مجھ سے پوچھ رہے ہیں؟ میں نے بیسیوں مرتبہ آپ کو کال کی اور ہر بار مجھے وہی ریکارڈنگ سنائی دی کہ آپ کا مطلوبہ نمبر اس وقت بند ہے۔ میں نے یہ ریکارڈنگ اتنی دفعہ سنی ہے کہ مجھے اس آواز سے نفرت ہو گئی ہے۔ میں نے پریشانی کے عالم میں کینٹ اسٹیشن کے قرب و جوار کا پورا علاقہ چھان مارا ریلوے کے پارکنگ ایریا میں اور مختلف جگہ کنٹی لینڈ کروزرز موجود تھیں لیکن آپ کی گاڑی مجھے نہیں نظر نہیں آئی۔“

”یار! ہم لوگ ایک چکر میں پھنس گئے تھے۔“ میں نے کہا۔ ”تفصیل تو تمہیں ملنے کے بعد ہی سناؤں گا۔ اصل میں نادیر کو کچھ بد معاشوں نے اغوا کر لیا تھا.....“

”لیکن نادیر..... تو..... شاید اس وقت آپ کے ساتھ ہیں؟“

”شاید نہیں وہ واقعی میرے ساتھ ہے۔ ابھی تم سے بات تو ہوئی ہے اس کی۔“ میں نے کہا۔

”میرا ذہن تو ابھی تک ماؤف ہے بھیا.....!“ تیمور نے کہا۔ ”آپ دونوں کے سیل فون خاموش ہو گئے آپ کی گاڑی کا کہیں سراغ نہیں ملا تو دل میں طرح طرح کے وہم آتے گئے کہ کہیں آپ غنی بلوچ یا شہدی کے ہتھے نہ چڑھ گئے ہوں۔“

”سوری یار.....!“ میں نے کہا۔ ”کہ تم لوگوں کو ہماری وجہ سے اتنی پریشانی اٹھانا پڑی لیکن ہم بھی مجبور تھے۔“ پھر میں نے موضوع بدلنے کو کہا۔ ”تیمور.....! تم اس وقت ہو کہاں؟“

”میں اسٹیشن اور اس کے قرب و جوار کی خاک چھان کر ابھی گھر پہنچا ہوں۔ ہاشم صاحب بھی آپ لوگوں کی تلاش میں نکلے ہوئے ہیں۔ وہ بھی آپ دونوں کے سیل پر ٹرائی کرتے رہے۔“

”میں اس وقت کینٹ اسٹیشن جا رہا ہوں۔ تم ہاشم کو ٹیلی فون کر کے بتا دو کہ ہم لوگ خیریت سے ہیں اور تم بھی کینٹ اسٹیشن پہنچ جاؤ۔ میرا اندازہ ہے کہ تم ہم سے پہلے وہاں پہنچ جاؤ گے۔ ڈیفنس سے کینٹ اسٹیشن بہت نزدیک ہے۔“

”ٹھیک ہے میں پہنچتا ہوں۔“ تیمور نے کہا۔

میں نے ٹیلی فون کا سلسلہ منقطع کر کے اسے جیب میں ڈال لیا۔

ہم اس وقت کلفٹن دوٹووار کے پاس کھڑے تھے۔

کینٹ اسٹیشن کے نزدیک ایک تیسرے درجے کا ایک ہوٹل تھا سلطان مجھے وہیں جانا تھا لیکن میں نے نادیر کو ساتھ لے کر وہاں جانا مناسب نہ سمجھا۔

.....

میں اور تیمور اس وقت اس پی سی او کے سامنے کھڑے تھے جہاں سے شائستہ نے وردہ کے گھر کال کی تھی۔

پی سی او کا مالک جو پچیس تیس سال کا ایک جوان آدمی تھا وہ اس وقت خواخوہ بری نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔

وہ خاصی بڑی دکان بھی جو لمبائی میں زیادہ اور چوڑائی میں کم تھی۔ بائیں ہاتھ پر چار بوتھ بنے ہوئے تھے۔ وہ شخص ایک کاؤنٹر پر بیٹھا تھا۔ اس پہ بھی دو تین ٹیلی فون سیٹ رکھے ہوئے تھے اور دو آدمی کاؤنٹر ہی پر کھڑے کسی سے بات کر رہے تھے۔

”بھیا.....!“ تیمور نے آہستہ سے کہا۔ ”پی سی او کا کاروبار اس حصہ میں بھی اتنا چلتا ہے؟“

”یہ کاروبار صرف اسٹیشن اور بسوں کے اڈوں ہی پر چلتا ہوگا۔“ میں نے پر خیال انداز میں کہا۔ ”کراچی

”اس نے دو تین دفعہ ایک نمبر ڈائل کیا۔ مجھے تو یہاں اسکرین پر نظر آتا ہے۔ اس نے ایک کی بجائے تین یا چار کالز کیں۔ مجھے غصہ بھی آیا کہ اس لڑکی نے صرف ایک کال کرنے کی بات کی تھی اور اس نے انہی تین چار کالز کر دی ہیں پھر..... پھر.....“

”ہاں پھر کیا؟“ تیمور نے پوچھا۔

”پھر حاکم خان یہاں کسی کام سے آیا۔“

”حاکم خان.....!“ تیمور نے پوچھا۔ ”کون حاکم خان؟“

”وہ یہیں کے ایک چھوٹے سے ہوٹل ریلیکس کا مالک ہے۔ انتہائی بدمعاش شخص ہے، ہوٹل کی آڈ میں دوسرے دھندے کرتا ہے.....“

”ہم نے تم سے حاکم خان کا شجرہ نہیں پوچھا ہے۔“ میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”ہمیں اس لڑکی کے بارے میں بتاؤ۔“

”وہی بتا رہا ہوں صاحب!“ اس نے کہا۔ ”حاکم خان نے اس لڑکی کو وہاں سے نکلے ہوئے دیکھا تو مجھ سے بولا۔“ یہ پڑیا کون ہے؟“

”میں نے کہا۔“ یہ ٹیلی فون کرنے آئی ہے۔ شاید یہ کسی اور شہر سے آئی ہے اور اسے مطلوبہ ٹیلی فون نمبر نہیں مل رہا ہے۔“

حاکم خان نے آگے بڑھ کر لڑکی سے کہا۔ ”سنو تم کہاں جانا چاہتی ہو؟“

لڑکی نے رکھائی سے جواب دیا۔ ”میں کہیں بھی جاؤں، تمہیں اس سے کیا مطلب؟“

”دیکھو لڑکی.....! زمانہ بہت خراب ہے۔ تم اتنی رات کو اس بدنام علاقے میں اکیلی گھوم رہی ہو۔ یہ ٹھیک نہیں ہے۔ چلو میرے ساتھ چلو۔“ حاکم خان نے حکمانہ لہجے میں کہا۔

اسی وقت حاکم خان کے دو ملازم شیر خان اور عبدالصمد بھی وہاں آ گئے۔

حاکم خان نے لڑکی کا ہاتھ پکڑنا چاہا تو لڑکی نے اس کے منہ پر زناٹے دار تھپڑ مار دیا اور سخت لہجے میں بولی۔ اپنے ہاتھ دور رکھو.....“ حاکم خان اس پر پھر گیا۔ اس نے لڑکی کو پکڑنے کی کوشش کی لیکن وہ لڑکی تو صاحب چھلاؤ ہے وہ مارشل آرٹ کی ماہر لگ رہی تھی۔ اس نے حاکم خان کے سینے پر فلائنگ کک رسید کر دی۔ حاکم خان کے ملازموں میں سے ایک نے پشت سے اس کے سر پہ اسٹیل کا جگ مار دیا جس سے وہ چکر کھا گئی اور ان لوگوں نے اسے پکڑ لیا۔ اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے صاحب! میں تو.....“

”حاکم خان کہاں ملے گا؟“ تیمور کی آواز غصے سے لرز رہی تھی۔

”یہاں سے دو گلیاں چھوڑ کر دو تین چھوٹے چھوٹے ہوٹل ہیں ان میں سے ایک ہوٹل ریلیکس بھی ہے۔ حاکم خان اس وقت بھی وہاں ہوگا۔ وہ ہوٹل ہی میں رہتا ہے صاحب! لیکن دیکھیے..... میرا..... نام.....“

مجھے اس کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی غصے کی شدت سے میرے ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے۔ یہی حال تیمور کا بھی تھا۔ میں نے رخ مت لہجے میں کہا۔ ”حاکم خان..... شاید تیری موت آگئی ہے.....“

کینٹ اسٹیشن پر اندرون ملک سے روزانہ ہزاروں آدمی سفر کرتے ہیں۔ ان میں سے بہت سے لوگوں کے پاس سیل فون نہیں ہوتے خاص طور پر پاکستان کے دیہی علاقوں سے آنے والے سیل فون کراچی آنے کے بعد خریدتے ہیں۔“ پھر میں مسکرا کر بولا۔ ”کچھ بھی ہے ابھی تو ہمیں اس شخص سے شائستہ کے بارے میں معلومات کرنا ہیں۔“

ہم بھی کاؤنٹر کے پاس جا کر کھڑے ہو گئے۔ نادیر کو ہم نے گاڑی میں ہی چھوڑ دیا تھا اور اسے سختی سے تاکید کر دی تھی کہ گاڑی کے شیشے یا دروازے ہرگز نہ کھولے۔ اس وقت ہم کسی نئے ایڈ ونچر کے تحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ پی ای او کے مالک نے ایک نظر ہم پر ڈالی پھر کاروباری انداز میں بولا۔ ”آؤ جناب، ٹیلی فون کرنا ہے۔ آپ ایسا کرو تو تھوڑے نمبر تین میں چلے جاؤ۔“

”ہمیں ٹیلی فون نہیں کرنا ہے بلکہ آپ سے کچھ بات کرنا ہے۔“ تیمور نے سرد لہجے میں کہا۔

”کریں جناب!“ وہ ہنس کر بولا۔ ”میں حاضر ہوں۔“

”کل رات کو کسی لڑکی نے یہاں سے ٹیلی فون کیا تھا؟“ میں نے غور سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

”یہاں سے تو لڑکیاں لڑکے، مرد، عورتیں سبھی دن رات فون کرتے ہیں صاحب!“ وہ ہنس کر بولا۔ ”میں چوبیس گھنٹے سروس دیتا ہوں۔“

”میں نے جو کچھ پوچھا ہے اس کا جواب دو۔“ میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ”کل رات یہاں سے کسی لڑکی نے ٹیلی فون کیا تھا؟“

”ضرور کیا ہوگا جناب!“ اس نے جواب دیا۔ ”ہمارا تو کاروبار یہی ہے۔“ اس نے پھر مسکرا کر کہا۔

”رات کو ڈیڑھ بجے کے قریب ایک جوان اور تہا لڑکی نے ٹیلی فون کیا تو تمہیں یاد تو ہوگا؟“

”ہم کس کس کو یاد رکھیں صاحب!“ اس نے کہا۔ ”یہاں تو.....“

”میری بات کا جواب دو۔“ میں نے درشت لہجے میں کہا۔ ”ورنہ تمہانے جا کر پوچھ گچھ کروں گا۔“

”میں سمجھا نہیں۔“ وہ حیرت سے بولا۔ ”اگر کسی نے یہاں سے ٹیلی فون کیا بھی تھا تو کیا یہ جرم ہے؟“

تیمور نے ایک دم اس کے گریبان پر ہاتھ ڈال دیا اور بولا۔ ”تو سیدھی طرح بات کیوں نہیں کرتا؟ سر جو کچھ پوچھ رہے ہیں اس کا جواب دے ورنہ.....“ اس نے جھٹکے سے اس کا گریبان چھوڑ دیا۔

وہ تھوک نکل کر بولا۔ ”مجھے یاد کرنے دیں۔“

”یاد کرنے کی کیا بات ہے؟“ تیمور نے پھر غرا کر کہا۔ ”تجھے اچھی طرح یاد ہوگا رات میں ایسی کتنی لڑکیوں نے ٹیلی فون کیا تھا جو انکی بھی نہیں اور.....“

”ہاں مجھے یاد آ گیا۔“ وہ جلدی سے بولا۔ ”ایک لڑکی یہاں آئی تو تھی اس نے بہت اعلیٰ لباس پہن رکھا تھا اور حلے سے کسی بڑے خاندان کی معلوم ہوتی تھی۔ اس نے مجھ سے کہا کہ میرے پاس پانچ ہزار روپے کا نوٹ ہے۔ اگر آپ کے پاس چھینچ ہو تو میں ایک کال کر لوں؟“ لڑکی چہرے سے بہت پریشان لگ رہی تھی۔ میں نے کہا کہ میرے پاس اس وقت اتنے پیسے تو نہیں ہیں میں ابھی تھوڑی دیر پہلے تمام گیس گھر بیچ چکا ہوں آپ کال کر لیں۔ پیسے بعد میں دے دیجیے گا۔“

”پھر..... پھر کیا ہوا؟“ میں نے پوچھا۔



ہم وہاں سے باہر نکلے ہی والے تھے کہ تیمور نے اچانک گھوم کر پی سی او کے مالک کا گریبان پکڑ لیا اور بولا  
”تم کسے ٹیلی فون کر رہے تھے؟“

”میں تو..... میں تو..... اپنے..... ایک دوست کو.....“

تیمور نے اس کا گریبان پکڑ کر کاؤنٹر کے پیچھے سے گھٹ لیا اور اسے دھکیلتا ہوا ہاتھ روم کی طرف لے گیا  
پہلے اس نے جھانک کر ہاتھ روم کا جائزہ لیا پھر مطمئن ہو کر پی سی او کے مالک کو اس میں دھکیل دیا اور باہر  
دروازہ بند کر دیا اور مجھ سے بولا۔ ”بھیا.....! میرے دو دو شاید حاکم خان کو اطلاع دینے کی کوشش کر رہا تھا۔“  
ہم لوگ وہاں سے باہر نکل کر اپنی گاڑی تک پہنچے تو نادیر بے زاری کے عالم میں سیٹ پر نیم دراز تھی۔ ہم  
دیکھ کر وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور بولی۔ ”کچھ معلوم ہوا؟“

”نادیر! ابرامت ماننا اس وقت تمہیں واپس جانا پڑے گا۔“ میں نے کہا۔ ”یہ اچھا علاقہ نہیں ہے۔ یہ  
یہاں ابھی کچھ دیر اور لگے گی۔ تم ایسا کرو کہ تیمور کی گاڑی لے جاؤ۔“

”یہ بات تم لوگ مجھے پہلے ہی بتا دیتے تو میں اتنی بورتو نہ ہوتی۔“ نادیر نے منہ بنا کر کہا۔  
”اصل میں ہمیں خود بھی حالات کا بالکل اندازہ نہیں تھا۔“ میں نے کہا۔

”شائستہ کے بارے میں کچھ معلوم بھی ہوا؟“ نادیر نے پوچھا۔

”ہاں‘ معلوم تو ہوا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”وہاں شائستہ ہمیں وہاں مل جائے۔ باقی باتیں تفصیل سے  
آ کر بتاؤں گا۔“ میں نے کہا۔

میں نے تیمور کو پہلے ہی گاڑی لینے بھیج دیا تھا۔ اس کی گاڑی کینٹ اسٹیشن کے پارکنگ لاٹ میں تھی۔

وہ اپنی گاڑی سے آیا اور نادیر سے بولا۔ ”یہاں سے سیدھی گھر جانا اور راستے میں کہیں مت رکنا۔“

”کسی اجنبی سے کوئی چیز لے کر مت کھانا اور جب تک ماما یا پاپا اسکول نہ آ جائیں اس وقت تک باہر نہ  
نکلنا۔“ نادیر طنز پر لہجے میں بولی۔

اس کی جلی کٹی باتوں پر میں اور تیمور ہنسنے لگے۔

”تم لوگ بھی بعض اوقات مجھے بچوں کی طرح ٹریٹ کرتے ہو۔“ نادیر نے منہ بنا کر کہا اور اسٹیرنگ پر ہاتھ  
گئی پھر طنز پر لہجے میں بولی۔ ”اب میں یہ کھانا چلاؤں گی؟“

وہ تیمور کی دو سال پرانی کروڑا کوکھٹا را کہہ رہی تھی۔  
”شکر کرو کہ میرے پاس یہ کھانا ہے ورنہ ملک کے کروڑوں افراد کے پاس تو سائیکل بھی نہیں ہے۔“ تیمور

نے چڑکھایا۔

نادیر نے گاڑی اشارت کی اور ہاتھ ہلاتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔

”اب اپنی گاڑی یہیں چھوڑیں اور پیدل ہی ہوٹل ریلیکس تک چلیں۔“ تیمور نے کہا۔

”اے ایسی جگہ پارک کر دو کہ ہمیں اگر یہاں سے غلٹ میں نکلنا پڑے تو کوئی پریشانی نہ ہو۔“ میں نے کہا۔

تیمور نے ایک بند دکان کے سامنے گاڑی اس انداز سے پارک کی کہ ہم بلا رکاوٹ وہاں سے نکل سکتے تھے۔

اس وقت شام کے سات بج رہے تھے اور وہاں پر رش بڑھتا جا رہا تھا۔

.....

ہمیں ہوٹل ریلیکس ڈھونڈنے میں زیادہ دقت پیش نہیں آئی۔ کاؤنٹر پر پھیلے ہوئے جسم کا ایک بد معاش  
شخص بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا سر گنجا تھا اور جسم پر گہرے رنگ کا شلوار سوٹ تھا۔ اس نے ہمیں دیکھ کر خواہ مخواہ دانت  
نکالے اور نرس کر بولا۔ ”آؤ صاحب جی میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“

”تم یہ خدمت کر دو کہ ہمیں حاکم خان سے ملو اور۔“ تیمور نے کہا۔

اس نے چونک کر ہمیں دیکھا پھر بولا۔ ”حاکم خان؟“

”ہاں، کیا تم حاکم خان کو نہیں جانتے؟“ میں نے کہا۔ ”اس ہوٹل کا مالک وہی ہے نا؟“

”ہاں جی وہی ہیں لیکن آپ لوگ کون ہیں؟“

”کیا تم حاکم خان کے ہرمہمان سے یہی سوالات کرتے ہو؟“ میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

وہ میرے سخت انداز اور لہجے پر کچھ گڑبڑا گیا اور بولا۔ ”سر.....! خان صاحب کو آپ کا نام بتانا پڑے گا۔“  
اس نے انٹرکام کارڈ پر سیور اٹھاتے ہوئے کہا۔

”اس کو بتاؤ کہ تیمور خان اس سے ملنا چاہتا ہے۔“ میں نے تیمور کے نام کے ساتھ خان کا اضافہ کرتے  
ہوئے کہا۔

اس نے انٹرکام پر کوئی نمبر ملایا اور بولا۔ ”خان جی.....! یہ آپ کے اور مہمان آئے ہیں۔ آپ سے ملنا  
چاہتے ہیں۔ جی یہ کوئی تیمور خان صاحب ہیں ان کے ساتھ ایک صاحب اور ہیں۔“ پھر وہ ریسپور پر ہاتھ رکھ کر

بولا۔ ”سر.....! خان جی پوچھ رہے ہیں کہ آپ کہاں سے آئے ہیں؟“  
”ان سے کہنا کہ میں نوشہرہ سے آیا ہوں۔“ تیمور نے کہا۔

”خان جی.....! یہ تیمور خان صاحب تو نوشہرہ سے آئے ہیں۔“ اس نے پھر ریسپور پر ہاتھ رکھا اور بولا۔  
”خان جی پوچھ رہے ہیں کہ کیا آپ کو عادل خان سے بھیجا ہے؟“

”نہیں مجھے شیر باز خان نے بھیجا ہے وہ علاقہ غیر کا بہت بڑا خان ہے۔“

”خان جی.....! انہیں علاقہ غیر کے ایک خان شیر باز خان نے بھیجا ہے۔“ کاؤنٹر والے نے کہا۔  
”اچھا..... خان جی.....! میں انہیں بھیجتا ہوں۔“

اس نے ریسپور رکھ کر ہم سے کہا۔ ”آپ سامنے والی سیڑھیوں سے اوپر چلے جائیں۔ کوریڈور کا آخری کمرہ  
خان جی کا ہے۔“

ہم سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آئے۔ سیڑھیاں بھی انتہائی غلیظ اور جگہ جگہ سے ٹوٹی ہوئی تھیں۔ دیواروں پر بھی  
شاید کئی سال پہلے رنگ دروغن کیا گیا تھا۔ کوریڈور میں ٹائلز کی بجائے سینٹ کا کھر درافرش تھا جسے چھپانے کے

لیے اس پر کارپٹ ڈالا گیا تھا جو کثرت استعمال سے انتہائی بوسیدہ ہو چکا تھا اور کئی جگہ سے پھٹ بھی گیا تھا۔ اس  
میں سے سینٹ کا کھر درافرش صاف نظر آ رہا تھا۔

کوریڈور میں دونوں جانب کمروں کے دروازے تھے جنہیں دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے یہ کمروں کے نہیں بلکہ  
اسٹور روم یا ہاتھ روم کے دروازے ہوں۔

آخری کمرے کی حالت قدرے بہتر تھی۔ اس کا دروازہ بھی بڑا تھا اور دروازے کے باہر ڈور میٹ بھی بنا  
تھا۔ کمرے کی بیرونی دیواروں پر نیارنگ دروغن بھی تھا جو دوسرے کمروں کی راہداریوں کی اڑی اڑی رنگت کی

وجہ سے اچھا لگنے کی بجائے برا لگ رہا تھا۔

کاؤنٹر کلرک نے ہمارے پیچھے ہوٹل کے ایک کابل سے ملازم کو بھی بھیجا تھا جو ہماری رہنمائی کرنے کی بجائے ہم سے چار قدم پیچھے چل رہا تھا۔ جب ہم حاکم خان کے کمرے پر پہنچ گئے تو ملازم نے دور ہی سے کہا۔  
”خان جی کا یہی کمرہ ہے۔“ اور واپس چلا گیا۔

تیمور نے کمرے کے دروازے پر دستک دی۔ جواب میں کوئی بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”اندر آ جائیں“  
دروازہ کھلا ہے۔“

ہم اندر داخل ہوئے تو ایئر فریشر اور الکل کی ملی جلی مہک نے ہمارا استقبال کیا۔ کمرے میں دو افراد موجود تھے اور دونوں ہی پینے پلانے میں مصروف تھے۔

”حاکم خان صاحب.....!“ تیمور نے کہا۔

ان میں سے لبارٹریکا ایک شخص کھڑا ہو گیا اور بولا۔ ”میں ہوں حاکم خان!“ اس نے پرتپاک انداز میں مجھ سے اور تیمور سے مصافحہ کیا اور بولا۔ ”تشریف رکھیے۔ کیا لیں گے آپ؟“ ”کوک سوٹ ڈرنک؟“

”کچھ بھی نہیں۔“ تیمور نے سرد لہجے میں کہا۔ ”ہم لوگ اس وقت ڈیوٹی پر ہیں اور ڈیوٹی کے دوران میں کچھ بھی کھانے پینے سے پرہیز کرتے ہیں۔“

ڈیوٹی کا نام سن کر دوسرے شخص نے چونک کر تیمور کو دیکھا اور بولا۔ ”علی احمد تو بتا رہا تھا کہ آپ کو شیر باز خان صاحب نے بھیجا ہے؟“

”آپ کی تعریف؟“ تیمور نے اس کی بات کا جواب دینے کی بجائے حاکم خان سے پوچھا۔

”یہ میرے کلائنٹ ہیں، ابھی تھوڑی دیر پہلے ان سے ایک ڈبل فاسٹل ہوئی ہے۔“

”آپ پہلے ان سے فارغ ہو جائیں۔“ تیمور نے کہا۔ ”مجھے کوئی ایسی جلدی نہیں ہے۔ میں آپ کے ساتھ اطمینان اور سکون سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“

”اچھا“ آپ تشریف تو رکھیں کم سے کم کولڈ ڈرنک ہی لیں۔“ اس نے کولڈ ڈرنک کی دو بوتلیں کمرے میں رکھے ہوئے فریج میں سے نکالیں اور کھول کر ہماری طرف بڑھادیں پھر وہ اس شخص سے مخاطب ہوا۔ ”فیروز بھائی.....! تو پھر میں سودا کا کچھ بچوں؟“

”مجھے مال ایک نظر دکھا دو۔“ فیروز بھائی نے کہا۔

”مال تو سنبھا ہے کچھ.....“ حاکم خان نے بازاری انداز میں کہا۔ ”اتفاق سے کل رات ہی میرے ہاتھ لگا ہے۔ لڑکی کیا ہے؟ شعلہ جوالہ ہے۔ دیکھو گے تو تمہیں پانچ لاکھ بھی کم محسوس ہوں گے لیکن ایک بات کا خیال رکھنا“

وہ لڑکی بہت سرکش ہے۔“

”حاکم بھائی.....! اس کی تو فکر ہی مت کرو میں نے بڑے بڑے سرکش گھوڑوں اور ان سے بھی زیادہ سرکش افسروں کو لگام ڈال دی ہے تو پھر لڑکی ہے لیکن میں ان سے ایک نظر دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”دخل اندازی کی معافی چاہتا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”شیر باز خان نے بھی کچھ مال بھیجا ہے۔ فیروز بھائی چاہیں تو اس میں سے شیر کر لیں۔“ میں نے یہ بات اس لیے کہی تھی کہ وہ لوگ میرے سامنے بے تکلف ہو کر بات کریں کہ اس شخص کا تعلق بھی ہماری ہی قبیل سے ہے۔

”معاف کیجیے گا۔“ حاکم خان نے الجھ کر کہا۔ ”میں نے شیر باز خان کا نام پہلے کبھی نہیں سنا۔“

”اصل میں وہ پہلے انہوں کا کاروبار کرتے تھے اس فیلڈ میں ابھی ابھی آئے ہیں۔ ان کے کسی دوست نے یہاں کے دو تین افراد کے ایڈریس دیئے تھے کہ وہاں مال کی کھیت اچھی ہو جائے گی۔ اگر آپ کو مال میں کوئی دلچسپی نہیں ہے تو ہمیں اجازت دیں، ہمیں پھر دوسرے آدمی سے رابطہ کرنا پڑے گا۔“

”ارے صاحب یہ کیا بات ہوئی۔“ حاکم خان ہنس کر بولا۔ ”مجھے تو مال سے مطلب ہے، اگر مال اچھا ہے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ آپ کو کس نے بھیجا ہے؟“

”سوری“ میں نے آپ کو سٹرب کیا۔“ میں نے کہا۔ ”آپ فیروز بھائی سے بات مکمل کر لیں۔“

”بات کیا کرنا ہے بھائی؟“ فیروز بھائی نے کہا۔ ”ہم جب حاکم سینٹھ کو پورا مال دے رہے ہیں تو ہمارا بھی تو حق بنتا ہے کہ جو مال بھی لیں اسے اچھی طرح دیکھ بھال کر لیں۔“

”آپ کا بالکل حق بنتا ہے۔“ حاکم خان نے کہا۔ ”میں ابھی اس لڑکی کو یہاں بلواتا ہوں لیکن میں آپ کو پہلے بتا چکا ہوں کہ وہ لڑکی بہت سرکش ہے اس لیے.....“

”ارے یا زاس کی پروا مت کرو تم مال منگاؤ۔“ فیروز بھائی نے کہا۔

میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ حاکم خان یعنی طور پر شائستہ ہی کی بات کر رہا تھا۔ وہ ایک دفعہ یہاں آ جاتی تو پھر اسے یہاں سے لکانا کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا۔ میں نے تیمور کی طرف دیکھا اس کے چہرے پر بھی دبا دبا جوش تھا۔

حاکم خان نے سیل فون نکالا اور کسی کا نمبر ملا کر بولا۔ ”ہاں، بابر خان، تم اور دلدار اس لڑکی کو یہاں لے آؤ“

پارٹی اسے دیکھنا چاہتی ہے۔ یا زوہ لڑکی ہے، کوئی بلا نہیں ہے کہ تم لاتے ہوئے ڈر رہے ہو۔ ایسا ہی ہے تو تم اس کے ہاتھ بندھ کر یہاں لے آؤ یا پھر اس سے کوئی بھی بہانہ بنا دینا کہ اس نے تمہیں چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

جلدی کر ڈپارٹی کے پاس اتنا وقت نہیں ہے۔“ وہ فیروز بھائی سے مخاطب ہوا۔ ”میں نے لڑکی کو یہاں بلایا ہے۔“

وہ دونوں پھر پینے پلانے کے شغل میں مصروف ہو گئے۔

تیمور نے جھک کر آہستہ سے میرے کان میں سرگوشی کی۔ ”بھیا! آپ نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ شائستہ مارشل آرٹ کی ماہر ہے؟“

”ماہر تو نہیں ہے، بس ارسلان کے ساتھ رہ کر شوق ہی شوق میں مارشل آرٹ سیکھ لیا ہے۔“

اسی وقت کسی کے سیل فون کی گھنٹی بجی۔ ہم دونوں نے چونک کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا لیکن وہ سیل حاکم خان کے سیل فون کی تھی۔ اس نے اسکرین پر ایک نظر ڈالی اور سیل فون کان سے لگا کر بولا۔ ”ہاں بابر، کوئی خاص بات؟ کیا.....“ وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ ”کیسے..... کب..... اچھا..... وہ..... زیادہ زخمی تو نہیں ہے.....؟“

ارے تو ہاسپٹل پہنچو اور تم فوراً یہاں آؤ۔“ اس نے سیل فون آف کر کے بے دلی سے صوفے پر اچھال دیا۔

”خیریت تو ہے خان جی؟“ فیروز بھائی نے پوچھا۔ ”آپ اتنے پریشان کیوں ہو؟“

”یا زوہ لڑکی فرار ہو گئی ہے.....“ حاکم خان نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ اس نے میرے ایک آدمی کو بھی بری طرح زخمی کر دیا ہے۔“

اس کی بات سن کر میری جان میں جان آئی۔ ”میں تو یہ سمجھا تھا کہ شاید اس کے آدمیوں نے شائستہ کو زخمی



کر دیا ہے اور وہ اسے اسپتال پہنچنے کی بات کر رہا ہے۔  
 ”میں معذرت چاہتا ہوں فیروز بھائی!“ حاکم خان نے کہا۔ ”میرے آدمی اس لڑکی کے پیچھے لگے ہیں۔ وہ مجھ سے بچ نہیں سکے گی۔“

”او بھائی..... ایسی خونخوار لڑکی مجھے نہیں چاہیے مجھے تو کوئی اور پس دکھاؤ۔“  
 ”اس وقت تو میرے پاس کوئی پس نہیں ہے میں دو دن بعد آپ کو بلاتا ہوں۔“ اس نے سائیڈ پر رکھا ہوا بریف کیس اٹھا کر فیروز بھائی کی طرف بڑھا دیا۔ ”اپنی امانت سنبھالیں چاہیں تو گن لیں ویسے میں نے تو ابھی تک اس بریف کیس کو ہاتھ بھی نہیں لگایا ہے۔“  
 فیروز بھائی نے بریف کیس لیتے ہوئے کہا۔ ”یہ بھائی بھی تو کچھ مال کی بات کر رہا تھا؟“

”اس میں تو ابھی دیر لگے گی فیروز بھائی.....!“ میں نے کہا۔ ”پہلے تو میں حاکم خان صاحب سے سودا طے کروں گا پھر مال انہیں دکھا کر ان کے حوالے کروں گا۔ اس میں بھی دو دن تو لگ ہی جائیں گے۔“  
 ”اچھا خان صاحب.....!“ فیروز بھائی بریف کیس اٹھا کر بولا۔ ”میں دو دن بعد آپ کو ٹیلی فون کروں گا۔“ یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”آپ فکر مت کریں فیروز بھائی!“ حاکم خان نے کہا۔ ”مال ملتے ہی میں خود آپ کو ٹیلی فون کر دوں گا۔ آپ تو ہمارے پرانے کرم فرما ہیں ویسے اتنی لڑکیوں کا آپ کرتے کیا ہیں؟“  
 ”او بھائی.....! اپنے اپنے بزنس کی بات ہے۔“ فیروز بھائی نے کہا۔ ”میں نے تو کبھی آپ سے یہ نہیں پوچھا کہ آپ اتنی لڑکیاں لاتے کہاں سے ہیں؟“

”ارے فیروز بھائی! آپ تو برا مان گئے۔“ حاکم خان نے کہا۔ ”میں نے تو ایک بات پوچھی ہے۔ ٹھیک ہے پھر میں آپ کو دو دن بعد کال کرتا ہوں۔“ فیروز بھائی مایوسی کے عالم میں وہاں سے چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد حاکم خان ہماری طرف متوجہ ہوا۔ ”ہاں خان صاحب! اب بتائیے آپ کے پاس کہاں کا مال ہے؟“  
 اس کے چہرے پر کدوہ مسکراہٹ تھی۔ ”پنجاب کا یا سندھ کا یا پھر کراچی کا؟“

جواب میں تیمور بھی مسکرایا۔ اس نے محتاط نظروں سے ارد گرد دیکھا اور اٹھ کر دروازہ بند کر دیا پھر بولا۔  
 ”ہمارے پاس خالص براٹڈ ڈال ہے فرانس اور جرمنی کا۔ میرے خیال میں آپ کو جرمنی کا مال پسند آئے گا؟“  
 ”جرمنی کا؟“ حاکم خان نے تجسس سے پوچھا۔

”ہاں جرمنی کا۔“ تیمور نے کہا اور اچانک اپنے بگلی ہولسٹر سے جرمن ماؤزر نکال لیا۔ ”یہ خالص جرمن کا بنا ہوا ہے اور ایک وقت میں آٹو میک طور پر نو فائر کرتا ہے اور مینوئل بھی ہے۔ اس سے آپ ایک ایک کر کے فائر بھی کر سکتے ہیں۔“

حاکم خان کا منہ بن گیا۔ ”سوری خان صاحب“ میں آج کل اسلحے کی ڈیل نہیں کرتا۔ اس فیلڈ میں آج کل بہت کمیشن ہے اور ایک طرح سے اس میدان میں شہدائی کی اجارہ داری ہے۔“  
 ”لیکن ہم ڈیل کرتے ہیں۔“ میں نے کہا اور اپنا ریو لوئر نکال کر حاکم خان کی طرف تان لیا۔

”یہ..... یہ..... کیا مذاق کر رہے ہیں آپ لوگ؟“  
 ”یہ مذاق نہیں ہے حاکم خان.....!“ تیمور نے آگے بڑھ کر ماؤزر حاکم خان کی کینٹی پر رکھ دیا۔ ”اس میں

سے بالکل اصلی گولی نکلتی ہے اور اس کی نال دیکھ رہے ہو تم؟ یہ اس لیے بھی ہے کہ اس پہ سائکس فرٹ ہے اس لیے گولی بھی بے آواز نکلتی ہے۔ اب بتاؤ تم نے اس لڑکی کو کیوں پکڑا تھا؟“  
 ”کس لڑکی کی بات کر رہے ہو تم؟“

”اس لڑکی کی جوا بھی تمہارے آدمی کو زخمی کر کے بھاگی ہے۔“  
 ”اس..... لڑکی سے..... تمہارا کیا..... تعلق؟“ حاکم خان ٹھوک نکل کر بولا۔  
 ”وہ لڑکی میری بہن ہے حاکم خان.....!“ تیمور نے کہا۔ ”یہ بات مجھے ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی معلوم ہوئی ہے کہ تم نے اسے پکڑ لیا تھا اور وہ تمہاری قید میں تھی۔ تم اب اسے فیروز بھائی جیسے عیاش آدمی کے ہاتھ پانچ لاکھ میں فروخت کر رہے تھے؟“

”مجھے معلوم نہیں تھا کہ..... وہ لڑکی آپ کی..... بہن ہے خان صاحب.....!“ وہ گھگھاکر بولا۔  
 ”اگر معلوم ہوتا تو تم کیا کرتے؟“ میں نے طنز یہ لہجے میں پوچھا۔ ”وہ کسی نہ کسی کی بہن تو ہوگی یہ بات تم نے اس وقت نہیں سوچی؟“

”میں..... آپ سے..... معافی چاہتا ہوں..... خان صاحب.....!“  
 تیمور نے اچانک لات مار کے اس کے سامنے رکھا ہوا سیل فون دور پھینک دیا۔ سیل فون سیٹ کمرے کی دیوار سے ٹکرا کر ٹوٹ گیا اور اس کا دائرہ بھی جھٹکے سے ٹوٹ گیا پھر اس نے ہاتھ بڑھا کر حاکم خان کا سیل فون اٹھا لیا۔

”دیکھیے خان صاحب.....! آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہ لڑکی یہاں سے فرار ہو چکی ہے ورنہ میں اسے بے چون و چرا آپ کے حوالے کر دیتا۔ اب بھی اگر میرے آدمیوں نے اُسے پکڑ لیا تو میں اسے آپ کے حوالے کر دوں گا۔“

”اب تم یا تمہارے آدمی اس کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتے۔“ تیمور نے کہا۔ ”تم نے اس کی قیمت پانچ لاکھ لگائی تھی صرف پانچ لاکھ؟“  
 ”خان صاحب! مجھے معاف کر دیں..... میرے پاس جتنی دولت ہے سب لے لیں لیکن اللہ کا واسطہ میری جان بخش دیں۔ میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔“

”تم نے اس سے پہلے شاید برسوں قبل اللہ کا نام لیا ہوگا۔“ میں نے کہا۔ ”موت سر پہ ہو تو بڑے بڑوں کو اللہ یاد آ جاتا ہے۔ تم جن لوگوں کو برباد کرتے ہو ان کے بھی تو چھوٹے چھوٹے بچے ہوتے ہیں کبھی ان کے بارے میں بھی سوچا ہے؟“

”ویسے تم نے اب تک اس کام میں کتنی دولت کمائی ہے؟“ میں نے پوچھا۔  
 ”آپ تو شاید پہلے ہی سے سب کچھ جانتے ہیں۔ میرے اس ہوٹل کی بالائی منزل پر بہت بڑے پیانے پر جوا ہوتا ہے۔“

”اس کے علاوہ تم نے دیسی شراب کی بھینیاں بھی لگا رکھی ہیں تمہاری ہی تیار کردہ شراب سے اکثر لوگ مر رہے ہیں اب تمہیں زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔“  
 ”ذمہ مجھے مت مارو تم مجھ سے جتنا پیسا مانگو گے میں تمہیں دوں گا۔“

کر دیا ہے اور وہ اسے اسپتال پہنچنے کی بات کر رہا ہے۔  
 ”میں معذرت چاہتا ہوں فیروز بھائی!“ حاکم خان نے کہا۔ ”میرے آدمی اس لڑکی کے پیچھے لگے ہیں۔ وہ مجھ سے بچ نہیں سکے گی۔“

”او بھائی..... ایسی خونخوار لڑکی مجھے نہیں چاہیے مجھے تو کوئی اور پس دکھاؤ۔“  
 ”اس وقت تو میرے پاس کوئی پس نہیں ہے میں دو دن بعد آپ کو بلاتا ہوں۔“ اس نے سائیڈ پر رکھا ہوا بریف کیس اٹھا کر فیروز بھائی کی طرف بڑھا دیا۔ ”اپنی امانت سنبھالیں چاہیں تو گن لیں ویسے میں نے تو ابھی تک اس بریف کیس کو ہاتھ بھی نہیں لگایا ہے۔“  
 فیروز بھائی نے بریف کیس لیتے ہوئے کہا۔ ”یہ بھائی بھی تو کچھ مال کی بات کر رہا تھا؟“

”اس میں تو ابھی دیر لگے گی فیروز بھائی.....!“ میں نے کہا۔ ”پہلے تو میں حاکم خان صاحب سے سودا طے کروں گا پھر مال انہیں دکھا کر ان کے حوالے کروں گا۔ اس میں بھی دو دن تو لگ ہی جائیں گے۔“  
 ”اچھا خان صاحب.....!“ فیروز بھائی بریف کیس اٹھا کر بولا۔ ”میں دو دن بعد آپ کو ٹیلی فون کروں گا۔“ یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”آپ فکر مت کریں فیروز بھائی!“ حاکم خان نے کہا۔ ”مال ملتے ہی میں خود آپ کو ٹیلی فون کر دوں گا۔ آپ تو ہمارے پرانے کرم فرما ہیں ویسے اتنی لڑکیوں کا آپ کرتے کیا ہیں؟“  
 ”او بھائی.....! اپنے اپنے بزنس کی بات ہے۔“ فیروز بھائی نے کہا۔ ”میں نے تو کبھی آپ سے یہ نہیں پوچھا کہ آپ اتنی لڑکیاں لاتے کہاں سے ہیں؟“

”ارے فیروز بھائی! آپ تو برا مان گئے۔“ حاکم خان نے کہا۔ ”میں نے تو ایک بات پوچھی ہے۔ ٹھیک ہے پھر میں آپ کو دو دن بعد کال کرتا ہوں۔“ فیروز بھائی مایوسی کے عالم میں وہاں سے چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد حاکم خان ہماری طرف متوجہ ہوا۔ ”ہاں خان صاحب! اب بتائیے آپ کے پاس کہاں کا مال ہے؟“  
 اس کے چہرے پر کدوہ مسکراہٹ تھی۔ ”پنجاب کا یا سندھ کا یا پھر کراچی کا؟“

جواب میں تیمور بھی مسکرایا۔ اس نے محتاط نظروں سے ارد گرد دیکھا اور اٹھ کر دروازہ بند کر دیا پھر بولا۔  
 ”ہمارے پاس خالص براٹڈ ڈال ہے فرانس اور جرمنی کا۔ میرے خیال میں آپ کو جرمنی کا مال پسند آئے گا؟“  
 ”جرمنی کا؟“ حاکم خان نے تجسس سے پوچھا۔

”ہاں جرمنی کا۔“ تیمور نے کہا اور اچانک اپنے بگلی ہولسٹر سے جرمن ماؤزر نکال لیا۔ ”یہ خالص جرمن کا بنا ہوا ہے اور ایک وقت میں آٹو میک طور پر نو فائر کرتا ہے اور مینوئل بھی ہے۔ اس سے آپ ایک ایک کر کے فائر بھی کر سکتے ہیں۔“

حاکم خان کا منہ بن گیا۔ ”سوری خان صاحب“ میں آج کل اسلحے کی ڈیل نہیں کرتا۔ اس فیلڈ میں آج کل بہت کمیشن ہے اور ایک طرح سے اس میدان میں شہدائی کی اجارہ داری ہے۔“  
 ”لیکن ہم ڈیل کرتے ہیں۔“ میں نے کہا اور اپنا ریو لوئر نکال کر حاکم خان کی طرف تان لیا۔

”یہ..... یہ..... کیا مذاق کر رہے ہیں آپ لوگ؟“  
 ”یہ مذاق نہیں ہے حاکم خان.....!“ تیمور نے آگے بڑھ کر ماؤزر حاکم خان کی کینٹی پر رکھ دیا۔ ”اس میں

”چلو! میں بھی دیکھوں، تم کیا قیمت لگاتے ہو اپنی؟“ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

”ایک کروڑ.....“ اس نے کہا۔

”بس، تمہاری جان کی قیمت تمہاری نظروں میں اتنی ہی ہے؟“ میں نے کہا۔ ”کم سے کم پانچ کروڑ تو بتاتے؟“

”چلو پانچ کروڑ ہی سہی.....“ اس نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔ ”لیکن اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ تم پانچ کروڑ لے کر مجھے چھوڑ دو گے؟“

”اس کا فیصلہ تو ہم اسی وقت کریں گے جب کیش ہمارے ہاتھ میں ہوگا۔“

”کیش کے لیے تم لوگوں کو تھوڑا انتظار کرنا پڑے گا۔ مجھے کیش منگوانا ہوگا۔“

تیمور نے آگے بڑھ کر اس کے منہ پر تھپڑ رسید کر دیا اور بولا۔ ”ابھی تم نے خود بتایا ہے کہ تم یہاں ایک قمار خانہ بھی چلا رہے ہو تمہارے پاس کیش کی کیا کمی ہوگی؟“

”میں ہر چیز کا حساب الگ الگ رکھنے کا عادی ہوں۔“ حاکم خان نے کہا۔ ”میں قمار خانے کی رقم سے یکمشت پانچ کروڑ نکال لوں گا تو وہاں پیسوں کی شارٹج ہو جائے گی۔“

”یہ تمہارا مسئلہ ہے۔“ تیمور نے کہا۔ ”تم ہمیں بھی تو کہیں سے کیش منگا کر دے رہے تھے وہ رقم جو تم خانے کے پیسوں میں ڈال دینا۔“ میں نے کہا۔

”جلدی کرو..... ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔“ تیمور نے اسے ماؤز کی نال سے ٹھوکا دے کر کہا۔

حاکم خان لٹکھڑاتا ہوا اٹھا اور اپنے کمرے میں لگی ہوئی ایک سینیڑی اپنی جگہ سے ہٹائی۔ اس کے پیچھے سے ایک سیف برآمد ہوا وہ نمبروں والا نکالا تھا۔ اس نے نمبر ملائے اور سیف کا آہنی دروازہ کھولنا ہی چاہتا تھا کہ تیمور نے اسے روک دیا اور بولا۔ ”تم صرف سیف کھول کر چار قدم پیچھے ہٹ جاؤ باقی کام ہم خود کر لیں گے۔“

لمحے بھر کو حاکم خان کا چہرہ تاریک ہو گیا اس نے سیف کھولا اور چار قدم پیچھے ہٹ گیا۔

تیمور نے آگے بڑھ کر پہلے تو اس کے سیف میں سے ایک رپوالور نکال کر اپنے قبضے میں کیا پھر اس کے اندر موجود کرنسی نوٹوں پر نظر ڈالی تو نوٹوں کے علاوہ سیف میں بہت سی فائلیں بھی موجود تھیں۔ تیمور نے ایک فائل نکالی اس میں سے کچھ فوٹو گراف نکل کر نیچے گر پڑے۔ وہ کسی لڑکی کی شرم ناک تصویریں تھیں کہ میں نے بھی منہ پھیر لیا۔

تیمور نے پھر کر پوچھا۔ ”یہ سب کیا ہے؟“

”یہ..... یہ..... تصویریں..... ہیں۔“ حاکم خان تھوک نکل کر بولا۔

”اس کا مطلب ہے تم ان تصویروں کی بنیاد پر ان لڑکیوں کو بلیک میل بھی کرتے ہو؟“ تیمور کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ ”پہلے تو میں نے سوچا تھا کہ تمہیں ایک موقع اور دینا چاہیے۔“ تیمور نے سفاک لہجے میں کہا۔

”لیکن اب نہیں، تم تو انتہائی گھٹیا ذلیل اور کمینہ آدمی ہو۔ تم اس زمین پر بوجھ ہو۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنا ماؤز سیدھا کیا اور اس سے پہلے کہ میں اسے روکتا اس نے ماؤز سے فائر کر دیا۔ گولی حاکم خان کی پیشانی کے سین وسط میں لگی۔ تیمور بلا کٹانے باز تھا اس کا مظاہرہ تو میں پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔

حاکم خان کی آنکھوں میں لمحے بھر کو حیرت اور صدمے کے تاثرات ظاہر ہوئے پھر وہ تیمور اکڑے ہوئے

درخت کی طرح دھڑام سے فرش پہ گر پڑا۔

”تم نے اسے جان سے کیوں مار دیا؟“ میں نے پوچھا۔

”ایسے لوگوں کو جینے کا کوئی حق نہیں ہے بھیا.....! جو دوسروں کے لیے عذاب ہوں۔ میں ایسے موقعوں پر خود ہی عدالت لگاتا ہوں خود ہی سزا سناتا ہوں اور خود ہی اس پہ عملدرآمد بھی کر دیتا ہوں۔ عدالتوں کی طرح مہینوں بلکہ برسوں کیس کو کھینچتا نہیں ہوں۔ میں دوسروں کو فوری انصاف اور مجرموں کو فوری سزا دینے کا قائل ہوں۔“ پھر وہ اس کے سیف میں سے نوٹ نکال کر ایک بڑے سے خاکی لفافے میں بھر لے لگا۔

”یہ کیا کر رہے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”اس قتل کو ڈکیتی کا رنگ دینے کے لیے یہ کرنا ضروری ہے۔“ اس نے ادھر ادھر دیکھا اسے کمرے میں ایک بریف کیس نظر آیا۔ تیمور نے اس بریف کیس میں وہ تمام فائلیں بھر لیں جن میں نہ جانے کن محصوم لڑکیوں کی شرم ناک تصویریں تھیں۔

”بس اب یہاں سے نکل چلو.....“ میں نے کہا۔

تیمور نے آخری نظر کمرے پر ڈالی حاکم خان کی لاش کو اٹھا کر اس کی میز کے پیچھے ڈالا اور اپنے لباس کا جائزہ لے کر چلنے کو تیار ہو گیا۔

ہم لوگ بہت اعتماد سے کمرے سے نکلے اور سیڑھیاں اتر کر گلی میں آ گئے۔ کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے شخص نے ہمیں دیکھ کر مسکرا کر سر ہلایا۔

گلی میں آنے کے بعد ہم تیز رفتاری سے اپنی گاڑی تک پہنچے اور تیز رفتاری سے روانہ ہو گئے۔

شائستہ کا ہمیں پھر کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔ مجھے اس پر غصہ بھی آ رہا تھا کہ وہ اتنی کمائڈ و کیوں بنی ہوئی ہے؟ اگر وہ تھوڑا سا صبر کر لیتی تو اس وقت وہ بھی ہمارے ساتھ ہوتی۔

ہم وہاں سے سیدھے گھر پہنچے اور تیمور نے سب سے پہلے وہ فائلیں اپنی الماری کے خفیہ خانے میں رکھ دیں۔

”کیا رہا؟“ نادیر نے پوچھا۔

”کچھ بھی نہیں۔“ میں نے مایوسی سے کہا۔ ”اس لڑکی نے مجھے بہت پریشان کر دیا ہے۔“ پھر میں نے اسے شروع سے لے کر آخر تک پوری بات بتادی۔ اس موقع پر ہاشم بھی موجود تھا۔

”تم نے کیا نام بتایا؟“ ہاشم نے پوچھا۔ ”حاکم خان؟“

”ہاں میں نے حاکم خان ہی کہا تھا۔“ میں نے کہا۔

”حاکم خان کی زمانے میں مشہدی کا خاص آدمی تھا پھر اس نے مشہدی کا ساتھ چھوڑ کر ایک دوسرا گینگ جوائن کر لیا۔ میرا اندازہ ہے کہ اس کے پاس مشہدی کے خلاف کچھ خاص ثبوت ہوں گے۔“

”میں نے ابھی ان کاغذات کو دیکھا نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔ ”جو ہم حاکم خان کے سیف سے لائے ہیں۔“

”یہ سب تو اپنی جگہ پر.....“ نادیر نے کہا۔ ”لیکن تم لوگ حاکم خان کو قتل کر کے آئے ہو اس کے گواہ بھی ہوں گے۔“



”اس کا چشم دید گواہ تو کوئی نہیں ہے۔ ایک وہ پی سی او والا ہے۔ دوسرا حاکم خان کا کاؤنٹر کلرک ہے۔ تیسرا اس کا ایک کابل اور ست سالہ ملازم ہے اور چوتھا گواہ فیروز بھائی ہے۔“ تیمور نے کہا۔ ”ان تمام لوگوں نے ہمیں یا تو حاکم خان تک جاتے دیکھا ہے یا پھر حاکم خان کے ساتھ دیکھا ہے۔“

”یہ تو بہت گڑبڑ ہے۔“ ہاشم نے کہا۔ ”خیر! اب جو ہوگا دیکھا جائے گا۔“

”اب تک حاکم خان کے قتل کا انکشاف ہو چکا ہوگا اور ان لوگوں نے پولیس کو تمہارے حلیے بتا دیئے ہوں گے۔“

”دیکھا جائے گا۔“ میں نے کہا۔ ”فی الحال تو ہمیں ان کاغذات کا جائزہ لینا ہے جو ہمیں حاکم خان کے سیف سے ملے ہیں۔“

”اس تمام بھاگ دوڑ میں شائستگی کوئی خیر خبر نہیں ملی۔ وہ بے چاری نہ جانے کہاں ہے اور کس حال میں ہے؟“ نادیر نے کہا۔

نادیر.....! مجھے خوشی اس بات کی ہے کہ شائستہ اب اپنا دفاع کرنا سیکھ گئی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”مشہدی کی قید سے فرار ہونا پھر حاکم خان جیسے گینڈے کا مقابلہ کرنا اور اس کی قید سے فرار ہونا یہ سب باتیں میرے لیے قابل اطمینان ہیں لیکن وہ ہے تو ایک کمزور لڑکی ہی۔“

”وہ کہیں نہ کہیں سے ہمارا سراغ بھی لگا لے گی۔“ نادیر نے کہا۔ ”ہم نے وردہ کے گھر بھی اپنا سیل نمبر چھوڑا ہے اور میرا کے گھر بھی۔“ پھر وہ بولی۔ ”تم لوگ پہلے جلدی سے فریش ہو کر کھانا کھا لو پھر تو تم ان کاغذات میں الجھ جاؤ گے جو تم حاکم خان کے سیف سے لائے ہو۔“

اور یونیورسٹی کی اسٹوڈنٹ۔“ اس کے نیچے اس سال کے تیسرے مہینے کی تاریخ تھی، گویا یہ تصویر صرف ڈیڑھ مہینے پرانی تھی۔ میں نے وہ تصویر الگ کر لی۔ میں اس تصویر کے ذریعے ڈی آئی جی کراچی سے سودے بازی کر سکتا تھا۔ اس کے علاوہ ایک تصویر سیکریٹری داخلہ کی بیٹی اور دو تصویریں شہر کے معروف صنعت کاروں کی بہنوں کی تھیں۔ تمام کاغذات بہت احتیاط سے دوبارہ اس بریف کیس میں بھرے اور اسے بند کر دیا پھر اس نے وہ خالی لفافہ نکالا جس میں نوٹوں کی گڈیاں تھیں۔ تیمور نے وہ نوٹ میری طرف بڑھا دیئے۔

میں نے تیمور سے کہا۔ ”یہ پیسے تم ہی رکھو یہ تمہاری محنت کا صلہ ہے۔“

”بھیا! آپ مجھ پہ طنز کر رہے ہیں؟“ تیمور برمان کر بولا۔

”ارے یار! میں طنز نہیں کر رہا ہوں۔ ہم ان پیسوں سے اسلحہ خرید سکتے ہیں۔ اپنے دشمنوں کو نقصان پہنچانے کے لیے کہیں اور خرچ کر سکتے ہیں۔ جیسا پیسا ہوگا ایسے ہی کاموں میں جائے گا۔ اس سے پہلے بھی تو باہر خان کے پیسے ہم نے لیے ہیں وہ بھی ہم ایسے ہی کاموں کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔“

”بھیا! میری ایک تجویز ہے۔“ تیمور نے کہا۔ ”ہم ان پیسوں سے ایک بلٹ پروف گاڑی امپورٹ کر سکتے ہیں۔ ہمیں دشمنوں سے نمٹنے کے لیے اس کی ضرورت بھی تو پڑے گی نا!“

”تیمور کا آئیڈیا برا نہیں ہے۔“ ہاشم نے مسکرا کر کہا۔

”فی الحال تو یہ طے ہوا کہ انجی میں ڈی آئی جی کراچی سے بات کروں گا۔“

”انجی نہیں۔“ ہاشم نے کہا۔ ”اتنی جلدی مت کرو، ہم پہلے اس کی بیٹی سے نادیر کے ذریعے رابطہ کریں گے پھر ڈی آئی جی سے بات کریں گے۔“

ہم نے اپنی میٹنگ سے فارغ ہو کر کمرے کا دروازہ کھولا تو نادیر لاؤنج میں بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ اس نے اشارے سے ہم لوگوں کو بھی بلا لیا اور بولی۔ ”دیکھو ٹی وی پر حاکم خان کے قتل کی خبر آ رہی ہے۔“

ہم بھی ٹی وی کے آگے بیٹھ گئے۔

نور کا سٹر کہہ رہا تھا۔ ”شہر کے ایک ہوٹل کے مالک کو اس کے کمرے میں گھس کر قتل کر دیا گیا۔ قاتل بہت اطمینان سے اس کے پاس پہنچے اور تقریباً وہاں ایک گھنٹے تک رہے۔ حاکم خان کے ملازمین کا بیان ہے کہ قاتل اپنی شکل و صورت اور لباس سے بہت معزز اور اعلیٰ گھرانوں کے افراد لگ رہے تھے۔ ان کے جسم پر انتہائی قیمتی کپڑے تھے۔ حاکم خان کے ایک ملازم نے یہ بھی بتایا کہ اس وقت حاکم خان کے ساتھ شہر کا ایک معروف بزنس مین بھی بیٹھا تھا لیکن کاؤنٹر کلرک نے اس بات کی تردید کی ہے۔ اس کا بیان ہے کہ اس وقت حاکم خان صاحب اکیلے ہی تھے۔ کمرے میں دسکی کی ایک بوتل اور صرف ایک ہی گلاس ملا ہے۔ پولیس کا خیال ہے کہ حاکم خان اس وقت اپنے کمرے میں تنہا ہی تھا اور بے روشی سے مشغول کر رہا تھا۔ قاتلوں میں سے کسی نے بھی وہاں پانی تک نہیں پیا کیونکہ وہاں جو گلاس اور جگ پایا گیا ہے اس پر صرف حاکم خان اور اس کے ملازم کے انگلیوں کے نشانات ہیں۔ پولیس کا اندازہ ہے کہ یہ صرف ڈیٹی کی واردات نہیں ہے بلکہ کسی دیرینہ دشمنی کا شاخسانہ ہے۔ پولیس حاکم خان کے ایسے تمام دوستوں اور دشمنوں کا سراغ لگا رہی ہے جن کا کسی بھی دور میں حاکم خان سے تعلق رہ چکا ہے۔ ہوٹل میں اس وقت صرف دو کمروں میں مہمان مقیم تھے وہ بھی اس وقت ہوٹل سے باہر تھے۔

ہم لوگ کھانے سے فارغ ہو کر ڈرائنگ روم کے فرش ہی پر بیٹھ گئے۔ تیمور وہ سوٹ کیس نمائبریف کیس لے آیا جو ہم حاکم خان کے کمرے سے لائے تھے۔ وہاں ہاشم خان بھی موجود تھا اور عدنان اور نادیر بھی۔

میں نے عدنان سے کہا۔ ”عدنان بیٹا! آپ اب جا کر اپنے کمرے میں آرام کریں۔“ پھر میں نے اشارے سے نادیر کو بھی وہاں سے جانے کو کہا۔

میں جانتا تھا کہ اس بریف کیس میں کاغذات کے علاوہ ایسی تصاویر بھی موجود ہیں جو کسی بھی شریف لڑکی کے دیکھنے کے قابل نہیں ہیں۔

نادیر میری بات کا مطلب سمجھ کر وہاں سے چلی گئی۔

ہاشم خان نے احتیاط کے طور پر ڈرائنگ روم کا دروازہ اور کھڑکیاں بند کر دیں، پنکھا بند کر دیا اور اسپلٹ کی اسپڈ مزید بڑھا دی۔

تیمور نے اس بریف کیس کے کاغذات فرش پہ الٹ دیئے۔ اس میں بہت سی فائبر کی فائلیں تھیں۔ ان فائلوں میں اسی قسم کے شرم ناک فوٹو گراف تھے جو میں نے حاکم خان کے کمرے میں بھی دیکھے تھے۔ ان فوٹو گراف کے ساتھ کاغذات پر ان کی تفصیل بھی تھی۔ وہ تصویریں شہر کے معروف لوگوں کی بیٹیوں کی تھیں ان میں کچھ فلم اور ٹی وی کی اسٹارز تھیں۔

ایک تصویر اور اس کے ساتھ لگا ہوا ایک نوٹ دیکھ کر میں چونک اٹھا۔ ”مریم خان ڈی آئی جی کراچی کی بہن

پولیس کا خیال ہے کہ حاکم خان کوئی نیک نام آدمی نہیں تھا وہ اپنے ہوٹل میں جوئے کا ڈھ بھی چلاتا تھا لیکن ہر دفعہ عدم ثبوت کی وجہ سے بچ جاتا تھا۔ اس کے کچھ نزدیک دوستوں نے اپنا نام راز میں رکھنے کی شرط پر بتایا کہ انتظامیہ کے بہت بڑے بڑے افسران حاکم خان کی پشت پر تھے اس لیے پولیس بھی اس پر ہاتھ ڈالتے ہوئے گھبراتی تھی۔“

”یاری تیور!.....!“ میں نے کہا۔ ”اس میں کہیں بھی اس پی سی او کے مالک کا تذکرہ نہیں ہے جس نے حاکم خان کی نشان دہی کی تھی۔“

”وہ جان بوجھ کر سامنے نہیں آیا ہوگا۔“ ہاشم نے کہا۔ ”لوگ عموماً ایسے مقدمات میں ملوث ہونے سے ڈرتے ہیں۔“

اچانک تیور کے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے سیل فون جیب سے نکالا اور اسکرین پر نظر ڈال کر بولا۔

”مشہدی! اب اسے کیا تکلیف ہے؟“

”تم نے اسے اپنا سیل نمبر دیا تھا کیا؟“ میں نے پوچھا۔

”میرا نمبر تو شروع ہی سے اس کے پاس تھا۔“ تیور نے کہا پھر اس نے مٹن دبا کر سیل فون کان سے لگا لیا۔ ”ہیلو!.....!“

میں نے اسے اشارہ کیا کہ اسپیکر فون آن کر دو۔

تیور نے اسپیکر فون آن کر دیا۔ دوسری طرف سے مشہدی کی آواز آئی۔ ”تیور! میں جانتا ہوں کہ حاکم خان کے قتل میں تم لوگ انوالو ہو۔“

اس کی بات سن کر مجھے دھچکا سا لگا اور مجھے اس کے باخبر ہونے پر رشک بھی آیا۔ واقعی اس کی اینٹیلی جنس بہت فعال تھی۔

تیور بھی اس کی بات سن کر چوٹ کاٹا پھر اس نے ہنس کر کہا۔ ”اگر تمہیں یقین ہے کہ ہم لوگ اس قتل میں انوالو ہیں تو پھر تم ہمارے بجائے پولیس کو کال کرو۔“

”تم نے قتل کے بعد اس کے سیف کی تلاشی بھی لی ہوگی؟“ مشہدی نے اس کے طنز کو نظر انداز کر کے کہا۔

”ہاں! اگر ہم لوگ واقعی قاتل ہیں تو پھر اس کے سیف کی تلاشی بھی ضرور لیں گے۔“ تیور نے ہنس کر کہا۔

”دیکھو اس میں ایک ریڈ فائل ہوگی اس کا نمبر زیر و زبر وایت سیون ہے۔“ مشہدی نے کہا۔

”بولتے رہو۔“ تیور نے ہنس کر کہا۔

”مجھے وہ فائل چاہیے۔“ مشہدی نے یوں کہا جیسے کسی دکان دار کو آڈر روے رہا ہو کہ مجھے فلاں براؤن کاٹی وی چاہیے۔

”اگر تمہیں وہ فائل چاہیے تو حاکم خان کے سیف کی تلاشی لو۔“ تیور نے کہا۔

”دیکھو تیور! میں جانتا ہوں کہ حاکم خان کو تم ہی لوگوں نے قتل کیا ہے۔“

”تمہارے جاننے سے کیا ہوتا ہے؟“ تیور نے کہا۔ ”ہمارا حاکم خان سے کیا علاقہ؟ ہم اسے کیوں قتل کریں گے۔ ہم نے تو اس کا نام بھی ابھی نیوز میں دیکھا ہے۔“

”مجھ سے اڑنے کی کوشش مت کرو تیور!“ مشہدی نے درشت لہجے میں کہا۔ ”میرے پاس ثبوت ہیں کہ تم نے اور عمران نے مشہدی کو قتل کیا ہے۔ حاکم خان کی پیشانی کے عین وسط میں سوراخ تھا! اتنا درست نشانہ ضرور تمہارا ہی ہے۔“

”اس سے بھی درست نشانہ عمران کا ہے۔ ارسلان کا تھا۔ اگر تم جاؤ تو عمران تمہاری پیشانی پر یہ مظاہرہ کر سکتا ہے۔ گولی پیشانی کے عین وسط میں لگے گی نہ ایک ملی میٹر! ادھر ہوگی نہ ادھر۔“

”اچھا! تم بہت بکواس کر چکے مجھے ہر قیمت پر وہ فائل چاہیے۔“

”اوبھائی! ہر کم شدہ فائل اور کاغذ کا مطالبہ تم مجھ سے کرتے ہو تمہارا دماغ تو ٹھکانے پر ہے؟ اس سے قبل تم نے ایک فائل کے لیے میرے باپ کو قتل کر دیا، میری ماں اور بہن کو مار دیا، میری زندگی اجیرن کر دی۔ وہ فائل اگر میرے پاس ہوتی تو میں برسوں پہلے وہ تمہیں دے کر اپنی جان چھڑا لیتا۔ آج میری ماں بھی زندہ ہوتی اور بہن بھی۔“

”اچھا ایسا کرو! ٹیلی فون عمران کو دو۔“ اس نے کہا۔ ”وہ کہیں آس پاس ہی موجود ہوگا۔“

”یہ بھی تمہاری غلط فہمی ہے کہ میں عمران کے ساتھ رہ رہا ہوں۔ میں اس سے ملتا ضرور ہوں لیکن اس کے ساتھ رہتا نہیں ہوں۔ میں اس وقت اپنے گھر پر ہوں۔ اب یہ مت پوچھنا کہ میں کہاں رہتا ہوں؟“

”جھوٹ مت بولو تیور!.....!“ مشہدی نے کہا۔ ”ٹیلی فون عمران کو دو۔“ اس نے تحکام نہ لہجے میں کہا۔

میں نے اشارے سے کہا کہ اس سے میری بات کرا دو۔

تیور ہنس کر بولا۔ ”اب تم اتنے پیار سے کہہ رہے ہو تو میں عمران کے گھر جا کر بھی تمہاری بات ان سے کرا سکتا ہوں۔ لو اس سے بات کرو۔“ اس نے سیل فون مجھے دے دیا۔

میں نے سیل فون ہاتھ میں لے کر چند لمحے سوچا۔ ہاشم نے مجھے اشارہ کیا کہ لائن کاٹ دو میں نے فوراً سلسلہ منقطع کر دیا نہ صرف سلسلہ منقطع کر دیا بلکہ سیل فون آف بھی کر دیا۔

پھر میں تیور سے بولا۔ ”الحق ہو تم! اس سے اتنی لمبی بات کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ وہ اس کال کے ذریعے تمہیں ٹریس بھی تو کر سکتا ہے اور یقیناً وہ ایسا ہی کر رہا ہوگا۔ اب تم یہ سم فوراً نکال دو اور اسے دوبارہ کبھی استعمال مت کرنا۔ مجھے دوسرا سیل فون دو جس سے میں مشہدی اور اس قسم کے دوسرے مشتبہ افراد سے بات کرتا ہوں۔“

تیور کے چہرے پر شرمندگی کے تاثرات تھے۔ اس نے سیل فون مجھ سے لے کر اس میں سے سم نکالی اور اس کی بیڑی بھی نکال کر جیب میں ڈال لی پھر اس نے وہ سیل فون نکالا جس کا نمبر کسی بھی سیل ایل آئی پر نہیں آتا تھا۔ اس کی جگہ empty یا پھر ”نمبر“ کے الفاظ ظاہر ہوتے تھے۔ دوسری طرف سے کوئی بھی اس نمبر پر کال نہیں کر سکتا تھا۔

میں نے مشہدی کا نمبر ملایا اور بولا۔ ”ہاں جناب والا! آپ مجھ سے بات کرنا چاہ رہے تھے؟“

”تم نے اچانک لائن کیوں کاٹ دی؟“ مشہدی نے پوچھا۔

”میں نے لائن نہیں کاٹی بلکہ سیل فون کی بیڑی اچانک ہی لو (low) ہو گئی تھی۔ ہاں بولو تم مجھ سے کیا بات



کرنا چاہتے ہو؟“

”میں تیمور کو بھی یہ بتا رہا تھا اور تمہیں بھی اطلاع دے رہا ہوں کہ میرے پاس تمہارے خلاف حاکم خان کے قتل کے ناقابل تردید ثبوت موجود ہیں۔“

”تو پھر کیا کروں؟“ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”کیا میں خود ہی جا کر گرفتاری دے دوں کہ جناب حاکم خان کو قتل تو میں نے کیا ہے لیکن اس کے خلاف ثبوت آپ کو شہدی صاحب دیں گے۔ ارے بھائی! اگر ثبوت موجود ہیں تو پولیس کو اطلاع دو اور ہمیں پھانسی پر چڑھا دو۔۔۔۔۔“

”میں ایسا بھی کر سکتا ہوں۔“ شہدی نے کہا۔ ”لیکن میں ہمیشہ کچھ دو اور کچھ لو کے اصول پر کام کرتا ہوں۔“

”واقعی؟“ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”یہ میرے لیے واقعی اطلاع ہے۔ تم نے میری بہن کو کڈنیپ کیا تو مجھے کیا دیا؟ میرے گھر کو بم سے اڑا لیا تو اس وقت کچھ لو اور کچھ دو کا اصول کہاں تھا؟ تم جیسا آ دی Give 'n take کی بات کرتا ہوا کچھ اچھا نہیں لگتا۔ اب میں در بدر پھر رہا ہوں تو تم کچھ لو اور کچھ دو کے کون سے اصول پر کام کر رہے ہو؟“

دوسری طرف لمبے بھر کو سناٹا چھا گیا پھر شہدی بھاری آواز میں بولا۔ ”عمران! تم فکر مت کرو میں تمہارا تمام نقصان پورا کر دوں گا۔“

”تم پورا کر دو گے؟“ میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ”کیا تم میرے والدین کو دوبارہ لا سکتے ہو؟ میرے بھائی ارسلان کو زندہ کر سکتے ہو؟“

”زندگی اور موت پر تو میرا کوئی اختیار نہیں ہے لیکن تمہارا جتنا بھی مالی نقصان ہوا ہے میں اس کی ایک ایک پائی چکانے کو تیار ہوں۔“

”ہوں؟ تم مجھ پر اتنے مہربان کیوں ہو؟“ میں نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔ ”بات کو گول گول گھمانے کی بجائے ٹوڈا پوائنٹ بات کرو۔ تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟ تم جیسا آ دی بغیر کسی وجہ کے اپنی جیب سے ایک روپیہ نہیں نکالتا، تم میرا کروڑوں کا نقصان پورا کرنا چاہ رہے ہو آخر کیوں؟“

”تم صاف صاف ہی سنا چاہتے ہو تو سنو مجھے اس ریڈ فائل کی ضرورت ہے جو تم نے حاکم خان کے سیف سے حاصل کی ہے۔“

”اصل بات تو یہ کہ میں کسی حاکم خان کو نہیں جانتا دوسری بات یہ کہ اگر بالفرض میں اسے جانتا بھی ہوں تو تمہیں وہ فائل کیوں دوں گا؟“

”اس لیے کہ مجھے اس کی ضرورت ہے۔“ شہدی نے کہا۔

”تم سے زیادہ اس کی ضرورت مجھے بھی تو ہو سکتی ہے۔“ میں نے کہا۔

”تم مجھ سے اس کی قیمت لے لو۔“ اس نے کہا۔

اس کی بات پر میری جان جل گئی۔ میں نے کہا۔ ”اس کی قیمت ہے ڈولی! اس فائل کے بدلے میں مجھے ڈولی دے دو اور فائل لے لو۔“

”اس کا مطلب ہے کہ وہ فائل تمہارے ہی پاس ہے؟“

”ابھی ہم صرف مفروضے پر بات کر رہے ہیں! اگر وہ فائل میرے پاس ہے تو کیا تم ڈولی کے بدلے اسے حاصل کرنے کی کوشش کرو گے؟“

جواب میں شہدی نے مجھے مشتعل ہو کر انتہائی غلیظ گالیاں دیں اور بولا۔ ”تم ایک باپ سے اس کی بیٹی کا سودا کر رہے ہو؟“

”ہاں! اس باپ سے جو پہلے ہی اپنی ماں کی چادر کو تار تار کر چکا ہو جو اس کی آبرو بیچ چکا ہے۔ یہ وطن اس کی مٹی بھی تو ماں کی طرح ہوتی ہے۔ تم تو نہ جانے کب سے ماں کی عزت کا سودا کر رہے ہو۔ اب بیٹی کی عزت کا سودا کر دو گے تو تمہیں کیا فرق پڑے گا؟“

”اس کا مطلب ہے کہ تم وہ فائل مجھے نہیں دو گے؟“ اس نے پھر کر کہا۔

”میرے پاس وہ فائل ہے ہی نہیں اور اگر ہوتی بھی تو میں اسے اس قیمت پر بیچتا جو میں نے تمہیں بتائی ہے۔“

”تم انتہائی گھٹیا آدمی ہو! کینے ہو ذلیل ہو۔۔۔۔۔“ اس نے مشتعل ہو کر مجھے مزید گالیاں دیں۔

”مجھ سے بڑے حرام زادے تو تم ہو، تم نے کیا سوچ کر میری بہن کو اغوا کیا تھا؟ حرام زادے! تو اب عزت کی باتیں کر رہا ہے۔ تیرے پاس عزت ہے تو جا پولیس کے پاس اور مجھے پھانسی چڑھا دو!۔۔۔۔۔“ میں نے غصے میں سیل فون کی لائن کاٹ دی۔

میں نے سیل فون کا پیکیج آن کر رکھا تھا اس لیے وہاں موجود ہر شخص ہی ہماری گفتگو سن رہا تھا۔

”عمران!۔۔۔۔۔! تم آرام کرو، تم صبح سے گھن چکر بنے ہوئے ہو؟“ نادیر نے کہا۔

”مجھے ابھی اس حرام زادے کی غنی بلوچ سے بات کرنا ہے۔ اس نے اپنے بھائی کے لیے کیا کیا؟“

میں نے ایک مرتبہ پھر سیل فون سنبھالا اور غنی بلوچ کا نمبر ڈائل کیا لیکن اس کا سیل فون بند تھا۔ میں نے دوسری مرتبہ ڈرائی کیا پھر جھنجھلا کر سیل فون صوفے پر اچھال دیا اور بولا۔ ”اس کا سیل فون آف ہے۔ اب اس سے صبح ہی بات ہوگی۔“

”میں تمہارے لیے کافی لاؤں؟“ نادیر نے کہا۔

”ارے بھئی! ہم بھی تو بڑے ہیں راہوں میں! تیمور لنگتا کر بولا۔

”تمہیں اگر اتنی ہی کافی کی طلب ہے تو خود بنا کر پیو۔ میں صرف عمران اور ہاشم بھائی کے لیے کافی بناؤں گی۔“ نادیر نے کہا۔

”خاتون!۔۔۔۔۔! تیمور نے کہا۔ ”آپ مجھ سے کیوں برہم ہیں! اب تک تو میں نے آپ کو کچھ بھی نہیں کہا حالانکہ میرے پاس کہنے کو بہت کچھ ہے۔“

”بکواس کرو گے تو میں چائے مار دوں گی!۔۔۔۔۔“ نادیر نے کہا اور پیر پختی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔

تیمور نے بے بسی سے مجھے دیکھا اور بولا۔ ”بھیا!۔۔۔۔۔! آپ ہی بتائیے اب میرا کیا تصور تھا؟ میں تو جب سے آیا ہوں آپ کے ساتھ مصروف ہوں۔ میں نے ان عیوض سے تو کوئی بات کی ہی نہیں ہے؟“

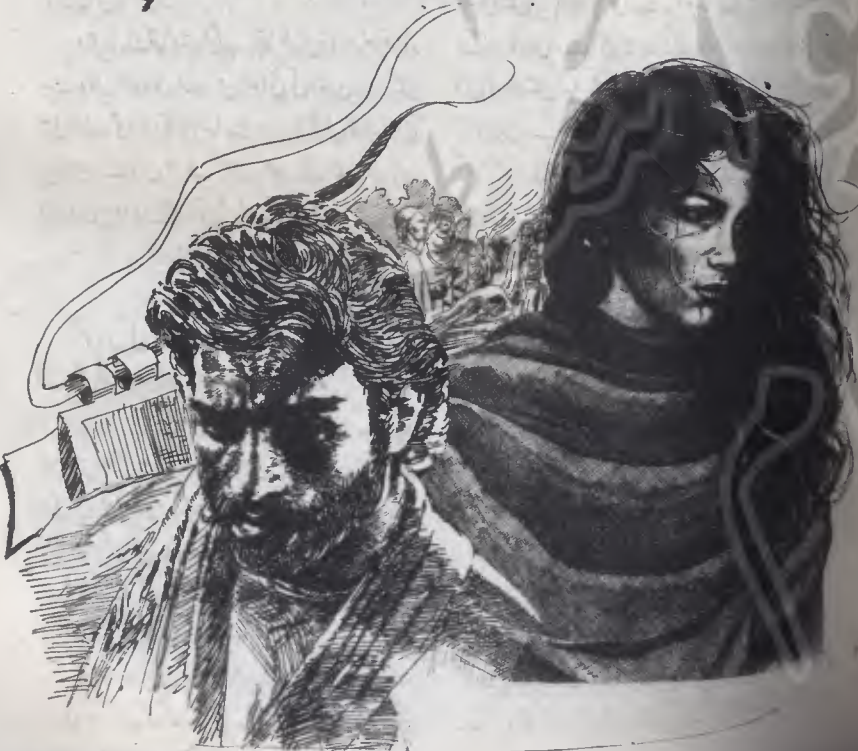
”تم نے ابھی نہیں کی ہے؟“ ہاشم نے کہا۔ ”لیکن تم اکثر اسے چراتے ہو وہ کسی وقت تو اپنا بدلہ نکالے گی! ہاشم کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔

## آزادی کی قیمت

جویریہ یاسین

مار پیٹ تو خیر ہوئی ہی تھی اور مجھے اس کا غم بھی نہیں رونے کی بات تو یہ تھی کہ چوبیس سال پہلے ایک ہندو نے میری عزت لوٹی تھی اور آج چوبیس سال بعد ایک مسلم بھائی کے ہاتھوں میں بھر.....

پہلی انوکھی آپ بیتی راولپنڈی سے



تھوڑی دیر بعد نادیرہ کافی بنا کر لے آئی۔ اس نے سب سے پہلے کافی کا گک ہاشم کو دیا پھر مجھے دیا۔ تیور نے ہانک لگائی۔ ”اندھا بانے ریوڑیاں! اپنوں اپنوں کو دے۔ عمران بھائی! آج تک اس محاورے کا مطلب میری سمجھ میں نہیں آیا۔ اندھا ریوڑیاں بانے گا ہی کیوں؟ اور اگر بانے گا بھی تو اسے کیسے معلوم ہوگا کہ کون اپنا ہے اور کون پر اپا؟“

”اندھا کبھی کبھی کافی کا کپ بکواس کرنے والے کے سر پہ بھی الٹ دیتا ہے۔“ نادیرہ نے کہا اور تیور کے سامنے کافی کا گک پیش دیا۔

”ارے واہ! اگر اتنا خوب صورت اندھا ہوتا ہے تو میں چاہوں گا کہ ساری دنیا اندھی ہو جائے.....“ تیور نے کہا۔

اس کی بات پر ہاشم کو اور مجھے بے ساختہ ہنسی آگئی۔ نادیرہ بھی ہنسنے لگی اور بولی۔ ”تم انتہائی غصیٹ شخص ہو.....“

”بھیا!.....! آج آپ کے سامنے اس بات کا فیصلہ ہو ہی جائے۔ میں نے ان خاتون کے ساتھ کیا خباثت کی ہے؟ ہاشم بھائی بھی گواہ ہیں ان سے پوچھیے کہ انہیں مجھ سے شکایت کیا ہے؟“

”تمہاری بکواس سے شکایت ہے.....“

”دیکھیے خاتون!.....! آپ پھر مجھے چھیڑ رہی ہیں میں نے ابھی تک بکواس تو کی ہی نہیں ہے جو بقول آپ کے بکواس ہے لیکن میرے لیے تو وہ ایک اٹل حقیقت ہے۔ بقول شاعر

”ہند آنکھوں میں سٹ آتے ہیں منظر کیا کیا دیکھتا ہوں تو سر راہ گزر کچھ بھی نہیں“

نادیرہ کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ میں نے ڈھکے چھپے الفاظ میں اسے وہ منظر یاد دلایا تھا جب وہ عمران بھائی کی بانہوں میں تھی۔

”تیور!.....! تم کچھ زیادہ ہی بک بک نہیں کرنے لگے ہو؟ چلو! کہہ ڈالو جو کچھ کہنا ہے میں بھی تو دیکھوں تم میں کتنی جرات ہے؟“

”بھیا!.....! میں تو مذاق کر رہا تھا۔“ تیور جلدی سے بولا۔

”بس آج کے بعد سیز فائر.....“ میں نے کہا۔ ”نہ تم نادیرہ سے کوئی اٹلی سیدھی بات کرو گے نہ نادیرہ تمہیں برا بھلا کہے گی۔“

”میں ان سے اٹلی کیا سیدھی بات بھی نہیں کروں گا۔“ تیور اچانک سنجیدہ ہو گیا۔ ”ان کا ہر وقت کا یہ سلوک واقعی میرے لیے بہت تکلیف دہ ہے۔ میں تو ان سے بہن سمجھ کر مذاق میں دو چار باتیں کر لیتا تھا۔ اب میں ان سے کوئی بات بھی نہیں کروں گا۔“ پھر وہ نادیرہ کی طرف مڑ کر بولا۔ ”میڈم! اب آپ کو میری ذات سے کبھی کوئی شکایت نہیں ہوگی یہ تیور کا آپ سے وعدہ ہے۔“

یہ پرتجسس، سنسنی خیز اور لہو رنگ آپ بیتی ابھی جاری ہے

بقیہ واقعات آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں۔

.....☆☆☆.....



میری عمر پندرہ سولہ سال ہوگی جب میں نے ہندوستان کے شہروں کے گلی کوچوں میں یہ نعرے سنے۔

”لے کے رہیں گے پاکستان“

یہ مسلمانوں کا نعرہ تھا۔

”پاکستان کو بنادیں گے قبرستان“ یہ سکھوں اور ہندوؤں کا نعرہ تھا۔

میں جب ”پاکستان زندہ باد“ اور ”لے کے رہیں گے پاکستان“ کے نعرے سنتی تو میرے من میں بھی جذبہ آزادی بیدار ہو جاتا اور میں گھر کی چار دیواری کے اندر ”پاکستان زندہ باد“ کے نعرے لگانے لگتی۔ میں دن رات سوتے جاگتے ”پاکستان زندہ باد“ کے الفاظ سنتی اور ساتھ ہی آزادی کے خواب بھی دیکھتی۔

وہی زمانہ تھا وہی لوگ تھے گلیاں بازار مرغزار سب وہی تھے وہی اللہ دین حلوائی کی دکان برابر میں تائی اللہ رکھی کا مکان سامنے بڑا سا کھیل کا میدان میدان کے اُس طرف مسجد مسجد کے اندر اور باہر ہزاروں پروانوں کا اجتماع۔ نعرے پھرے۔

”بٹ کے رہے گا ہندوستان

بن کے رہے گا پاکستان“

نعروں کی گونج سے دھرتی کانپ رہی تھی شاید فلک بھی ہرقرار ہا ہو۔

جانے میرے دل کو کیا ہوا میں بھی جھٹ سے ہجوم میں داخل ہوئی۔ اس ہجوم کے درمیان میں ایک بڑی سی تصویر تھی۔ میں نے ایک شخص سے پوچھا۔

”یہ تصویر کس کی ہے بھائی؟“

”قائد اعظم محمد علی جناح کی۔“ اس نے مکا

تان کر جوش سے کہا۔

میں ڈر کر پیچھے بھاگی لیکن مکا تو وہ ہندو بیٹے اور ولایتی حاکموں کو دکھا رہا تھا۔ میں نے بھی دونوں مکے

تان لیے اور اڑیاں اٹھا کر زور سے نعرہ لگایا۔

”پاکستان زندہ باد..... زندہ و پائندہ باد“ پھر مسلمان سر سے کفن باندھ کر میدان میں نکل آئے۔ ایمان والوں کی دھاڑ سے تقدیر بھی تو خوف کھاتی ہے۔ بنیا اور انگریز کیوں نہ جھٹکے وہ جھٹک گئے اور غلامی کی سیاہ شب کٹ گئی۔ 14 اگست 1947ء کو سورج نکلا تو آزادی کا پیام لے کر۔

اُس دن میں بہت خوش تھی میرا دل سرشار تھا میری روح خوش تھی اور سب سے بڑھ کر میرا ایمان سرشار تھا۔ اپنے گھر کی کسے خوشی نہیں ہوتی سب اہل وطن خدائے بزرگ و برتر کے حضور سر بہ سجود تھے۔

دبغل میں چھری..... منہ میں رام رام پینے کی تو کھٹی میں یہ بات بڑی ہے۔ آہنا کے پجاری جنگل کے درندوں سے بھی بڑھ گئے۔ آگ اور خون کی اس ہولی میں کیا کچھ نہیں لٹا میرے باپ کو ہزاروں نمازیوں کے ساتھ حالت نماز میں ذبح کر دیا گیا میں نے آنسو نہیں بہائے تھے۔ یہی تو رسم شبیری تھی۔

اُن ہی دنوں میں ایک بھائی دنیا میں آیا تھا۔ بلوائیوں نے میری ماں کی چھاتیاں کاٹ ڈالیں۔ دودھ اور خون ملا تو شفق کی سرخی شرمائی۔ پندرہ دن کے معصوم نے نیزے پر چڑھ کر زبان خاموش سے صبح آزادی کا شکر یہ ادا کیا۔ پھولوں کی چھڑی سے بھی نرم و نازک ہاتھ اوپر اٹھا نہ تھوڑا سا نیچے ہوا اور گل رنگ سویرے نے آگے بڑھ کر سلامی لے لی۔

میرا جذبہ عشق شاید کچھ زیادہ تھا جی تو سزا بھی بڑی ملی۔ ان کے نہ جانے کیا کیا نام تھے لیکن تھے تو سب سکھ اور ہندو۔ انہوں نے مجھے ایک بڑے سے کمرے میں لے جا کر زنجیروں سے باندھ دیا۔ میں نے نظر اٹھا کر دائیں کو دیکھا ایک لمبی قطار تھی جوان

شہزادوں کی۔ بائیں طرف بھی یہی حال تھا۔ زیادہ نہیں تو کم از کم سو سے اوپر میری بہنیں میری قوم کی بیٹیاں بے حال زخموں سے نڈھال چروں پر خوف لیکن آنکھوں میں آس کی چمک..... میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ پتا نہیں کیوں؟

سامنے میرے اللہ کا گھر میرے نبی ﷺ کا شہر تھا۔ میرے دل کا دیا جل اٹھا۔ میں نے آنکھیں کھول دیں اور لگی انتظار کرنے آنے والے وقت کا۔

وہ آئے سب کو دیکھا بھالا اُن کے آگے جوتھا شاید اُن کا سردار تھا اس نے کرپان دو بار اوپر نیچے لہرائی پھر بھوکے بھڑیے کی طرح چلایا۔

”بولو..... پاکستان.....“ وہ آگے کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ میں نے پوری قوت سے ”زندہ باد“ کا نعرہ لگا دیا۔ یہ سن کر پہلے تو وہ بوکھلا گیا پھر بدست بائیں کی طرح میری طرف لپکا۔ اس کے آگے کیا ہوا؟

میں نے اپنا سب کچھ ہار دیا۔ جی چاہتا تھا کہ پھوٹ پھوٹ کر اپنی بربادی پر روؤں لیکن آنکھوں کے سامنے سبز ہلالی پرچم لہرانے لگا۔ میں نے شرم و حیا کی چادر سے ایسا ہی ایک پرچم تخلیق کیا۔ آرزوؤں کے خون سے اُس کے سچ چاند تارا بنایا اور سونی دھرتی کی خدمت میں پیش کر دیا۔

”سونی دھرتی اللہ رکھے قدم قدم آباد تھے“ اس جہنم سے مسجدوں کے شہر اور سنہرے ریشے کے دیس کے دل ڈھاکہ میں جس طرح پہنچی بس پہنچ ہی گئی۔ یہاں ایک بوڑھے نے مجھے اپنی بیٹی بنالیا۔ وقت گزرتے دیر نہیں لگتی پھر میں ماں بن گئی ایک ننھے ننھے گول منول خوبصورت بچے کی۔ بچے کے باپ کا نام مجھے معلوم نہیں لیکن مجھ سے جس نے بھی بچے اور اس کے باپ کا نام پوچھا میں نے

بتایا۔ ”پاکستان!“

اور میں کہہ بھی کیا سکتی تھی؟

شروع شروع میں مجھے بہت نیند آیا کرتی تھی چیمین کی نیند شاید اس لیے کہ چمن پھل پھول رہا تھا ہر سو بہار تھی خزاں کا نام و نشان تک نہ تھا اور آنے والا دور بہت پر امید تھا لیکن یہ مسرت یہ آسودگی غم خزاں سے یہ بے نیازی بہت جلد دم توڑنے لگی۔ راتوں کو ڈراؤنے خواب ستانے لگے اور دن کو ہر لمحہ بدلتے ہوئے حالات جی جلانے لگے۔

میں نے ایک رات خواب میں دیکھا کہ میں نے اپنے بچے کا گوشت کھالیا ہے منک مرچ لگا کر صبح ہوئی تو پتا چلا کہ شہر میں فسادات کی آگ بھڑک اٹھی ہے۔ دوپٹا سنبھالتی میں باہر کو بھاگی وہاں بہت سے لوگوں نے ایک آدمی کو پکڑ رکھا تھا۔ کوئی اسے لٹھی سے پیٹ رہا تھا اور کوئی لاتوں اور گھونسوں سے۔ مجھے اُس بے چارے پر بہت رحم آیا۔ آخر وہ میرے دیس کا باشندہ تھا۔ میرے نبی ﷺ کا امتی تھا لیکن مارنے والے بھی اسی دیس کے تھے۔ میرے نبی ﷺ کے امتی تھے۔ وہ بھی میرے بھائی تھے۔ ”بھائی بھائی کے خون کا پیسا ہے لیکن کیوں؟“

مجھے بتایا گیا۔ ”یہ پنجابی ہے۔“ وہ بہت کچھ کہتے رہے لیکن میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ ایک ہی گھر کے مختلف افراد ایک دو بے کے دشمن کیسے ہو سکتے ہیں؟ گھر تو نام ہے محبت خلوص اور ہمدردی کا ایک دوسرے کے دکھوں میں کام آنے کا ایک دوسرے کی خوشی پر مسکرانے کا یہی تو اچھے گھروں کے اصول ہوتے ہیں۔ خدا جانے اپنی قوم کو عقل کب آئے گی؟ کہیں پانی سر سے گزر رہی نہ جائے۔ ایک وہم سادل کو چھیدا تھا وہ آنکھوں تک جا پہنچا اور میرے آنسو نکل آئے۔



ایک شخص نے چوری کی سزا کا فیصلہ سنتے ہی واو یلا کیا۔ ”رحم کیجیے جناب عالی! یہ کہاں کا انصاف ہے کہ چوری تو میرا دایاں ہاتھ کرے اور مجھے پورے کا پورا قید میں ڈال دیا جائے۔“ جج نے کہا۔ ”بہتر ہے تمہارا دایاں ہاتھ جیل میں رہے گا۔ تم چاہو تو اسے وہاں چھوڑ سکتے ہو؟“

یہ سنتے ہی مجرم نے اپنا لکڑی کا ہاتھ الگ کر کے جج کی میز پر رکھا اور عدالت سے نکل گیا۔ سلیم شہزاد۔ چکوال

بعد میں جو کچھ ہوا کاش میں وہ سب کچھ دیکھنے سے پہلے ہی مر جاتی..... میرا وطن میرا دیس اور چین میری جنت میری آنکھوں کا نور میرے دل کا سرور میرا مشرقی پاکستان میرا بنگال میرا ڈھاکہ میرا سلہٹ غرض پاکستان کے ایک ایک میں آگ بھڑک اٹھی اور بھائی بھائی کا گلہ کاٹنے لگا۔ اُس دن تو غضب ہو گیا جب میرے مسلمان پاکستانی بھائیوں نے اپنے سبز ہلالی پرچم کو اپنے باؤں تلے روند ڈالا..... قائد اعظم کی تصویر کو آگ لگائی پاکستان زندہ باد کے بجائے جیسے بنگلہ دیش کا نعرہ لگایا۔

مجھے بڑا ہی تاؤ آیا، جواب میں چھت پر چڑھ کر میں نے پاکستان زندہ باد کا نعرہ لگایا تو وہ دوڑے دوڑے آئے۔ مار پیٹ تو خیر، ہونی ہی تھی اور مجھے اس کا غم بھی نہیں، رونے کی بات تو یہ تھی کہ چوبیس سال پہلے ایک ہندو نے میری عزت لوٹی تھی..... اور آج چوبیس سال بعد ایک مسلم بھائی کے ہاتھوں میں پھرنے لگی۔ کچھ کم قیامت ہے یہ؟ اس صورت حال سے میرا دل ٹوٹ گیا، حواس

جواب دینے لگے اور زندگی موت سے بدتر ہو گئی۔ ایسے میں نے صدقہ دل سے مر جانے کی دعا کی لیکن موت نہ آئی۔ سوچتی ہوں اُس وقت مر جاتی تو بعد کو یہ طوفان کون دیکھتا؟ میرا مشرقی پاکستان بنگلہ دیش کیا بنا کہ بگلیوں اور بازاروں میں جیسے ہندو جیسے اندرا جیسے مہاتما گاندھی کے نعرے گونجنے لگے۔ نعرے لگانے والے مسلمان تھے۔ اپنے سینوں پر اندرا اور گاندھی کی تصاویر سجانے والے لکھنؤ طیبہ پر ایمان رکھتے تھے اور ان کے نام عمر ناصر، قاسم طارق اور خالد ہی تھے۔

اس شہر آرزو میں اپنوں کے طفیل مجھ اللہ کی بندی نے جیل بھی دیکھی۔ جیل کے نام پر ہر شریف آدمی کو خوف آتا ہے لیکن یہاں تو بات ہی الٹی تھی۔ کوئی چور چاکا اور بد معاش پابند سلاسل نہ تھا۔ اس کے برعکس وہ لاکھوں انسان جنہیں پاکستان کے نام سے محبت تھی یہاں مشق ستم بنے ہوئے تھے۔ تنگ و تاریک بستی، ظلم و ستم کے سائے..... کئی بار جی چاہا کہ کہیں سے سبز ہلالی پرچم نظر آئے لیکن جب چین ہی لٹ گیا تو بہار کیسے آئے؟ سودل کی تینا دل ہی میں رہی۔

اسیری کے دن بیت رہے تھے۔ ایک دن آدمی جیل آیا اس کا آقا قیامت سے کم نہ تھا ہر طرف شور مچ گیا۔ ”بھاگو..... جان بچاؤ.....“ بھاگ تو میں بھی پڑی لیکن بھاگتے بھاگتے یہ بھی پوچھ ڈالا۔ ”کون آیا ہے؟“

”مکتی بائی کا نمبر دو لیڈر..... جو آدمیوں کو کچا کھا جاتا ہے، ماں بہن کسی کو نہیں سمجھتا۔ سنا ہے اب تک ہزاروں آدمی مار چکا ہے۔ اپنے گھر میں انسانی کھوپڑیوں کا ڈھیر لگا رکھا ہے اس نے.....“ دھیان پتا نہیں کہ دھڑکا پاؤں نے ٹھوکر کھائی اور میں زمین پر ایسی گری کہ پھر اٹھ نہ سکی۔ سرے

خون بہہ نکلا، قیص سے تھوڑا سا کپڑا بھاڑ کر پٹی باندھنا چاہی تو کسی کے قبضہ فضا میں بٹھ گئے۔ زندگی میں یوں ہنسنے کسی کو نہ دیکھا تھا، یوں لگتا تھا جیسے آسمان ہنس رہا ہو، زمین ہنس رہی ہو، فضا ہنس رہی ہو لیکن کس کے لیے اور کیوں ہنس رہے ہیں یہ سب؟ ابھی میں ان ہی خیالات میں اٹھی ہوئی تھی کہ ایک زوردار ٹھوکر میرے پیٹ میں لگی درد کے مارے میری تو جان ہی نکل گئی، سر چکر گیا اور میں اندھیروں میں ڈوبتی چلی گئی۔ بعد میں کیا ہوا مجھے کچھ یاد نہیں۔

ہوش آیا تو اپنے آپ کو ایک شاندار کمرے میں پایا اور وہی کچھ نظر کے سامنے تھا جو میں دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ کانس پر بچی ہوئی گاندھی کی تصویر بڑے سے گلخانے میں پھولوں کے درمیان لہراتا ہوا چھوٹا سا ترنگا..... گلخانے کا اوپر کھڑا ہوا ”گاندھی باپو زندہ باد“ قائد اعظم کی مورتی، ان کے پیٹ میں دھنسا ہوا خنجر، میرا خون پھر کھول اٹھا۔ مجھ میں اٹھنے اور چلنے کی ہمت تو نہیں تھی لیکن گرتی پڑتی اپنے قائد کی مورتی کے پاس پہنچ گئی۔ نہ جانے میرے دل کو کیا ہوا، میں بے اختیار مورتی سے لپٹ گئی۔ بے جان مورتی تھی لیکن میرے دل کو ایک سکون سائل گیا۔ ”میرے قائد! میرے باپ! مجھے بتا میں کہاں جاؤں؟“ میں نے چیخ چیخ کر پوچھا۔

”پاکستان کی محبت کو اپنی رُوح میں بسالے لڑکی! جب تک زندگی ہے، پاکستان زندہ باد“ کا نعرہ لگائے جا۔

میرے احساس نے قائد کی جانب سے جواب دیا۔ اب میں نے ایک پل بھی ضائع نہ کیا اور پوری قوت سے ”پاکستان زندہ باد“ کا نعرہ لگادیا۔ خدا کی قسم بڑا مزہ آیا اور پھر میں نے نعرے پہ نعرہ لگانا شروع کر دیا۔ ایک بھونچال سا آگیا، درود پوار

کا پھٹنے لگے، ترنگا نیچے چلتی ہوئی آگ میں جا گرا، مہاتما کی مورتی فرش پر ایسے گری کہ دو حصوں میں بٹ گئی لیکن اتنی دیر میں وہ بھی پہنچ گیا۔

وہی جو مجھے جیل سے لایا تھا، آتے ہی اس نے انگریزی سے انگاروں کی مانند چمکتی ایک لمبی سی سلاخ نکالی۔ اتنی گرم کہ مجھے دو قدم دور کھڑے بھی پسینہ آ گیا۔ میں ڈر کر پیچھے ہٹی لیکن وہ مجھ سے زیادہ پھرتیلا نکلا۔ اس نے سلاخ ہوا میں لہرائی اور مجھے اپنا دایاں گال جلتا ہوا محسوس ہوا لیکن اب گال کی فکر کس تھی! انگ انگ جل رہا تھا۔ میں فرش پر گر پڑی۔ اس نے سلاخ پھینک دی اور لگا میرے کپڑے نوچنے..... میں مادر زبرد ہنہ ہو گئی۔ اسی کشمکش میں وہ کپڑا جس سے اُس نے اپنا منہ کافی حد تک چھپایا ہوا تھا، ایک طرف کو سرک گیا۔ اب جو صورت میرے سامنے تھی، میری جانی پہچانی تھی، میرا پڑوسی عبدل جسے میں عبدل بھیہا کہہ کر پکارتی تھی، میری عزت کے درپے تھا۔ میں نے اسے ڈانٹ پلائی۔ ”اوے عبدل..... اپنی بہن کو نہیں پہچانتا؟“ ”پہچان کے ہی یہاں لایا ہوں..... آج عیش کروں گا کیا سمجھی؟“

آگے میں کیا جواب دیتی، سفید خون، مَر دہ دل، میں اُن دنوں پھر ماں بننے والی تھی۔ میں نے عبدل کو بتایا کہ شاید اسے میری حالت پر رحم آجائے لیکن اسے رحم نہ آیا۔ میں تڑپتی رہی، سسکتی رہی، نیم نکل چھپی کی طرح۔ وہ ہوس کی پیاس بجھا تا رہا، اپنی منہ بولی بہن کے ساتھ اس نے منہ کالا کیا، ایک ماں کے ساتھ ایک مجبور و بے کس عورت کے ساتھ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا، بے شمار بت ہونٹوں پر مکروہ تسم لیے مسکرا رہے تھے۔ عبدل بھی مجھے بڑا سبقت نظر آیا۔ میں نے اس کے منہ پر ٹھوک دیا۔ اس نے جواب میں اپنے مکروہ لمبے لمبے دانتوں



بعد مرنے کے میرے گھر سے یہ سامان نکلا  
کچھ فسانے، کہیں غزلوں کا خزانہ نکلا  
بند آنکھوں میں بھرا تھا جو خوابوں کا مرے  
جس میں وہ تھا وہی اک خواب سہانا نکلا  
بڑی خوش فہمی تھی پھولوں سے بھرا ہے دامن  
کھول کے دیکھا تو خالی میرا دامن نکلا  
آساں سارا اجالے سے بھرا تھا لیکن  
مری قسمت کا نہیں تھا، کوئی تارا نکلا  
زندگی ساتھ گزاریں گے کہا تھا، تم نے!  
جو بہانا تھا مسافت کا پُرانا نکلا  
زندگی گزرے گی تم بن بھلا تھا کیسے  
روشنا، منانا ایک خواب پُرانا نکلا

رضیہ ناز

سے میرا چہرہ نوچ لیا۔

اب مجھ میں مزید سکت نہیں تھی، میں بے ہوش  
ہو گئی اور جب ہوش آیا تو اپنے آپ کو خون میں لت  
پت اسی جیل میں پایا جہاں سے وہ ظالم مجھے لے کر  
گیا تھا۔

جیل میں بانی کئی دن سے بند تھا۔ نیم جاں تو  
میں پہلے ہی تھی، اوپر سے بچے کی پیدائش کا وقت  
قریب آ گیا۔ بانی پانی کرتے میرا حلق سوکھ گیا،  
جان لبوں پر آ گئی، آنکھیں پتھر اگیں اور زبان لنگ  
ہو گئی، کان البتہ کچھ سن سکتے تھے۔ پاس میں دھیمہ  
دھیمہ ریڈیو بج رہا تھا، اناؤنسر ہم وطنوں کو آزادی کی  
ساگرہ کی مبارک باد دے رہی تھی۔ آج پھر اگست  
کی 14 تاریخ تھی۔

”اف میرے خدا! ستم یہ ستم، سارا بدن کا نپ  
اٹھا، کچھ یادیں، اس کے بعد کیا ہوا؟ اوسان بحال

ہوئے تو رات کا دیوتا فلک کی گود میں مسکرا رہا تھا لیکن  
میرے ارد گرد بہت سے لوگ رو رہے تھے، مرد بھی،  
بچے بھی اور بوڑھے بھی، اس رونے کی وجہ پہلے تو  
میری سمجھ میں نہ آئی پھر جو دائیں کروٹ لی تو سفید  
کپڑے میں لپٹی ہوئی کوئی چیز نظر آئی، غور سے دیکھا  
تو گوشت پوست کی ایک معصوم صورت دکھائی  
دی۔ مجھے اپنا دل پہلو سے نکلتا ہوا محسوس ہوا، میں  
دیوانہ وار اس سے لپٹ گئی، کچھ میرے جیسا چہرہ  
تھا، ہونٹ اور ناک تو ہو، میری طرح تھے آنکھیں  
بھی اپنی ہی نظر آئیں۔ شدت غم سے میں تو پاگل  
ہو گئی۔ اس چاند سے چہرے کے اتنے بوسے لیے  
کہ اس کی نرم نرم کھال ادھڑنے لگی پھر انہوں نے  
میرا دل مجھ سے چھین لیا البتہ میرے کہنے پر اسے  
جیل کی سب سے اونچی جگہ لے گئے تاکہ کہیں بزر  
ہلائی پرچم نظر آئے تو اس کی ایک جھلک معصوم کو دکھا  
دیں۔ وائے افسوس..... بزر ہلائی پرچم کہیں نظر نہیں  
آیا۔

عمر بڑھتی گئی، زندگی کھٹتی گئی، ہم میں سے اکثر کو  
اب اس زندگی کی ضرورت نہیں تھی البتہ موت کا  
انتظار تھا۔ صبح وشام اس کی راہ دیکھتے تھے لیکن انسان  
کے چاہنے سے موت کب آتی ہے، وہ تو من مانی  
کرتی ہے اور پھر ایک دن ہمیں پتا چلا  
کہ..... ”پروں، ہم میں سے ڈیڑھ سو کو پاکستان  
جاتا ہے۔“

میرا نام پہلے گروپ میں تھا۔ میرا سر خود بہ خود  
بارگاہِ رب العزت میں جھک گیا۔ جھکی ہوئی کمر  
سیدی ہو گئی آنکھوں میں آرزوؤں کے دیپ جلنے  
لگے دل کے چمن میں بہا رہی نظر آئی تو سیروں  
خون بڑھ گیا، ایک نئے جذبے کے ساتھ ڈھیروں  
ارمانوں کے ساتھ بحری جہاز میں سوار ہوئی۔

”پاکستان پاک لوگوں کا گھر، پاک دل، پاک

روح، امن کی چھاؤں، انصاف کا سمندر، باہمی محبت کا  
شجر، پُر بہار انسانیت کا مسکن۔“ میرا دل یہی کہتا اور  
سوچتا تھا۔

جب میں عروس البلاد کراچی میں اتری تو اور ہی  
ساں نظر آیا۔ میں نے ہر چہرے کو پڑھنے کی کوشش  
کی، ہر آنکھ میں جھانک کر دیکھا، احساس کی لہر دل  
تک اتر گئی لیکن وہ محبت، پیار، غلو، صوابیت جس کی  
میں متنبی تھی، نظر نہ آئی۔ ہر روپ کے پیچھے بہروپ،  
ہر چہرہ نقلی، ہر ادا و فریب، بظاہر پھول، اندر سے کانٹے،  
صورت رہبر، اندر سے رزق..... خوفِ خدا سے بے  
نیاز، دولت کے بندے، جو سنا تھا، جو سوچا تھا، ایک  
سراپ تھا۔ اس کی شمع بجھ گئی، تنہاؤں کا خون کیا ہوا،  
دل بھلی خون ہو گیا۔

یہاں ایک آدمی نے مجھے بہن کہا، ایک بزرگ  
تھے جنہوں نے مجھے بیٹی بنالیا، ایک عورت میری ماں  
بن گئی، رہنے کو ایک گھر مل گیا لیکن رات کو اس مہربانی  
کی قیمت یوں وصول کی کہ ایک آدمی کے ہاتھ مجھے بیچ  
دیا گیا۔ وہ آدمی خریدار کم سوداگر زیادہ تھا۔ اس نے  
مجھے منافع کم کر میرا سودا کر دیا۔ اب مجھے یاد نہیں کہ  
کتنے آدمیوں نے مجھے بیچا، کتنے آدمی میرے خریدار  
بنے، ایک دو بار نہیں بلکہ کچھ اتنی بار مجھے لوٹا گیا کہ لٹنے  
کا احساس ہی نہ رہا۔ آخر کار ایک بہت بڑے آدمی  
نے مجھے خرید لیا اور ایک بڑی حویلی میں لے گیا۔ اس  
حویلی میں ہر کوئی ننگا نظر آیا، ہر دامن چاک، ہر صورت  
مکروہ، ٹھکر دوں کی جھنکار، ہوس کے خریدار..... اب  
میری مثال اس لاش کی سی تھی جسے بے دردی سے  
کتوں کوں اور چیلوں نے نوچ ڈالا ہو۔

اس دن اگست کی 14 تاریخ تھی۔ پوری قوم  
یومِ آزادی منا رہی تھی اور میں ماہی بے آب کی  
طرح زپ رہی تھی، ہاتھ پاؤں ڈھیل پڑنے لگے،  
منہ سے خون جاری ہو گیا، چہرے پر موت کے سائے

منڈلانے لگے تو وہ مجھے ایک ڈاکٹر کے پاس لے  
گیا۔ ڈاکٹر کے کلینک میں ہی میں نے ایک بچی کو جنم  
دیا۔ کاش..... میں مرجاتی..... لیکن میری رات کی  
سحر شاید ابھی دور تھی کہ میں زندہ رہی۔

میرا مالک اب میری اچھی طرح دیکھ بھال  
کرنے لگا۔ ادویات لانے لگا۔ ہر دوسرے  
تیسرے دن مجھے ڈاکٹر کو دکھانے لانا مگر مجھے اب  
زندہ رہنے کی آرزو نہ تھی۔ جس روز میری بیٹی بانو  
پیدا ہوئی تھی، میں نے اپنے قائد اعظم سے پوچھا  
تھا۔ ”اے بانی پاکستان! مجھے اور کتنی بار بغیر شادی  
کے ماں بننا پڑے گا؟“

یہی سوال میں ہر پاکستانی سے پوچھتی  
ہوں۔ ہے کوئی جو مجھے بتا سکے؟ اے 14 اگست! تو  
ہی بتا دے اس کہانی کا انجام مجھے؟“

.....  
میری ماں بانو نے مجھے اپنی ماں کی لہورنگ  
داستان 1990ء میں سنائی تھی اور اس کے ساتھ ہی  
وہ زندگی سے نانا توڑ گئی تھی۔ اس کا مالک اور مالک کا  
باپ بھی اس دنیا میں نہ رہا مگر ان کی جگہ ان کی اولاد  
نے لے لی۔ اس کے دو بیٹے بھی اس جیسے ہی  
نکلے۔ میں نے اس حویلی سے نکلنے کی بہت کوشش کی  
مگر کامیاب نہ ہو سکی۔ میں اب بھی ان ڈھیروں  
جاگیرداروں اور بد معاشوں کی اس حویلی میں رہتی  
ہوں۔ ماں اور نانی کی طرح ان کی بے دام غلام  
ہوں، میں اب بھی غلامی کی ان زنجیروں میں جکڑی  
ہوئی ہوں۔ جب بھی 14 اگست کی تاریخ آتی ہے تو  
مجھے اپنی نانی بہت یاد آتی ہیں اور میں بھی یہ آس لگا  
لیتی ہوں کہ شاید مجھے بھی آزادی نصیب  
ہو جائے..... مگر نہ جانے میرے لیے 14 اگست کب  
آئے گی.....؟ نہ جانے کب.....؟



## نیکی راہیں گناہ نہیں جاتی

مستند احمد

”ایک روز کلاس میں پروفیسر صاحب ایک نابینا لڑکے کو لے آئے اور کہنے لگے کہ اس نے ایف اے کا امتحان دینا ہے لہذا اس کو ایک رائٹر کی ضرورت ہے گزشتہ ایک ہفتے سے یہ بیچارہ اپنے غریب باپ کے ساتھ مارا مارا پھر رہا ہے مگر کوئی اس کا رائٹر نہیں بن رہا“

سہری شہزی آپ بیتی سرکودھا سے



جب بھی قرآن پاک کی تلاوت کرتے ہوئے یہ آیت مبارکہ ”بے شک دلوں کو سنوں اللہ کے ذکر سے ملتا ہے۔“ سامنے آتی ہے تو بے اختیار میرا ذہن اپنے ماضی کی طرف چلا جاتا ہے۔

میرے والدین خود تو اُن پڑھ تھے مگر اُن کو اپنی اولاد کو پڑھانے کا بہت شوق تھا اور الحمد للہ اُن کا یہ شوق اور آرزو پوری بھی ہوئی۔ مجھ سے بڑے تین بھائی اور ایک بہن پڑھائی کے معاملے میں بہت لائق نہیں پڑھنے کے بہت متوقین بھی تھے جبکہ میں میٹرک تک انتہائی کند ذہن اور ایک نالائق ترین طالب علم تھا۔ میرا پڑھائی میں بالکل دل نہیں لگتا تھا پڑھنے بیٹھتا تو نیند آ جاتی میری نالائقی کی وجہ سے اسکول سے مجھے نہ صرف نکال دیا گیا بلکہ میرا میٹرک کا داخلہ بھی بورڈ میں نہ بھیجا گیا نتیجتاً میرا ایک سال ضائع ہو گیا۔ اگلے سال پرائیویٹ طالب علم کی حیثیت سے میرا داخلہ بھیجا گیا۔ گھر والوں کی لعن طعن سنتے اور گرتے پڑتے میٹرک کا امتحان دیا مگر جب رزلٹ آیا تو مارکس اتنے کم تھے کہ گھر میں میری خوب بے عزتی ہوئی پھر بڑی تک و دو اور مشکلوں سے مجھے گورنمنٹ انبالہ مسلم کالج سرکودھا میں فرسٹ ایئر میں داخلہ مل گیا۔ کالج میں بھی میری وہی پرانی ڈگر رہی میں نے پڑھائی سے ہٹ کر اور بہت سے فضول اور غلط شوق پال لیے مثلاً ریچھ کتے کی لڑائی دیکھنا ہرنی فلم دیکھنے سنیما جانا اور بھی ایسے ہی کئی شوق تھے یوں پڑھائی کی طرف رجحان نہ ہونے کی وجہ سے بدستور نالائق اور کند ذہن رہا۔

ایک روز کلاس میں پروفیسر صاحب ایک نابینا لڑکے (blind) کو لے کر آئے اور کہنے لگے کہ اس نے ایف اے کا امتحان دینا ہے لہذا اس کو ایک

رائٹر کی ضرورت ہے۔ گزشتہ ایک ہفتے سے یہ بے چارہ اپنے غریب باپ کے ساتھ مارا مارا پھر رہا ہے مگر کوئی اس کا رائٹر نہیں بن رہا شاید اس کی وجہ اُن کی انتہائی غربت اور اُن سے کسی قسم کا معاوضہ وغیرہ نہ ملتا تھا۔ پروفیسر صاحب نے پوری کلاس میں اس کا رائٹر بننے کی اپیل کی مگر کوئی بھی طالب علم آمادہ نہ تھا اور قریب تھا کہ وہ مایوس ہو کر چلے جاتے اُسی لمحے میرے دل میں اللہ نے نیکی کا جذبہ پیدا کیا اور میں نے اُس لڑکے کا رائٹر بننے کی حامی بھر لی۔ اُن باپ بیٹے کے چہرے خوشی سے دمک اٹھے۔ قصہ مختصر جون جولائی میں سیکنڈ ٹائم اُس لڑکے کے پیپر تھے۔ میں نے بڑی جانفشانی اور ذمہ داری سے اُس کے پیپر زد کیے۔ اس دوران میں شدید گرمی کی وجہ سے مجھے سن اسٹروک اور شدید بخار ہو گیا مگر بیماری کے دوران بھی میں نے اُس لڑکے کے رائٹر کا فریضہ سرانجام دیا تھا۔

ساڑھے تین مہینے کے بعد ایف اے کا رزلٹ آیا تو اُس نابینا طالب علم کی سیکنڈ ڈویژن آئی۔ مجھے بہت خوشی ہوئی اور میں فوراً اُس کے گھر پہنچا جو کہ شہر سے کافی دور ایک پسماندہ کچی بستی میں تھا اور اُن کو رزلٹ بتا کر مبارکباد دی۔ اُس لڑکے کے والدین بہن بھائی سب بہت خوش ہوئے۔ اُس کی ماں نے مجھے بہت دُعا میں دیں اور جب میں اُن سے اجازت لے کر واپس آنے لگا تو انہوں نے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

”بیٹا! زندگی کے ہر امتحان میں اللہ تمہیں کامیاب کرے۔“

آپ یقین کریں اس کے فوراً بعد مجھ پر اللہ کی کرم نوازیوں کامیابیوں رحمتوں کا ایک دُور شروع ہو گیا۔ میرے ذہن کے تمام بند درتے پچھل گئے میں



جو پہلے کند ذہن تھا پڑھائی میں میرا دل لگنے لگا۔ کالج کے ہر امتحان میں میری پہلی پوزیشن آنے لگی اور میرا شمار کالج کے لائق اور ذہین طلباء میں ہونے لگا۔

میں نے جب ایف۔ اے کا امتحان دیا تو رزلٹ آنے سے پہلے رمضان المبارک کا مقدس مہینہ جون میں آیا۔ پاک پروردگار کی توفیق سے میں پورے روزے رکھے اور ترویج پڑھی اور لیلۃ القدر کی رات بھی ملی۔ میں نے اپنی کامیابی کی دعا بھی مانگی۔ عید کے بعد جب رزلٹ آیا تو میں نے اپنے کالج میں ٹاپ کیا تھا اور ہائی فرسٹ ڈویژن ملی تھی۔ میری خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ میرے گھر والے حیران تھے ہر طرف سے مبارکبادیں مل رہی تھیں اور پھر میں نے کالج کے سالانہ کانووکیشن میں پیرنچر کرم شاہ الازہری کے دست مبارک سے انعام وصول کیا تھا۔

میں نے بی اے کے لیے گورنمنٹ کالج، سرگودھا میں داخلہ لیا اور اللہ کے فضل و کرم سے وہاں بھی میرا شمار کالج کے ہونہار اور لائق طلباء میں ہونے لگا۔ ساتھ ہی تمام نصابی اور غیر نصابی سرگرمیاں بھی حسب معمول جاری رہیں اور پھر میں نے بی اے کا امتحان بھی امتیازی نمبروں سے پاس کر لیا تھا۔

مجھے شروع سے ہی گھومنے پھرنے اور سیر سپاٹے کا شوق تھا اور حسن اتفاق سے بی اے کا رزلٹ آنے کے فوراً بعد ہی مجھے حکومت پاکستان کے ایک ادارے میں شعبہ آڈٹ میں آڈیٹر کی جاب مل گئی جس کی بدولت ڈیوٹی کی سرانجام دہی کے سلسلے میں پورے ملک کی سیر کی جو آج تک جاری ہے۔

ایسی ہی ایک ڈیوٹی کے سلسلے میں میرا راولپنڈی

جانا ہوا تھا۔ جہاں ہماری رہائش تھی وہیں سے ایک لڑکی روزانہ کالج جانے کے لیے گھر سے نکلتی تو اتفاق سے اسی وقت میں بھی اپنے آس جا رہا ہوتا تھا اور میں محاورے نہیں، حقیقتاً پہلی ہی نظر میں اس کی محبت کا اسیر ہو گیا تھا۔ وہ اتنی خوبصورت تھی کہ جو بھی اس کو دیکھتا بس دیکھتا ہی رہ جاتا۔ اب میں روزانہ اس کا انتظار کرتا، وہ جب بھی گزرتی، اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ہوتی اور پھر ایک دن میں نے ایک خط میں اپنا حالی دل لکھ کر اس کے راستے میں پھینک دیا، اس نے ناصر وہ خط اٹھالیا بلکہ دوسرے دن میرے خط کا جواب بھی دیا اور اپنی محبت اور جاہت کا اظہار کر دیا۔ الغرض ہم دونوں دنیا و مافیہا سے بے نیاز ایک دوسرے کی محبت اور عشق میں گرفتار ہو گئے تھے۔

اس کا نام غزالہ تھا اور وہ بی اے فائنل کی طالبہ تھی۔ اس کی کالج سے چھٹی کے بعد ہم اکثر ملنے پھر شام کو نون پر بھی موقع ملنے پر خوب باتیں ہوتیں، دن اسی طرح کبھی خوشی بسر ہوتے رہے اور اس کا فائنل ایگزام آ گیا۔ اس نے پوری تیاری سے اپنا امتحان دیا تھا۔

ایک دن اس نے مجھے رات کو فون کیا اور صبح ”راجہ بازار“ ملنے کا کہا اور فون بند کر دیا۔ اگلے دن جب ہماری ملاقات ہوئی تو اس نے بتایا کہ اس کے کزن کا رشتہ آتا تھا جو کہ اس کے والدین نے منظور کر لیا ہے اور ایک ماہ کے اندر شادی کی تاریخ دے دی ہے، یہ سب اچانک آنا فانا ہو گیا ہے ساتھ ہی اس کا یہ بھی کہنا تھا کہ وہ میرے علاوہ کسی اور سے شادی کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔

غزالہ کی شادی کا سن کر میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی تھی، اس نے کہا تھا کہ ”میں تمہاری

خاطر گھر چھوڑ دوں گی، آؤ، ہم کورٹ میرج کر لیتے ہیں۔“

میں نے اس سے دو دن سوچنے کا نام تو لیا تھا مگر میرے ضمیر نے مجھے اجازت نہ دی تھی کہ وہ میرے ساتھ اپنے ماں باپ کی عزت کو پامال کر کے گھر سے بھاگے اور اس کے علاوہ اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا لہذا میں نے اس کو کہہ دیا تھا کہ ”والدین کی عزت واؤ پر نہ لگاؤ، اگر وہ تمہاری شادی میرے ساتھ کرنے پر رضامند نہیں ہیں تو ان کا یہ فیصلہ قبول کر لو۔“

غزالہ نے اپنے والدین کا فیصلہ قبول کر لیا تھا۔ اس کی شادی کا دن آ گیا اور وہ بیاہ کر اپنے سسرال چلی گئی مگر میری دنیا اندھیر ہو گئی..... یوں لگتا تھا کہ میری کائنات لٹ گئی ہے وہ غزالہ جس کو میں نے روح کی گہرائیوں سے چاہا تھا پرانی ہو گئی تھی۔ میری بھوک اڑ گئی تھی ساری ساری رات اس کے غم میں مجھے نیند نہ آئی، اس کی یادیں ستاتیں۔ وہ راولپنڈی شہر جو میرا پسندیدہ ترین شہر تھا، اب اس سے دل اچاٹ ہو گیا تھا۔ بالآخر میں نے اپنا ٹرانسفر فیصل آباد کر لیا تھا مگر اس کی یادوں نے وہاں بھی میرا چھانچھوڑا تھا۔

میں نے بے تحاشا سگریٹ پیئے شروع کر دیئے تھے۔ روزانہ ساٹھ ستر سگریٹ پی جاتا مگر مجھے نہ قرار ملا اور نہ ہی سکون، میں راتوں کو اٹھ کر روتا، میری صحت دن بدن گرنے لگی تھی آنکھیں اندر دھنس گئیں، چہرے کی رنگت کالی ہو گئی اور میں ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گیا اور مجھے دل کی تکلیف ہو گئی، شدید انجائنا ٹور دھوتا تھا۔

میرے کو ایک مجھے ہارٹ اسپیشلسٹ کے پاس لے گئے تھے۔ اس نے ECG اور مختلف ٹیسٹ کے بعد دو ایک تجویز کردی تھیں۔ اسی طرح چھ ماہ گزر

گئے مگر میری صحت خراب ہوتی چلی گئی تھی پھر ہمیں سمندری کا آڈٹ پروگرام ملا تھا تو میں وہاں ڈیوٹی کے لیے چلا گیا تھا۔

اس روز ایک مفلوک الحال غریب آن پڑھ دیہاتی بزرگ اپنے کسی کام کے سلسلے میں اس دفتر میں آئے جس کا ہم آڈٹ کر رہے تھے۔ میں نے دیکھا کہ کوئی بھی اہلکار ان کی نہیں سن رہا تھا شاید اس لیے کہ وہ بزرگ رشوت نہیں دے سکتے تھے وہ بہت مجبور تھے مگر ان کی شنوائی نہیں ہو رہی تھی ہر روز چکر لگاتے ہوئے اپنے جائز کام کے لیے دھکے کھا رہے تھے۔ ایک روز وہ اپنے کام کے سلسلے میں ایک اہلکار کی منت کر رہے تھے مگر اس نے ان کو جھاڑ دیا، مجھے یہ دیکھ کر بہت دکھ ہوا اور میں نے بزرگ کی مدد کرنے کا فیصلہ کیا اور پھر ان کو اس دفتر کے بڑے افسر کے پاس لے جا کر کہا کہ ان بزرگ کا حق دلائیں۔ آڈٹ والوں کی ہر جگہ میں ویسے ہی بہت عزت ہوتی ہے۔ قصہ مختصر، میری کوششوں سے ان بزرگ کا کام ایک دن میں ہو گیا اور تمام دفتری کارروائیوں کے بعد لیٹر ان کے حوالے کیا۔ اسی اثناء میں ہمارے نائب قاصد نے کھانا لگا دیا تھا۔ میں نے ان بزرگ کو بھی کھانے کی دعوت دی تھی اور اپنے کمرے میں بلا کر ساتھ کھانا کھایا تھا۔

کھانے کے بعد جب میں اپنے معمول کی دوائیں کھانے لگا تھا تو ان بزرگ نے مجھ سے پوچھا تھا۔ ”کس مرض کی دوا کھا رہے ہو؟“ میں نے کہا تھا۔ ”دل کی تکلیف ہے!“ وہ بولے تھے۔ ”بچر.....! اس عمر میں دل کا مرض؟“ میں نے کہا۔ ”باباجی! یہ عشق مجازی میں ناکامی

کاروگ ہے جو دل کو لگ گیا ہے اس کا کوئی علاج نہیں ہے اب غزالہ کی حسین یادیں ہی میرا سرمایہ ہیں۔“

وہ بزرگ باباجی چند لمبے کچھ سوچتے رہے اور پھر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولے۔  
”پتر.....! تو نے میری بے لوث مدد کی اور میرا کام کروا کر میری مشکل آسان کر دی جا میں تجھے صدقہ دل سے دے دیتا ہوں تیرے سارے غم دھک دور ہوں گے تجھے غزالہ سے بڑھ کر بیوی ملے گی خوشیاں اور سکھ ملے گا آج سے تیرا عشق مجازی سے عشق حقیقی کی طرف سفر شروع ہے۔“  
پھر وہ جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے اور رخصت ہونے سے پہلے بولے۔ ”میرا مرشد کامل ہے اُن سے بھی آج تیرے لیے دُعا کروا کر پھر گھر جاؤں گا۔ انشاء اللہ تجھے صحت اور تندرستی ملے گی۔ انہوں نے مجھے سختی سے دوا کھانے سے منع کر دیا پھر الوداعی مصافحہ کیا اور چلے گئے۔“

آپ پڑھنے والے کیا میری اس بات پر یقین کریں گے کہ اُن بزرگ کے جانے کے کچھ دیر بعد ہی مجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے وہ میری ساری تکلیف اپنے ساتھ لے گئے ہوں۔ میں نے واقعی دو انہ کھائی سردیوں کا موسم تھا میں اپنے کمرے میں ہی رہا۔ رات سات بجے قرہی مسجد سے عشاء کی اذان کی آواز آ رہی تھی۔ میں نے اٹھ کر وضو کیا اور مسجد چلا گیا۔ باجماعت نماز پڑھی۔ سنتیں وتر اور نوافل پڑھنے کے بعد مسجد کے ایک کونے میں بیٹھ کر میں نے قرآن پاک کی تلاوت شروع کر دی۔ یقین جانیے تلاوت کے دوران میری آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب اُٹھ آیا میں اتنا رویا کہ میری ہچک باندھ گئی۔ اگر میں تھا ہوتا تو شاید دھڑائیں مار مار کر

شامل حال رہی تھی۔

روتا۔ پورا ایک گھنٹہ مسجد میں تلاوت کے دوران رہا، آنسوؤں کی برسات جاری رہی مجھے لمحہ سگون مل رہا تھا۔ میرا سارا غم، اضطراب، پریشانی بیماری دور ہو چکی تھی۔ اُس روز میں نے محسوس کیا کہ واقعی اللہ شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔ ایک عجیب طرح کا سکون، لذت و حلاوت، کیف و مستی کی عجیب کیفیات تھیں۔ ایسے لگتا تھا میرے سارے دکھ درد غم، دل کی تکلیف آنسوؤں کے رستے نکل گئی ہے پھر میری زبان۔ درود پاک کا ورد جاری ہو گیا۔ کعبہ خضریٰ تصور ذہن میں آنے لگا۔ بہر حال مسجد سے واپس اپنی رہائش پر آیا اور کھانا کھا کر درود پاک پڑھ سو گیا۔

صبح فجر کے وقت خود بخود میری آنکھ کھل گئی تھی۔ فجر کی نماز کے بعد واپس آ کر میں نے سارے پہلا کام یہ کیا کہ تمام دوائیں پھینک دیں میرے شب و روز ایک عجب روحانی کیفیت پر گزرنے لگے تھے۔

تقریباً پندرہ روز بعد ہمارا آڈٹ پروگرام سمندری سے ختم ہو گیا۔ مجھے محکمہ ٹریننگ کے لاہور بھیج دیا گیا۔ ماڈل ٹاؤن میں ہمارا ٹریننگ آفس ٹیوٹ تھا تین ماہ کی ٹریننگ تھی یہیں پر سلسلہ قادیان کے ایک بہت بڑے بزرگ عالم دین، عظیم مہتمم اسکار کی صحبت میں آئی۔ اُن کے ولولہ انگیز اور مصطفیٰ پر مبنی خطابات سننے کے بعد ہر لمحہ میرے دل کی کیفیت بدلتی جا رہی تھی۔ اسی دوران میں میری صحت بھی بحال ہونا شروع ہو گئی تھی۔ میں پہلے سے زیادہ گورا چٹا ہو گیا تھا۔

اپنی لاہور والی ٹریننگ کے اُس امتحان میں نے ٹاپ کیا تھا۔ الغرض میرے دنیاوی اور دینی دونوں معاملات میں اللہ رب العزت کی مدد

## نغمہ پاکستان

ہمیں ہے فخر ملت حبیب دو جہاں ہیں ہم

شاہ گزدار مالک مکان و لامکاں ہیں ہم

دیوار پاک و پرچم حسین کے پاسباں ہیں ہم

وطن کے جاں نثار ہیں وطن کے نوجواں ہیں ہم

روش روش حسین ہے مرقع جمیل ہے

ہماری جہد مستقل بہار کی دلیل ہے

وطن ہمارا گلستاں ہے اور باغبان ہیں ہم

یقین و اتحاد و تقلم باہمی لیے ہوئے

متار عقل و ہوش و مشعل خودی لیے ہوئے

صراطِ مستقیم پر رواں دواں ہیں ہم

وطن کے جاں نثار ہیں وطن کے نوجواں ہیں ہم

محسن بھوپالی

☆☆☆



# مجھے قرا آ جائے

راوی: فوزیہ بٹ  
تحریر: محمد اقبال زمان

ایک سنسان جگہ پر اسپید بریکر کی وجہ سے نامرنے گاڑی کی رفتار  
کی تو میں نے پستول سے اس پہ دو فائر کیے۔ ایک گولی اس کی  
گردن میں لگی اور دوسری کھوپڑی میں۔ گاڑی کی رفتار.....

سائلوٹ ہے کراچی ایک چمکی تیسری آپ بیتی



آنسو پونچھ ڈالے اور بولے۔ ”گڑیا.....! رو یا مت  
کرتیری آنکھوں میں آنسو دیکھ کر میں بے چین ہو  
جاتا ہوں۔“

پھر وقت یوں ہی خوشیوں کے ہنڈولے میں  
جھولتے گزرنے لگا۔

ایک ایک کر کے میری تینوں بہنوں کی شادیاں  
ہو گئیں۔ اکبر بھائی کا نمبر بہن بھائیوں میں تیسرا تھا۔  
اماں کو اب اُن کی شادی کی فکر ہوئی اور اُن کی نظر  
انتخاب میری ماموں زاد شرمہ پہ جاٹھری۔ شرمہ باجی  
بہت خوب صورت اور پرکشش جسامت کی مالک  
تھیں۔ کشمیری ہونے کے ناتے اُن کی رنگت سرخ و  
سیدھی۔ وہ اُس وقت گریجویشن کر رہی تھیں۔

میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ بھی اکبر بھائی کو پسند  
کرتی ہیں۔ اکبر بھائی کو دیکھ کر اُن کی آنکھوں میں  
ایک عجیب سی چمک آ جاتی تھی۔ اُن کا گھر ہمارے  
گھر سے زیادہ دور نہیں تھا، صرف دو گلیاں ہی  
درمیان تھیں۔ وہ اکثر ہمارے گھر آ جاتی تھیں۔ مجھ  
سے بڑی راحیلہ باجی سے تو اُن کی بہت دوستی تھی۔  
اُن کی شادی کے بعد بھی وہ آتی رہیں۔ وہ اماں کے  
باس گھنٹوں بیٹھتی تھیں۔ مجھے بھی وہ بہت پسند کرتی  
تھیں اور اکبر بھائی کی طرح مجھے گڑیا ہی کہتی تھیں۔

اماں نے اکبر بھائی سے شادی کی بات کی تو  
انہوں نے کہا۔ ”اماں! اگر شرمہ آپ کو پسند ہے تو  
مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔“

یوں شرمہ ہماری بھائی بن کر گھر آ گئیں۔ شادی کے  
ہنگاموں میں شرمہ باجی کے ایک کزن خرم کی آمد و رفت  
بھی ہمارے گھر کافی بڑھ گئی۔ رشتے دار تو وہ ہمارا بھی تھا  
لیکن دور کا اثر باجی نے تو اُسے بھائی بنایا تھا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مجھے احساس ہوا  
کہ میں خرم کو پسند کرنے لگی ہوں، اسے دیکھے بغیر  
مجھے چین نہیں آتا۔

میں نے یہ لکھوت کے علاقے کشمیری محلہ میں  
آکھ کھولی۔ اس علاقے میں زیادہ تر بٹ برادری رہتی  
ہے۔ میرا تعلق بھی بٹ برادری سے ہے۔ میرا بچپن  
بہت خوش گوار گزرا۔ والد صاحب کی کراکری کی بہت  
بڑی دکان تھی۔ گھر میں پیسے کی ریل پیل تھی۔

مجھے یاد نہیں کہ میں نے کوئی خواہش کی ہو اور وہ  
پوری نہ ہوئی ہو، یوں بھی اپنی چار بہنوں اور ایک  
بھائی میں آخری نمبر میرا تھا اس لیے میں گھر بھر کی  
لاڈلی تھی، خاص طور پہ باجی اور اکبر بھائی تو مجھ پہ  
جان چھڑکتے تھے۔ اکبر بھائی کا حال تو یہ تھا کہ وہ  
میرے بغیر کھانا بھی نہیں کھاتے تھے۔ باجی اور اکبر  
بھائی کے بے جالا ڈیپار نے مجھے بگڑنے نہیں دیا  
کیونکہ اماں جی نہایت سخت گیر تھیں۔ وہ مجھ سے محبت  
تو کرتی تھیں لیکن مجھ پہ کڑی نظر بھی رکھتی تھیں۔  
ہمارا گھر انا کوئی دقیقہ نوسی نہیں تھا۔ باجی خود تو  
معمولی پڑھے لکھے تھے لیکن اپنی اولاد کو اعلیٰ تعلیم دلانا  
چاہتے تھے۔

سب سے بڑی بہن آسیہ باجی بی اے کرنا  
چاہتی تھیں لیکن انہوں نے ابھی انٹرمیڈیٹ ہی کیا  
تھا کہ اُن کا رشتہ آ گیا۔ اماں نے فوراً اُن کی شادی  
کر دی۔ وہ لڑکیوں کو زیادہ دیر گھر میں بٹھانے کی  
قائل نہیں تھیں۔ میں اُن دنوں پانچویں میں پڑھ  
رہی تھی۔ آسیہ باجی کو دلہن بنا دیکھ کر مجھے عجیب سا  
احساس ہو رہا تھا۔ میں اپنی سہیلیوں کے ساتھ ذرق  
برق کپڑے پہنے اترائی اترائی گھوم رہی تھی۔ حیرت تو  
مجھے اُس وقت ہوئی جب میں نے اتنی خوشی کے موقع  
پر آسیہ باجی کو آنسو بہاتے دیکھا۔ اُس وقت  
نا صرف آسیہ باجی بلکہ میری سب بہنیں اور اماں بھی  
رو رہی تھیں۔ اکبر بھائی اور باجی کی آنکھیں بھی نم  
تھیں۔ انہیں روتا دیکھ کر میں بھی رونے لگی تو اکبر  
بھائی بے چین ہو گئے اور انہوں نے لپک کر میرے



اُس دن میں چھت پر تھی، گلی میں کسی کی بارات آئی تھی۔ میں وہی دیکھ رہی تھی۔

اچانک پیچھے سے مجھے خرم کی آواز سنائی دی۔

”کیا دیکھ رہی ہو زریہ؟“

میں چونک کر مڑی تو خرم کو پر شوق انداز میں اپنی طرف دیکھتے پایا۔

”گلی میں کوئی بارات گزر رہی ہے۔“ میں نے کہا۔

”وہی دیکھ رہی ہوں۔“

”تم نے بھی سوچا ہے کہ اسی طرح ایک دن تمہاری بارات بھی آئے گی اور تم ہمیشہ کے لیے پرانی ہو جاؤ گی؟“

”یہ تو میں نے نہیں سوچا۔“ میں نے نظریں چرا کر جواب دیا کیونکہ اس کی آنکھوں کی پیش سے میں گویا پھلکی جا رہی تھی۔

”فوزیہ! ایک بات کہوں برا تو نہیں مانو گی؟“

خرم نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

”کہیں۔“ میں نے سر جھکا کر کہا۔

خرم نے جرات کا مظاہرہ کیا اور میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں قلم لیا اور بولا۔ ”مجھے..... بشاری کرو گی؟“

میرا ہاتھ ابھی تک اُس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ والہانہ انداز میں میری طرف دیکھ رہا تھا۔ ”اس کا..... فیصلہ..... تو میرے بڑے کریں گے۔“ میں نے کہا اور ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی۔

اس نے مزید مضبوطی سے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور بولا۔ ”جب بڑوں کے فیصلے کا وقت آئے گا تو اُن سے بھی پوچھ لوں گا۔ ابھی تو صرف تمہاری مرضی معلوم کرنا چاہتا ہوں۔“

میرا دل بری طرح دھڑکنے لگا۔ میں نے شرماتے ہوئے کہا۔ ”میں..... میں..... کیا..... بتاؤں..... میں.....“

”اچھا چلو صرف ہاں یا نہیں میں جواب دے دو۔“

”میرا ہاتھ تو چھوڑیں.....“ میں نے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی۔

”اُوں ہوں.....“ اس نے شوخی سے نفی میں ہلایا۔ ”پہلے میری بات کا جواب دو۔“ اس نے دوسرا ہاتھ بھی پکڑ لیا۔ ”ہاں..... یا..... نہیں؟“

”ہاں.....“ میں نے بہ مشکل تمام کہا اور ہاتھ چھڑا کر نیچے کی طرف بھاگی۔

وہ تو غصیت ہے کہ مجھے اُس وقت کسی دیکھا نہیں ورنہ میری حالت دیکھ کر ضرور چونک اٹھتا۔ میں نے اپنے کمرے میں پہنچ کر دیا۔ اچانک میری نظر ڈرائنگ ٹیبل پر پڑ گئی وہاں شرم سے گلناز چہرے اور کانپتے ہونٹوں والی ایک لڑکی کھڑی تھی۔ ہاں اُس وقت میں خود کو بھی اچھی لگ رہی تھی۔

خرم کس وقت چھت سے نیچے آیا اور کس وقت وہاں سے گیا مجھے کچھ احساس نہیں۔ میرے جسم میں تو ابھی تک سنسنی سی دوڑ رہی تھی۔

خرم دو دن تک نہیں آیا۔ معلوم ہوا کہ وہ اپنے کسی کام سے لاہور گیا ہوا ہے۔

خرم کا خاندان بھی تجارت پیشہ تھا لیکن اُن کا روزگار زیادہ بڑا نہیں تھا۔ دولت کے لحاظ سے ہمارے ہم پل نہیں تھے ہاں یہ ضرور تھا کہ خرم علیٰ تعلیم حاصل کر رہا تھا۔

میں دو دن تک شدید بے چینی میں رہی جب مجھے احساس ہوا کہ میں خرم کے بغیر نہیں رہ سکتی۔

دو دن بعد مجھے اس کا چہرہ نظر آیا تو دل چاہا کہ بے اختیار اس کے گلے لگ جاؤں۔

وہ تھوڑی دیر اماں کے پاس بیٹھا، شرمہ بھال سے باتیں کیں پھر مجھے چھت پہ چلنے کا اشارہ کیا۔ جی اور اکبر بھائی اُس وقت دکان پر تھے اور رات دس بجے سے پہلے اُن کی واپسی کا بھی کوئی امکان

میں کانپتے قدموں اور بے ترتیب انداز میں دھڑکتے دل کے ساتھ خاموشی سے اٹھی اور اماں اور بھابی کی نظریں بچا کر اوپر چلی گئی۔

چھت پہ اوپر دو کمرے تھے۔ اباجی عموماً گرمیوں میں پتھر کاؤ کر کے چھت پہ سو با کرتے تھے۔ ابھی اتنی گرمی نہیں تھی اس لیے وہ نیچے ہی سو رہے تھے البتہ اُن کی چارپائی پیڈسٹل فین وغیرہ کمرے میں تھا۔ بارش کے موسم پر اباجی اُس کمرے میں چلے جاتے تھے۔

میں چھت پر جا کر چارپائی پر بیٹھ گئی۔ اُس وقت میرا دل اس قدر بری طرح دھڑک رہا تھا گویا میری پسپاں توڑ کر باہر نکل آئے گا۔

تھوڑی دیر بعد خرم بھی اوپر آ گیا۔ اس نے بہت والہانہ انداز میں میرے ہاتھ پکڑ لیے اور بولا۔ ”فوزیہ!..... میں نے یہ دو دن تمہارے بغیر کس طرح گزارے ہیں میں ہی جانتا ہوں۔“

”میں بھی تمہارے بغیر بہت اداس تھی خرم!“ میں نے کہا۔

خرم میرے نزدیک چارپائی پر بیٹھ گیا اور اس نے اچانک میری کمر میں ہاتھ ڈال دیا۔ میں نے واجبی سی حراست کی پھر آنکھیں بند کر لیں۔ میرے پورے جسم میں سنسنی سی دوڑ رہی تھی۔ دل چاہ رہا تھا کہ وقت ختم جائے اور خرم یوں ہی مجھے ہانپوں میں لیے بیٹھا رہے۔

اچانک مجھے میڑھیوں پہ کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ میں تڑپ کر خرم کی ہانپوں سے نکل گئی۔ خرم بھی گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ اس کمرے کے ساتھ ایک باتھ روم بھی تھا۔ میں نے اشارے سے اس باتھ روم میں جانے کو کہا اور خود اپنا حلیہ درست کر کے کمرے سے باہر نکل آئی۔

اُسی وقت شرمہ بھابی چھت پر آئیں اور بولیں۔

”ارے گڑیا.....! تم یہاں ہو اور اماں تمہیں نیچے ڈھونڈ رہی ہیں؟“

”اماں مجھے ڈھونڈ رہی ہیں؟“ میں نے کہا تو مجھے اپنی آواز خود اجسی ہی لگی۔ میری سانسوں کا زیر و بم ابھی تھا نہیں تھا۔

”ہاں وہ خالہ کلثوم آئی ہیں نا!“ بھابی نے کہا پھر چونک کر بولیں۔ ”تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے گڑیا؟“

”بھابی! میرے سر میں شدید درد ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میں ذرا تازہ ہوا کھانے اوپر آئی تھی۔ آپ جلیں میں ابھی آتی ہوں۔“

بھابی مسکراتی ہوئی نیچے چلی گئیں۔

چند منٹ بعد میں کمرے میں آئی تو خرم بھی باتھ روم سے نکل آیا۔ میں نے کہا۔ ”میں نیچے جا رہی ہوں تھوڑی دیر بعد موقع دیکھ کر تم بھی آ جانا۔“

”تم مجھے مس کال کر دینا۔“ خرم نے کہا۔

”مس کال؟“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”میرے پاس نہ تو موبائل ہے نہ تمہارا سیل نمبر ہے میں مس کال کیسے کروں گی؟“ میرا موبائل فون اصل میں بھابی کو پسند آ گیا تھا۔ میں نے اُنہیں دے دیا۔ میں کل نیا موبائل لے لوں گی پھر بات ہوگی۔“ میں تیزی سے نیچے آ گئی۔

خالہ کلثوم امی سے بڑی تھیں۔ مجھ سے بہت پیار کرتی تھیں۔ مجھے دیکھ کر خوشی سے نہال ہو گئیں اور مجھے گلے لگا کر بولیں۔ ”فوزیہ بیٹی! میں کتنی دیر کی آئی بیٹھی ہوں تجھے میری فکر ہی نہیں۔“

”ارے نہیں خالہ!“ میں نے اُن کے گلے لگتے ہوئے کہا۔ ”مجھے اور اپنی اتنی پیاری خالہ کی فکر نہ ہو۔“

”اچھا باتیں مت بنا“ اماں نے کہا۔ ”خالہ کے کھانے پینے کا بندوبست کر اتنی دور سے بے چاری صرف تیری خاطر آتی ہیں۔“

میں نے خاموشی سے خرم کو باہر جاتے دیکھا پھر میں مطمئن ہو کر پکن کی طرف بڑھ گئی۔

خالہ کلثوم گوجرا نوالہ میں رہتی تھیں۔ خالو کا بہت وسیع کاروبار تھا۔ پٹھانوں کی ایک فیکٹری تھی۔ خالہ کلثوم بھتی میں ایک دفعہ ضرور ہمارے گھر آتی تھیں۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ اب تو میں دو تین دن تک اوپر نہیں جاسکوں گی کیونکہ خالہ کلثوم کا ڈرائیور اوپر ہی رہتا تھا۔ ہمارا گھر بہت بڑا تھا لیکن اس میں کوئی سروٹ کارڈ نہیں تھا۔

میں نے اسی دن اکبر بھائی سے موبائل فون منگوایا۔ مگر بھائی کے سیل فون سے مجھے خرم کا نمبر بھی مل گیا۔ یوں میں رات رات بھر خرم سے ٹیلی فون پر بات کرنے لگی اور ہم محبت کی وادی میں آگے ہی آگے بڑھتے گئے۔ اتنے آگے کہ وہاں سے واپسی مجھے محال لگتی تھی۔

وہ گرمیوں کی ایک جھلکتی ہوئی دوپہر تھی۔ امی اور بھائی کھانا کھا کر اپنے اپنے کمروں میں بیٹھ گئے۔ میں بھی اسی کے خنک ماحول میں لیٹی تھی۔ اچانک میرے سیل فون کی بیل بجنے لگی۔ میں نے اسکرین پر نظر ڈالی خرم کی کال تھی۔

میری آواز سنتے ہی وہ بے ساختہ بولا۔ ”تم کہاں ہو جان؟“

”مجھے کہاں جانا ہے اپنے کمرے میں ہوں۔“

”ذرا باہر آؤ۔“

”کیوں؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”تم باہر تو آؤ۔“ اس نے کہا۔

میں کمرے سے باہر نکلی تو حیرت زدہ رہ گئی خرم کمرے کے دروازے پر موجود تھا۔ میں نے حیرت سے کہا۔ ”تم..... اس وقت..... اور تم اندر کیسے آئے؟“

”گرمی کے مارے میرا ہذا حال ہے تو مجھے اندر تو آنے دو۔“ خرم نے رومال سے پسینہ پونچھتے

ہوئے کہا۔

میں نے بھی بغیر سوچے سمجھے اسے اپنے بیڈ روم میں بلالیا۔

اس نے دروازہ اندر سے بند کیا اور اطمینان سے میرے بیڈ پر بیٹھ گیا پھر اس نے بیڈ سائیڈ ٹیبل پہ رکھے ہوئے جگ سے گلاس بھرا اور اسے ایک ہی سانس میں خالی کر دیا اور مسکرا کر بولا۔ ”فوزی! تم کھڑی کیوں ہو بیٹھ جاؤ۔“

میں اس کے نزدیک بیٹھتے ہوئے بولی۔ ”پہلے تم یہ بتاؤ کہ تم نے باہر کا دروازہ کیسے کھولا؟“

”بہت آسانی سے۔“ اس نے کہا۔ ”میرے پاس بانیک اور الماری کی چابیاں ہیں میں نے الماری کی ایک چابی لگائی تو وہ دروازے میں لگ گئی یوں بھی وہ تالا بہت پرانا ہو گیا ہے۔“ پھر اس نے مسکرا کر کہا۔ ”چھوڑو! باتوں کو۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے اچانک میرا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا۔

”ارے چھوڑو! کیا کر رہے ہو؟ امی اور بھائی اپنے کمروں میں ہیں اور کسی بھی وقت ادھر آسکتی ہیں۔“

”گرمی اتنی شدید ہے کہ وہ.....“

اس کا جملہ ادھر وارہ گیا۔ دروازے پر ہونے والی دستک میرے سر پہ بھی ہتھوڑے بن کر گر گئی۔

باہر سے اباجی کی آواز آئی۔ ”مگڑیا!..... دروازہ کھول بیٹا!“

”جی ابو جی!..... میں نے بوکھلا کر کہا۔“

”دروازہ کھول گڑیا!.....!“

میں نے خرم کو ہاتھ روم میں جانے کا اشارہ کیا اور خود دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

دروازہ کھولا تو اباجی کمرے میں داخل ہوئے اور بولے۔ ”بیٹا!..... کیا سو رہی تھیں؟“

”جی بابا! ذرا نیند آگئی تھی۔“ میں نے جواب دیا۔

”اچھا! مجھے وہ پیسے تو دے جو میں نے تیرے پاس رکھوائے تھے۔“

میں نے پیسے نکالنے کو الماری کھولی ہی تھی کہ سیل فون کی بیل گونج اٹھی۔ اباجی نے پلٹ کر سیل فون کی طرف دیکھا پھر بولے۔ ”یہ کس کا موبائل فون ہے؟“

وہ خرم کا موبائل تھا۔ انہوں نے موبائل فون اٹھایا تو ان کی نظر خرم کے رومال پہ پڑی پھر ان کی نظر بیڈ کے نزدیک فرش پہ پڑی تو وہ سہکت ہو گئے۔

میری نظر میں ان کا تعاقب کر رہی تھیں۔ فرش پہ خرم کے جوتے پڑے ہوئے تھے۔ وہ بوکھلاہٹ میں ننگے پاؤں ہی ہاتھ روم میں بھاگ گیا تھا۔

اباجی کچھ دیر کے لیے سہکت ہو کر کبھی جوتوں کو دیکھتے تھے، کبھی رومال کو، کبھی موبائل کو پھر وہ ہم سے بیڈ پر بیٹھ گئے ایک گلاس پانی پیا اور انہائی شاکی اور زنی نظروں سے مجھے دیکھ کر بولے۔ ”مجھے تجھ سے یہ امید نہیں تھی گڑیا!.....!“

”اباجی!..... میں.....“

انہوں نے ہاتھ اٹھا کر مجھے بولنے سے روک دیا اور تھیلی کی پشت سے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے باہر نکل گئے۔ انہوں نے مجھ سے پیسے بھی نہ لیے۔

اُس وقت میرا پورا جسم کسی سوکھے پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔

اُسی وقت خرم ہاتھ روم سے نکلا اور بولا۔ ”کیا ہوا فوزی! اما جی کیا کہہ رہے تھے؟“ وہ اباجی کو ماما جی کہتا تھا۔

”تم ابھی اور اسی وقت یہاں سے نکل جاؤ.....“ میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

”فوزی! میں.....“

”جاؤ.....“ میں نے غصے میں اس کی بات

کاٹ دی۔ ”تمہاری وجہ سے آج میں اباجی کی نظروں میں گر گئی ہوں بلکہ خود اپنی نظروں میں گر گئی ہوں۔“

خرم نے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ اس نے جوتے پہنے اپنا سیل فون اور رومال اٹھایا اور باہر نکل گیا۔

میں بیڈ پر گر کے بری طرح سکھنے لگی۔

تھوڑی دیر بعد بھابی کمرے میں آئیں تو میں جھٹ داش روم میں گھس گئی اور اپنا منہ دھو کر باہر نکلی۔ وہ شاید مجھ سے کچھ کہنا چاہتی تھیں۔ مجھے دیکھ کر بولیں۔ ”مگڑیا! اباجی کی طبیعت کچھ خراب ہے وہ آج دکان سے بھی جلدی آگئے ہیں اور انہیں بلا رہے ہیں۔“ یہ کہہ کر وہ چلی گئیں۔

میں سناٹے میں رہ گئی۔ خوف کے مارے گویا میرے جسم کا خون خشک ہو گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں اباجی کا سامنا کیسے کروں گی؟ میں کمرے سے باہر نکلی تو میرے قدم من من بھر کے ہو رہے تھے۔ میں کسی نہ کسی طرح خود کو کھینچتی ہوئی اباجی کے کمرے میں پہنچی۔

وہ اُس وقت بیڈ پر نیم دراز تھے اور چہرے سے برسوں کے مریض لگ رہے تھے۔

”بیٹھ جا فوزیہ!.....!“ زندگی میں پہلی دفعہ انہوں نے مجھے نام سے یکارا تھا۔

میں لرزتی کا پتی بیٹھ گئی۔

اباجی نے گلوگیر لہجے میں کہا۔ ”تو نے ایسا کیوں کیا بیٹا؟“

”مجھے معاف کر دیں اباجی!.....!“ میں نے اُن کے چہرے پکڑ لیے اور ہلکے ہلکے روتے لگی۔ ”معاف کر دیں مجھے!“

”میں نہیں چاہتا کہ اس واقعے کی بجائے تیری ماں یا بھائی کے کانوں میں پڑے۔ میں نے تو تیری

ماں یا بھائی کے کانوں میں پڑے۔ میں نے تو تیری



## غزل

کوئی بھگی ہوئی صدا ہوں میں  
تیرے دل کی فقط دعا ہوں میں  
تجھ کو میرا یقیں نہیں پھر بھی  
تجھ سے بڑھ کر تیری وفا ہوں میں  
کھوٹا سکھ سمجھ کے پھینک دیا  
زندگی تیری ہموا ہوں میں  
کچھ ضرورت نہیں بتانے کی  
جانتی ہوں جناب کیا ہوں میں  
تو نے دیکھا نہیں غزل مجھ کو  
دل کی دنیا کا آئینہ ہوں میں  
غزالہ جلیل راؤ۔ اوکاڑہ

محبت میں اپنی غیرت کا خون کر دیا لیکن اکبر تجھے جتنا  
پیار کرتا ہے اس سے کہیں زیادہ غیرت مند بھی  
ہے۔ وہ تیری جان بھی لے سکتا ہے اور اپنی جان  
دے بھی سکتا ہے۔

”اباجی!..... میں.....“

”بس اب جا۔“ اباجی نے سرد مہری سے  
کہا۔ ”اور بھول جا کہ میں تیرے کمرے میں آیا  
تھا۔“ یہ کہتے ہوئے اُن کی آنکھوں سے ایک مرتبہ  
پھر آنسو بہنے لگے۔

میں بو جھل قدموں اور مردہ دلی کے ساتھ اٹھ کر  
اپنے کمرے میں آ گئی۔

اس اندوہ ناک واقعے کا نتیجہ یہ نکلا کہ اباجی نے  
ایک ہفتے کے اندر اندر میرا رشتہ خالہ کلثوم کے بیٹے  
ناصر سے طے کر دیا اور ایک مہینے کے اندر اندر میری  
شادی ہو گئی۔

ناصر پڑھا لکھا اور خوب روٹو کا تھا۔ اس کی مالی

حالت خرم سے لاکھ درجے بہتر تھی۔ گوجرانوالہ میں  
اُن کی پنکھوں کی فیکٹری تھی اور اب ناصر کراچی میں  
کوئی کاروبار کرنا چاہتا تھا۔

اکبر بھائی بھی کراچی جانے کی تیاری کر رہے  
تھے۔ انہوں نے وہاں گاڑیوں کا شوروم لے لیا  
تھا۔ میری شادی کے تین ماہ بعد ہی اکبر بھائی کراچی  
چلے گئے پھر انہوں نے ناصر کو مشورہ دیا کہ اگر تمہیں  
کراچی میں کاروبار کرنا ہے تو گاڑیوں کا بزنس بھی برا  
نہیں ہے، یوں شادی کے چھ ماہ بعد ناصر بھی کراچی  
چلا گیا۔ وہ مجھے گوجرانوالہ میں چھوڑ گیا تھا کہ وہاں  
مکان کا بندوبست کرنے کے بعد ہی تمہیں بلاؤں  
گا۔

میں ناصر سے محبت تو نہ کر سکی لیکن حالات سے  
سمجھوتا ضرور کر لیا۔ شادی کے بعد بھی خرم سے سیل  
فون پر بات ہوتی رہتی تھی۔

پھر شوہر نے مجھے بھی کراچی بلا لیا۔ اُن دنوں  
میں امید سے تھی۔

پھر اللہ نے مجھے چاند سے ایک بیٹے سے نواز  
دیا۔

ایک دن میں گڈو کے ساتھ کھیل رہی تھی کہ  
اچانک ناصر باہر سے آیا اور درشت لہجے میں  
بولاً۔ ”فوزیہ!.....! یہ خرم کون ہے؟“

میں گڑبڑا گئی پھر سنبھل کر بولی۔ ”وہ شرمہ بھائی کا  
منہ بولا بھائی ہے۔“

”تم سے اس کا کیا تعلق ہے؟“

”مجھ سے بھلا اس کا کیا تعلق؟“ میں نے کہا۔  
اس نے آگے بڑھ کر میرے منہ پر اتنا زناٹے

دار چھڑ مارا کہ میں بیڈ پے ہو گئی۔  
پھر تو اس نے یہ معمول ہی بنالیا بات بات پہ  
مجھے دھتک کر رکھ دیتا۔ اسی دوران میں میری ایک

بہن بھی پیدا ہو چکی تھی۔

اکبر بھائی بھی کراچی میں تھے اور اُن کا گھر بھی  
ہمارے گھر سے دس منٹ کی ڈرائیو پر تھا لیکن میں  
نے کبھی ناصر کی شکایت اُن سے نہیں کی۔ وہ یہ  
برداشت کر ہی نہیں سکتے تھے کہ اُن کی چیتھی اور  
ناز و نعم میں بلی بہن پر کوئی تشدد کرے۔

ایک دن تو انتہا ہو گئی، ناصر نے مجھے اس بری  
طرح زد و کوب کیا کہ میں دو دن تک بستر سے اُبل بھی  
نہ سکی۔ بچے بھوک سے بلکنے لگے تو میں بہ شکل تمام  
انجی۔ مجھ میں کچھ بھی کرنے کی سکت نہیں تھی۔ میں  
کسی نہ کسی طرح دروازے پر پہنچی اور محلے کے ایک  
لوٹے کو بلا کر اس سے دودھ ڈبل روٹی اور کھن وغیرہ  
منگوا لیا۔ وہ لڑکا واپس جا رہا تھا کہ ناصر آ گیا۔ اس  
نے تہہ آلود نظروں سے مجھے گھورا اور بال پکڑ کر مجھے  
گھسیٹا ہوا اندر لے آیا۔ میں تو اس کے تشدد سے  
پہلے ہی بے ہوش تھی، اس کے مزید تشدد نے میرے  
وجود میں نفرت کی آگ بھڑکا دی۔ میں نے اس  
لحے فیصلہ کر لیا کہ اب میں اس درندے کو زندہ نہیں  
چھوڑوں گی۔

دوسرے ہی دن میں نے خرم کو ٹیلی فون کیا اور  
اسے فوراً کراچی پہنچنے کو کہا۔ اس سے یہ بھی کہا کہ  
اپنے ساتھ ایک پستول ضرور لے کر آنا۔

خرم دوسرے ہی دن فلائٹ سے کراچی پہنچ  
گیا۔ وہ اس سے قبل بھی کراچی آتا رہتا تھا اور ہمیشہ  
اکبر بھائی کے گھر ٹھہرتا تھا۔ ناصر کے جانے کے بعد  
میں نے کال کر کے خرم کو بلا لیا۔ وہ حیران پریشان تھا  
کہ ایسا کیا ہو گیا کہ فوزیہ نے مجھے فوری طور پر پستول  
سمیت کراچی بلایا ہے؟

میں نے دونوں بچوں کو ملازمہ کے حوالے کیا  
اور خود خرم کے ساتھ سی سائیکل کی طرف نکل گئی اور  
ایک ویران گوشے میں پہنچ کر اسے ناصر کے تشدد کی  
کہانی سنائی اور اس سے کہا کہ مجھے پستول چلانا سکھا

## بے عزتی

”میں اپنے کتے کا نام ٹوٹی رکھنا چاہتی تھی“  
لیکن امی نے جھڑک دیا اور کہنے لگیں کہ یہ ٹوٹی کی  
بے عزتی ہے۔

”پھر میں نے اس کا نام تم پر رکھنا چاہا تو بھی  
امی نے منع کر دیا۔“

”ہاں“ کہنے لگیں کہ یہ کتے کی بے عزتی ہے۔“  
مرسلہ: فرخ علی۔ میاں چنوں

دو۔

”میں تمہیں پستول چلانا تو سکھا دوں گا۔“ خرم  
نے کہا۔ ”لیکن درست نشانہ لینے کے لیے تمہیں کم  
سے کم دو مہینے پریکٹس کرنا ہوگی۔“

”مجھے کوئی نشانہ نہیں لینا۔“ میں نے کہا۔ ”میں  
تو ناصر پہ بالکل قریب سے فائر کروں گی۔“

”سوچ لو فوزی!.....! خرم نے کہا۔ ”ایسا نہ ہو  
کہ.....“

”مجھے کچھ مت سمجھاؤ.....“ میں نے کہا۔ ”اس  
شخص نے مجھ پر اتنا ظلم کیا ہے کہ میں ایک منٹ بھی  
اسے برداشت نہیں کر سکتی.....“

میں گھر پہنچی تو ناصر موجود تھا۔ اسے علم ہو چکا تھا  
کہ خرم کراچی آیا ہے۔ اس نے درشت لہجے میں  
کہا۔ ”دل آئی اسنے یا رے؟“

”میں تم جیسے گھٹیا آدمی کے سوال کا جواب بھی  
نہیں دینا چاہتی۔“ میں نے کہا۔

میرا حق جواب سن کر اس نے ایک مرتبہ پھر مجھے  
جانوروں کی طرح مارنا شروع کر دیا۔ اس نے مجھے  
اتنا مارا کہ میں بے ہوش ہو کر گر گئی۔

مجھے ہوش آیا تو انتقام کا جذبہ مزید بڑھ چکا  
تھا۔ ناصر اُس وقت گھر ہی میں موجود تھا اس نے سرد

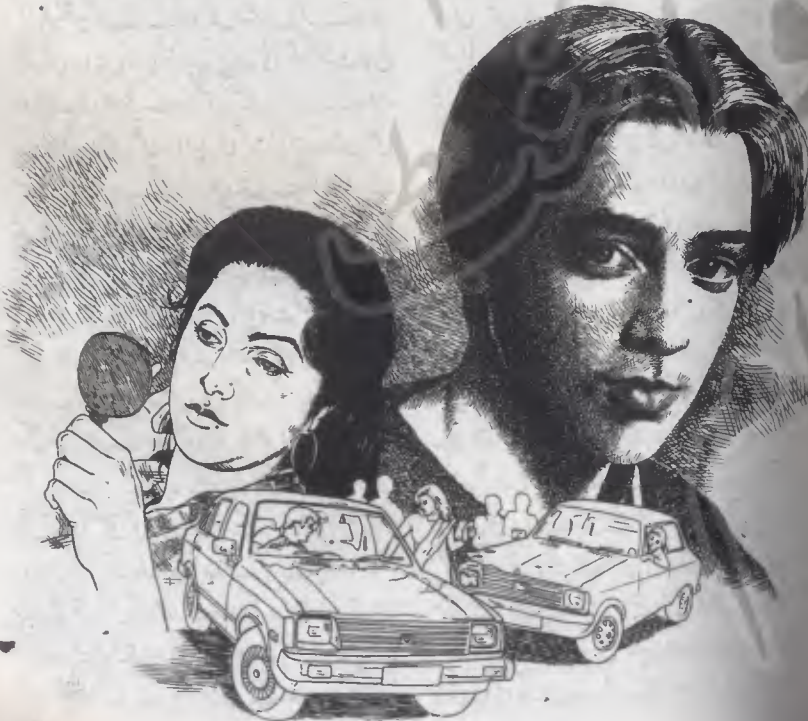


## دردِ دل کے وسیلے

فرزانہ بگت

مجھ پر بجلی کی کرنی میں پٹی پٹی آنکھوں سے انہیں دیکھنے لگی۔ ”یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ یہ کیسے ہوا؟ وہ کیسے مر گئی؟“ میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہونے لگا۔ آہ میری بیکلی میری عزیز ترین بیکلی اب دنیا.....

بیکلی جگ پتی راولپنڈی



میں نے پستول جھاڑیوں میں پھینک دیا اور فریختے ہوئے گئی۔ ”بچاؤ..... بچاؤ..... ڈاکوؤں نے میرے شوہر کو گولی مار دی..... ارے کوئی میری پہلی بکری کرو۔“

وہاں سے گزرنے والی کسی گاڑی میں سوار شخص نے دن فائیو پر ٹیلی فون کر دیا اور دس منٹ سے بھی کم عرصے میں پولیس کی موبائل دین وہاں پہنچ گئی۔

میرے ذہن پر اتنا پریشر تھا کہ میں بے ہوش ہو گئی۔ پولیس نے ناصر کی ڈیڈ باڈی کے ساتھ مجھے بھی اسپتال بھجوا دیا۔

بعد میں پولیس نے تحقیقات کیں تو معلوم ہوا کہ اسے بہت نزدیک سے گولیاں ماری گئی ہیں۔

پولیس نے شبے میں مجھے حراست میں لے لیا۔ ان لوگوں نے آدھے گھنٹے کے اندر اندر مجھ سے بچ اگلا لیا اور مجھ پہ تین سو دو کے تحت مقدمہ بنا کر جیل بھیج دیا۔

کافی عرصے مقدمہ چلتا رہا۔ اس دوران میں اکبر بھائی نے پیسہ پانی کی طرح بہایا لیکن مجھے سزا ہونے سے نہ بچا سکے۔ عدالت نے مجھے عمر قید کی سزا سنائی۔

اب جیل میں ہوں اور مجھے پشیمانی کا احساس ہوتا ہے کہ کاش میں نے یہ سب کچھ نہ کیا ہوتا بلکہ اکبر بھائی سے ناصر کی شکایت کی ہوتی تو وہ خود ناصر سے نمٹ لیتے۔ افسوس تو مجھے یہ ہے کہ نفرت کی آگ نے مجھے تو جلایا ہی تھا میرے دونوں مصدوم بچوں کو بھی جھلسا کر رکھ دیا۔ اب مجھے کسی پلِ قرار نہیں آتا۔ آپ سے درخواست ہے کہ میرے حق میں دیکھ کریں کہ مجھے کسی طرح قرار آ جائے!

لجے میں کہا۔ ”اکبر بھائی کا ٹیلی فون آیا تھا۔ انہوں نے ہم لوگوں کو کھانے پر بلایا ہے۔ چلو اٹھو تیار ہو جاؤ۔ خبردار جو انہیں کچھ بتایا۔“

میں جیسے تیسے تیار ہو کر اس کے ساتھ اکبر بھائی کے گھر پہنچی۔ میں نے انہیں بتایا کہ میری طبیعت خراب ہے اس لیے میں صرف آرام کروں گی۔ آپ لوگ کھانا کھائیں۔“ کھانے کے بعد تقریباً بارہ بجے میں نے ناصر سے کہا۔ ”مجھے اب بھوک لگ رہی ہے لیکن میں کھانا نہیں کھاؤں گی بلکہ پیزا کھاؤں گی۔“

”ہاں ہاں چلو۔“ ناصر نے ہنس کر کہا۔ اکبر بھائی کے سامنے وہ انکار بھی نہیں کر سکتا تھا۔ دونوں بچے سو گئے تھے۔ میں نے کہا کہ ان دونوں کو یہیں سونے دیں۔ انہیں واپسی میں لے لیں گے یا پھر صبح کو لے لیں گے۔“

وہ مجھے پیزا کھلانے جناح ٹرینل پہ واقع میکڈونلڈ ریسٹورانٹ میں لے آیا۔

پیزا کھانے کے بعد جب ہم واپس ہوئے تو گاڑی میں بیٹھتے ہوئے مجھے شدید تکلیف ہوئی۔ ناصر کی لگائی ہوئی چوٹوں سے ٹیسس اٹھ رہی تھیں۔ نفرت اور انتقام نے پھر میرے وجود کو اپنی پلیٹ میں لے لیا۔ میں نے بیک سے پستول نکالا

اور اسے اپنے دوپٹے میں چھپا لیا۔ ایک سنسان جگہ پر بریک کی وجہ سے ناصر نے گاڑی کی رفتار سست کی تو میں نے پستول سے اس پہ دو فائر کیے۔ ایک گولی اس کی گردن میں لگی اور دوسری کھوپڑی میں۔ گاڑی کی رفتار بہت کم تھی اس لیے وہ بے قابو ہو کر کچھ دور تو چلی پھر رک گئی۔ ناصر کا سر اسٹینڈنگ پر تھا اور اس کے جسم سے خون کا گویا نوارہ بہہ رہا تھا۔ اس کے خون سے میرا چہرہ اور کپڑے بھی داغ دار ہو گئے تھے۔



گوٹے بھرے طلباء و طالبات کے لیے قائم اس پرائیویٹ پوسٹ گریجویٹ کالج میں ایم اے انگریزی سال اول کی کلاس میں گنتی کے ہی لڑکے اور لڑکیاں تھے یعنی پانچ یا چھ لڑکیاں اور چھ سات لڑکے۔ اُن میں کچھ ایسے تھے جو میری طرح بیٹری سے چلنے والا تاروں والا آلہ سماعت استعمال کرتے تھے۔ کچھ ایسے تھے جو آلہ سماعت کے محتاج نہیں تھے اور قریب سے کی جانے والی اونچی آواز میں بات سن سکتے تھے۔ کچھ تو بت گویائی سے مسخرمخوم اور لکھ کر یا ہاتھ کے اشاروں سے بات کرتے تھے اور کچھ میری طرح گلے کے رگ پٹھوں پر زور ڈال کر اپنے معنی مطالب کی بات کرنے والے تھے۔ کچھ نے عام کالجوں سے گریجویشن کی تھی اور کچھ نے مخصوص اداروں سے۔

یہ 1969ء کی بات ہے، مِلتان کے گز لڑ کالج سے گریجویشن کرنے کے بعد میں ایم اے کرنے لاہور پہنچی تھی۔ وہاں میں پنجاب یونیورسٹی گورنمنٹ کالج اور ایف سی کالج کے سوانحی تعلیمی ادارے کے نام سے واقف نہیں تھی۔ امید تھی کہ بی اے میں اعلیٰ نمبروں کے سبب مجھے ان ہی میں سے کسی ادارے میں ضرور داخلہ مل جائے گا لیکن اپنی معذوری یعنی بہرہ پن اور نقل گویائی کے سبب مجھے ان میں داخلہ ملتے ہوئے کچھ گھبراہٹ اور ہچکچاہٹ محسوس ہو رہی تھی۔ ان حالات میں ایک واقف کار نے مجھے اس ادارے کا پتا بتایا کہ اس میں مجھے با آسانی داخلہ مل سکتا تھا۔ ان کے مطابق وہاں کا طرز تعلیم و تدریس منفرد ہونے کے سبب مجھے پڑھائی میں کوئی مشکل پیش نہیں آ سکتی تھی۔ یو این او کے زیر اہتمام چلنے والا وہ ادارہ شہر کے مضافاتی صاف سترے پر فضا مقام پر واقع تھا۔ اس کی عمارت سادہ مگر پروقار اور خاصے وسیع رتبے پر بھیلی ہوئی تھی۔ اس میں ہوسٹل کا پورشن بھی تھا۔ اس میں انگریزی کے علاوہ اکٹھائیس

سیاسیات اور فلاسفی کی بھی ماسٹر کلاسز ہوتی تھیں۔ اساتذہ مقامی ہی تھے لیکن پرنسپل ایک امریکی پروفیسر تھیں۔ انتظامی عملہ بھی امریکی تھا۔ یہاں مثالی نظم و نسق کے ساتھ ہر طالب علم کا خاص خیال رکھنا اس ادارے کی خصوصیت تھی۔

اس ادارے میں نہ تو انٹری ٹیسٹ لیا گیا نہ انٹرویو۔ صرف ایک فارم پُر کرنا پڑا جس کے بعد داخلہ ٹیس کی ادائیگی کے بعد مجھے داخلہ مل گیا اور ہوسٹل کی رہائش بھی مل گئی۔ شناختی کارڈ اور رجسٹریشن نمبر بھی مل گئے۔ یہاں پڑھائی واقعی مخصوص طرز کی تھی۔ جو لڑکے لڑکیاں مخصوص اداروں میں تعلیم پاتے رہے تھے ان کے لیے یہ طرز کار انوکھا نہیں تھا لیکن مجھ سمیت باقی لڑکے لڑکیوں کے نزدیک یہ واقعی حیران کن اور منفرد طریقہ کار تھا۔ ہر کلاس میں جو خاصی کھلی روشن ہوا دار اور صفائی ستھرائی کا بہترین نمونہ ہوتی تھی، کھلی کھلی تظاروں میں کرسیاں رکھی ہوتی تھیں، میزوں پر ریڈیو نما مشینیں رکھی ہوتی تھیں جن میں مختلف قسم کے بٹن لگے ہوتے تھے۔ ریڈیو کے دونوں طرف سے دو تاریں نکل کر ہیڈ فون سے جڑی ہوتی تھیں اور دو تاریں ریڈیو کے پیچھے سے نکل کر پروفیسر کی میز پر رکھی مشین سے منسلک ہوتیں۔ اس میں مائیک نما آلہ نصب ہوتا جس میں بولتے ہوئے پروفیسر کیچر دیتے جنہیں طلباء کانوں پر ہیڈ فون لگا کر ریڈیو میں لگے بٹنوں کی مدد سے آواز اونچی یا دھیمی کر کے سنتے۔ شروع شروع میں مجھے ہیڈ فون کے استعمال اور اس کی مدد سے کیچر سننے میں بہت مشکل پیش آتی تھی پھر رفتہ رفتہ میں اس کی عادی ہوتی گئی اور کیچر سننے سمجھنے لگی۔ اس سلسلے میں کلاس میں ہر دم موجود رہنے والی امریکی ہیلپر (Helper) نے میری بڑی مدد کی بلکہ ان سب لڑکے لڑکیوں کی بھی جن کے

لیے یہ طریقہ کار اجنبی تھا۔

پڑھائی شروع ہوتے ہی مجھے اپنے ہم جماعتوں سے واقف ہونے کا بھی موقع ملا۔ چند ایک کو چھوڑ کر تمام لڑکے لڑکیاں متوسط گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ ان میں طبقہ اوسط کی مخصوص وضع داری شرافت اور شانستگی کی جھلک تھی لہذا ان سے دوستانہ روابط استوار ہونے میں کوئی دیر نہ لگی۔ امیر گھرانوں کے لڑکیاں لڑکے البتہ جلد بے تکلف نہ ہوئے وہ اپنا الگ گروپ بنائے رکھتے اور باقیوں سے الگ تھلک سے رہتے تھے لیکن رویے ان کے بھی شائستہ اور مہذب تھے یوں تو اس گروپ کے سب ہی لڑکے لڑکیاں بوجہ اپنی جامہ زیبی آرائش و زیبائش انداز و اطوار میں سب سے ممتاز نظر آتے تھے لیکن ایک لڑکے راجیل کی شان ہی نرالی تھی۔ وہ دراز قد و جید و حسین اور شاندار شخصیت کا مالک تھا۔

وہ ہمارے تاروں والے بھاری آلہ سماعت کی بجائے امریکی کمپنی زینتھ (Zenith) کا ساختہ آلہ سماعت استعمال کرتا تھا جو بغیر تاروں کا سیاہ رنگ کا چھوٹا سا تھا جسے کان کے سوراخ میں لگا لینا ہی کافی ہوتا تھا۔ یہ بہت قیمتی اور مہنگا آلہ سماعت تھا۔ راجیل یہ انورڈ کر سکتا تھا کیونکہ وہ ایک بڑے بزنس مین کا بیٹا تھا۔ اس امارت کے باعث اس میں کچھ غرور بھی تھا اور لیا دیا پن بھی۔ وہ لمبی چوڑی چھمچاتی کار میں آ جاتا تھا اور اپنے مخصوص گروپ کے سوا کسی سے بے تکلف نہیں ہوتا تھا۔ مجھ سے بھی اس کا تعلق رسمی ٹیک سلیک اور مزاج پر سی تک ہی محدود تھا۔ وہ گونگا نہیں تھا لیکن اس کی آواز اس کے حلق سے رک رک کر نکلتی تھی تاہم اس کی باتیں سمجھ آ جاتی تھیں۔

کلاس کی لڑکیوں سے جب میری بے تکلفی بڑھی تو فرحانہ نسرین اور فریدہ جلد ہی میری گہری سہیلیاں بن گئیں۔ انہوں نے لاہور کے مختلف

کالجوں سے گریجویشن کی تھی اور لاہور کے برائے علاقوں سنت مگر، کرشن مگر وغیرہ کی رہائش تھیں۔ گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ ہماری یہ ”چاریاری“ خوب پھلنے پھولنے لگی۔ ہمارے گروپ میں فرحانہ اپنی بے پناہ خوب صورتی، جامہ زیبی اور رک رکھاؤ کے سبب اپنی الگ شان رکھتی تھی۔ اس کا تعلق بھی متوسط گھرانے سے تھا۔ اس کے والد ایک اچھے سرکاری عہدے پر فائز تھے اور وہ چونکہ اپنے والدین کی واحد اولاد تھی اس لیے اس کی پرورش بڑے ناز و نعم سے ہوئی تھی۔ وہ ہر چیز کا اعلیٰ ذوق رکھنے کے ساتھ ساتھ پڑھائی میں بھی بہت لائق تھی اور میٹروں میں ہمیشہ ٹاپ پوزیشن حاصل کرتی تھی اس لیے کلاس کے سب لڑکے لڑکیاں اس کی عزت کرتے تھے اور اس سے مرعوب بھی تھے۔

اُس زمانے میں پاکستان کے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں دو سالہ کورس کے امتحانات کا سسٹم نافذ تھا لیکن اس کالج میں سسٹم نافذ تھا کیونکہ اس کا امریکہ کی ایک یونیورسٹی سے الحاق تھا اس لیے پڑھائی سخت تھی اور محنت بھی بہت کرنا پڑتی تھی مزید برآں اس کے تمام مضامین کے کورس بھی مقامی یونیورسٹیوں میں پڑھائے جانے والے کورسز سے مختلف تھے۔ ان حالات میں ہم سہیلیوں کو ایک دوسرے کے گھر جانے اور آپس میں سیر و تفریح کرنے کے بہت کم مواقع مل پاتے تھے۔ مجھے جب کبھی ہوسٹل کی تنہائی کہ وہاں لڑکیوں کے پورشن میں صرف چار ہی لڑکیاں تھیں ستائی تو میں فریدہ نسرین اور فرحانہ میں سے کسی کے گھر چلی جایا کرتی جہاں گھر جیسا ماحول پا کر مجھے خوشی بھی ہوتی اور سکون کا احساس بھی ہوتا۔ نسرین اور فریدہ کے دودو تین تین بہن بھائی تھے اس لیے ان کے گھر خوب رونق اور چہل پہل ہوتی تھی جبکہ فرحانہ کا گھر اس



کے اکلوتے اولاد ہونے کے سبب خالی خالی سالگتھا لیکن یہ اُس کی والدہ خالہ عذرا کی انتہائی مہربان محبت کرنے والی اور سہیلیوں ہی کی مانند بے تکلف شخصیت تھی اور اس کے والد کا پدرانہ شفقت سے لبریز برتاؤ تھا کہ نسرین اور فریدہ کے گھروں کی نسبت مجھے اس کے گھر میں کچھ زیادہ ہی اپنائیت اور محبت کا احساس ہوتا تھا۔ میں وہاں زیادہ سے زیادہ وقت گزار کر ہوسٹل واپس آتی تھی۔

کلاس کے تقریباً تمام لڑکے لڑکیاں فرحانہ سے پڑھائی کے سلسلے میں مدد لیا کرتے تھے۔ لڑکوں کے ساتھ اس کا رویہ انتہائی محتاط اور لیا دیا سا ہوتا تھا۔ وہ کسی کے ساتھ بے تکلف نہ ہوتی تھی لیکن کچھ عرصہ بعد ہم نے محسوس کیا کہ راجیل کے ساتھ اس کا برتاؤ مختلف ہو گیا تھا کچھ دوستانہ اور گرم جوش کم کا یہ بات ہمیں چونکانے کے لیے کافی تھی۔ ایک دن میکینٹین میں چائے کے دوران نسرین نے فرحانہ سے پوچھ ہی لیا۔

”کیا بات ہے فرحانہ؟ تم راجیل پر کچھ زیادہ ہی مہربان ہو؟“

”وہ ہم سے تمہارا.....“ اس نے ٹالنے کی کوشش کی۔

”تم کچھ بھی کہو لڑکتو یہی ہے جیسے تم دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب آ چکے ہو۔“

”بہت قریب تو نہیں، بس ذرا دوستانہ سے روابط ہیں۔“

”یہ دوستانہ ہی رہیں گے یا آگے چل کر کوئی دوسری صورت اختیار کر لیں گے؟“

”کون سی صورت؟“

نسرین نے گہری سانس لی۔ ”اگر تم راجیل کو پسند کرنے لگی ہو تو خیر وہ اچھا انسان ہے لیکن احتیاط اچھی چیز ہے۔“

”مجھے معلوم ہے لیکن معاملہ ایسا نہیں کہ تم خواہو

پریشان ہونے لگو۔“ فرحانہ نے بات ختم کر دی۔

وقت آہستہ آہستہ گزرنے لگا۔ فرحانہ اور راجیل کے دوستانہ تعلقات ترقی کرتے گئے۔ وہ اب اکثر کالج کے لان میں اکٹھے بیٹھے یا ٹہلتے دکھائی دیتے۔ دیکھنے والوں کو یہ جوڑا بہت خوبصورت اور ایک دوسرے کے لیے مناسب و موزوں لگتا تھا۔ اس پر تبصرے بھی ہوا کرتے تھے۔ ایک روز ہمارے پوچھنے پر فرحانہ نے اعتراف کر لیا تھا کہ وہ اور راجیل ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے ہیں اور ان کی دوستی محبت کا روپ دھار چکی ہے۔

”محبت کی انتہا ہے شادی۔ کیا راجیل نے اس بارے میں تم سے بات کی؟“ ایک دن فرحانہ کے گھر اس کے ساتھ چائے کی میز پر بیٹھے میں نے اس سے پوچھ ڈالا۔

اس کے چہرے پر جگمگاہٹ سی کوند گئی۔ ”کی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ آخری سیمسٹر ختم ہوتے ہی وہ اپنی والدہ کو میرے گھر بھیجے گا۔“

”یہ تو اچھی بات ہے راجیل تمہارے ساتھ مخلص ہے ورنہ امیر زادے زیادہ تر فطرت ہی کرتے ہیں۔“

”راجیل بہت شریف اور بلند کردار ہے۔ اس میں عام امیر زادوں جیسا سطحی اور چمچھورا پن نہیں۔ وہ مستقبل کے بارے میں بے حد سنجیدہ ہے۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ اپنے والد کے ساتھ کاروبار میں شریک ہو جائے گا۔“

”پھر تو اچھا ہے اس کے اور بہن بھائی بھی ہوں گے؟ وہ کیا کرتے ہیں؟“

”اس کی دو بڑی بہنیں امریکہ میں ہیں، ان کے شوہر وہاں بزنس مین ہیں۔ ایک بڑا بھائی جرمنی میں ہے۔ اس کا بھی اپنا بزنس ہے۔ یہاں صرف راجیل اور اُس کی چھوٹی بہن حمیرا ہی ہے۔“

”پھر تو اور بھی اچھا ہے تم شادی کے بعد آرام

سے اُس کے گھر رہنا، وہاں ساس سسر اور چھوٹی نند کے علاوہ کوئی مسئلہ نہ ہوگا۔“ میں مسکرا کر بولی۔ جواب میں وہ بھی مسکرا دی۔ ”راجیل اپنی والدہ کی بہت تعریفیں کرتا ہے۔ اسے یقین ہے کہ وہ اس کی پسند کا احترام کریں گی اور اس کے انتخاب کو سراہیں گی۔ اس کے والد بھی اس کی خوشیوں کو عزیز رکھتے ہیں۔ وہ بھی بخوشی اس رشتے پر آمادہ ہو جائیں گے۔“

”اللہ مبارک کرے تمہاری خوشیاں ہم یعنی تمہاری سہیلیوں کو دل و جان سے عزیز ہیں فرحانہ! ہماری دُعا ہے، تم اور راجیل شادی کے بندھن میں بندھ جاؤ اور تم اس کے ساتھ شاد و آباد رہو۔“

”آمین.....! ثم آمین.....!“  
یونہی وقت گزرتے گزرتے آخری سیمسٹر بھی گزر گیا۔ اب ظاہر تھا میں ہوسٹل میں نہیں ٹھہر سکتی تھی۔ نسرین فریدہ فرحانہ کے گھر الوداعی دعوتیں ہوئیں جس کے بعد میں اپنے گھر ملتان چلی آئی۔ وقت رخصت ہم نے باہمی خط و کتابت کے پختہ وعدے کیے تھے کہ ہمیں عمر بھر اسی طرح دوستی رہے۔

ملتان آنے کے بعد حسب وعدہ تینوں سہیلیوں سے میری خطوط کے ذریعے آدھی ملاقات جاری رہی۔ مجھے سب سے زیادہ فرحانہ کے خطوط کا انتظار رہتا تھا۔ اس نے اب تک جو کچھ لکھا تھا وہ یہ تھا کہ راجیل کو آخری سیمسٹر سے فارغ ہوتے ہی اس کے والد نے بزنس ٹور پر امریکہ بھیج دیا تھا۔ اسے وہاں گئے کئی مہینے گزر چکے تھے۔ جانے سے پہلے اس نے فرحانہ سے کالج میں ملاقات کی تھی اور وعدہ کیا تھا کہ امریکہ سے واپس آتے ہی وہ اپنے والدین کو رشتے کے لیے اس کے ہاں بھیجے گا۔ اب وہ اس کی واپسی کا بڑی شدت سے انتظار کر رہی تھی۔

پھر کچھ عرصہ گزرنے کے بعد ہمارا رزلٹ آ گیا۔ کلاس کے تمام لڑکے لڑکیاں کامیاب ہو گئے

تھے۔ فرحانہ نے حسب سابق ٹاپ پوزیشن حاصل کی تھی جبکہ راجیل کی سیکنڈ پوزیشن آئی تھی۔ میں نسرین اور فریدہ بھی اچھے نمبروں سے کامیاب ہو گئی تھیں۔ نسرین اور فریدہ کو جلد ہی لاہور میں مخصوص بچوں کے ادارے میں ملازمتیں مل گئیں۔ کچھ عرصہ بعد مجھے بھی اپنے شہر میں ایک اسکول میں جاب مل گئی۔ فرحانہ نے البتہ بہت سی آفرز کے باوجود نہیں ملازمت نہ کی کہ اس کے والد اس کے حق میں نہیں تھے۔ ویسے بھی اسے جاب کی ضرورت نہیں تھی اسے صرف راجیل کے امریکہ سے واپس آ نیک انتظار تھا۔ پھر کچھ عرصہ بعد فرحانہ کی طرف سے مجھے خط آنے بند ہو گئے۔ نسرین اور فریدہ جو اب ملازمتوں اور گھریلو مصروفیات کے سبب اس سے کبھی کبھار ہی مل پاتی تھیں، اکثر اس کے حالات لکھ بھیجتی تھیں۔ اسے ابھی تک راجیل کا انتظار تھا جواب تک امریکہ سے واپس نہ آیا تھا۔ وہ اس پر بے حد افسردہ اور پریشان رہنے لگی تھی۔ اس کی یہ حالت اس کے ماں باپ کو بھی سخت پریشان اور متفکر کیے ہوئی تھی۔

پھر ابا جان کا ٹرانسفر ملتان سے ڈیرہ غازی خان ہو گیا۔ انہوں نے کوشش کر کے میری ٹرانسفر بھی وہاں کر والی۔ وہاں پہنچ کر نسرین اور فریدہ سے میرا قہوڑے ہی عرصہ تک بذریعہ خط و کتابت رابطہ رہا پھر اس رابطے میں تسلسل نہ رہا۔ ان کے خطوط طویل وقفوں سے مجھے ملنے لگے پھر یہ سلسلہ بھی منقطع ہو گیا۔ یوں فرحانہ کے بارے میں مجھے اور کوئی بات معلوم نہ ہو سکی تھی۔

وقت گزرتا گیا یہاں تک کہ بائیس، تیس سال بیت گئے۔ ایک دن ایک رشتہ دار کی شادی میں ہمیں لاہور جانا ہوا۔ میں اس شادی میں شرکت سے زیادہ اپنی سہیلیوں نسرین، فریدہ اور فرحانہ سے ملنے کے لیے بے تاب ہوئی جا رہی تھی۔ چنانچہ جو نبی شادی کے ہنگامے سرد ہوئے میں نسرین کے گھر کرشن نگر جا



## آرڈر

ایک ڈانسر کا بی ہاؤس گئی اور آرڈر دینے سے پہلے اس نے ویٹر سے پوچھا۔ ”کیا یہاں کی کافی خالص ہوتی ہے؟“

”یقیناً دام۔“ ویٹر نے سچی گھاری۔ ”ہماری کافی آپ کے خوابوں کے شہزادے کی طرح خالص ہے۔“

ڈانسر نے چند لمحے غور کیا، پھر آہستہ سے بولی ”میرے لیے چائے لے آؤ۔“

ہما ناز۔ حیدر آباد

چچی وہاں پہنچ کر مجھے اس کے پرانے کھر کی جگہ ایک نیا تعمیر شدہ مکان دیکھنے کو ملا۔ پتا چلا وہ لوگ عرصہ ہوا اس مکان کو فروخت کر کے کہیں اور جا چکے تھے۔ ان کی نئی جائے رہائش سے کوئی بھی واقف نہیں تھا۔ مجھے بے حد مایوسی ہوئی، ایسی ہی مایوسی مجھے فریڈے کے گھر جا کر بھی ہوئی جہاں اب نئے لوگ آباد تھے کیونکہ فریڈے کے گھر والے بہت پہلے مکان بیچ کر کراچی جا چکے تھے۔ اب فرحانہ کا گھر رہ گیا تھا۔ مجھے امید نہ تھی کہ اتنا طویل عرصہ گزر جانے کے باوجود وہ لوگ اسی پرانے مکان میں ہی رہ رہے ہوں گے لیکن ایک موہوم سی امید کے سہارے میں وہاں جا پہنچی۔ یہ دیکھ کر میں نے کلمہ ”گلر پڑھا کہ فرحانہ کا گھر جوں کا توں کھڑا تھا۔ اس کے دروازے پر بدستور اس کے والد کے نام کی تختی لگی تھی۔ میرے گھنٹی بجانے پر ایک نوعمر صاحب زادے نے دروازہ کھولا اور پوچھا کہ مجھے کس سے ملانا ہے؟ میں نے فرحانہ کا نام لیا۔ وہ صاحب زادے بغیر کچھ کہے اندر چلے گئے، تھوڑی دیر بعد وہ دوبارہ نمودار ہوئے اور مجھے اندر آنے کو کہا۔

میں اندر چلی آئی۔ اُن صاحب زادے نے

مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور خود غائب ہو گئے۔ اس آراستہ و پیراستہ ڈرائنگ روم کی وہی شان تھی جو پہلے ہوا کرتی تھی۔ اس کی ایک دیوار پر فرحانہ کے والد کی تصویر بھی دیسی کی دیسی لگی تھی۔ زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ عمدہ لباس میں ملبوس ایک اڈیٹر عمر خوبصورت خاتون اندر داخل ہو گئیں۔ میں اپنی جگہ سے احتراماً کھڑی ہو گئی۔

”السلام علیکم!“

”علیکم السلام!“ انہوں نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ سر پر ہاتھ پھیرا اور بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی میرے سامنے صوفے پر بیٹھ گئیں۔

”تم شاید فرحانہ بیٹی کی سہیلی ہو۔ اگر تم اس سے ملنے آئی ہو تو تمہیں مایوس ہو گئی، وہ اب اس دنیا میں نہیں رہی۔“

مجھ پر گویا بجلی سی گری، میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہیں دیکھنے لگی۔

”یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ یہ کیسے ہوا؟ وہ کیسے مر گئی؟“ میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہونے لگا۔ آہ میری سہیلی.....! میری عزیز ترین سہیلی، حسین و جمیل، خوش ذوق و خوش اطوار فرحانہ اب دنیا میں نہ رہی تھی۔

”ہاں بیٹی.....! وہ فوت ہو چکی ہے، یہی بیس بائیس سال ہوئے۔“ ان کا لہجہ دکھ سے بوجھل اور آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔

”لیکن یہ ہوا کیسے؟ وہ کیسے فوت ہو گئی؟ اسے تو کوئی بیماری نہیں تھی؟“

”ہاں اسے کوئی بیماری نہیں تھی.....“ وہ آنسو پونچھتے ہوئے کہنے لگیں۔ ”پہلے میں تم سے اپنا تعارف کرا دوں، میں فرحانہ کی چھوٹی ہوں صدیقہ۔ فرحانہ کے والد افتخار احمد میرے بڑے بھائی تھے۔ اُن کے اور بھائی کے انتقال کے بعد میں یہاں آ گئی ہوں۔ اب میں یہیں رہتی ہوں۔“

مجھے ایک اور دھچکا لگا۔

”یعنی خالہ جان اور افتخار خالو بھی فوت ہو گئے؟“

”ہاں بیٹی.....! وہ اپنی اکلوتی نحت جگر کا صدمہ برداشت نہ کر سکے اور آگے پیچھے چلے گئے۔“

میری آنکھوں سے بے تحاشا آنسو رواں ہو گئے۔ میرا دل کرجی کرجی ہونے لگا پھر جب میری حالت کچھ سنبھلی تو میں نے اُن سے کہا۔

”آپ پوری بات بتائیے، فرحانہ کیسے فوت ہوئی اسے کیا ہوا تھا؟“

”یہ بات آج تک کسی کو معلوم نہیں ہو سکی کہ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا“ اسے کیا دکھ تھا۔ وہ جب اپنے کالج کے آخری امتحانات دے کر فارغ ہوئی تھی تو کچھ پریشان پریشان سی رہنے لگی تھی۔ پہلے پہل تو بھائی اور بھائی نے سمجھا کہ شاید وہ اپنے پیپر ز اچھے نہ ہونے کے سبب یوں فکر مند اور پریشان ہے لیکن جب رزلٹ آیا تو وہ فرسٹ آئی تب بھی اس کی حالت میں کوئی تبدیلی نہ آئی بلکہ اب تو وہ راتوں کو بھی کم سونے لگی تھی۔ بھائی اور بھائی اس کی اس حالت پر بے حد پریشان اور متحوش تھے۔ انہوں نے اس سے بہت پوچھا۔ اس کی سہیلیوں سے بھی پوچھ چکے لیکن نہ تو فرحانہ نے اپنی پریشانی اور فکر مندی کی کوئی وجہ بتائی نہ ہی اس کی سہیلیاں ہی کچھ بتا سکیں۔ اس پرانے دکھ اور پریشانی میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ انہوں نے اس کا علاج کرانا شروع کیا۔ ہر ڈاکٹر ہر حکیم کے پاس اسے لیے پھرے لیکن اس کی حالت روز بروز بگڑتی ہی گئی۔ اسے اب ہر دم بخار بھی رہنے لگا تھا جو کبھی تیز تو کبھی ہلکا ہو جاتا۔

بھائی اور بھائی اس کا ہر قسم کا علاج کروا کے مایوس ہو چکے تھے۔ فرحانہ ان کی اکلوتی بہن تھی۔ وہ اس کی حالت دیکھ کر روتے تھے۔ اب وہ برائے نام ہی کھائے پینے لگی تھی۔ تھوڑے ہی دنوں میں وہ سوکھ کر کاٹا ہوا ہو گئی۔ اکثر اوقات وہ ہوش و حواس سے عاری، بہکی بہکی باتیں کرنے لگتی تھی۔ ایک رات وہ شدید بخار کے عالم میں اپنے کمرے سے نکل کر باہر صحن میں آ گئی۔ وہ ماہ جنوری کی کڑکٹی سردیاں تھیں، وہ صحن میں آ کر بیڑھیوں پر بیٹھ گئی۔ صبح جب اس کی تلاش شروع ہوئی تو اسے صحن میں بیڑھیوں پر اس حالت میں پایا گیا کہ وہ ایک طرف لڑکھی ہوئی تھی، وہ مر چکی تھی۔“ انہوں نے رک کر بتے ہوئے آنسو پونچھے۔ ”اس کی موت نے بھائی اور بھائی کو زندہ درگور کر دیا۔ بھائی دل کے مریض بن گئے، بھائی بیمار رہنے لگیں۔ فرحانہ کی موت کے سات آٹھ ماہ بعد بھائی پر زبردست دل کا دورہ پڑا جس سے وہ جانبر نہ ہو سکے۔ اُن کی موت کے دو ماہ بعد بھائی بھی قبر میں اتر گئیں.....“

فرحانہ کی یہ دردناک کہانی سن کر میری عجیب حالت تھی۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔ اب میرے لیے مزید کہنے سننے کو کیا باقی رہ گیا تھا؟ چائے پانی وغیرہ منع کرتے ہوئے میں وہاں سے جانے کے لیے اٹھ گئی۔ فرحانہ کی موت کی وجہ مجھے معلوم ہو چکی تھی، یہ راحیل کی بے وفائی کا دکھ تھا جو اس کو قبر میں لے گیا تھا اور اس کی موت کا راز بھی اس کے ساتھ ہی قبر میں دفن ہو چکا تھا۔ کتنے ہی دنوں تک دکھ رنج اور صدمے سے میرا برا حال رہا۔ مجھے راحیل پر شدید غصہ آ رہا تھا۔ میرا دل چاہا جا کر اس سے ملوں اور اس سے پوچھوں کہ آخر اسے فرحانہ کے جذبات سے کھیل کر کیا ملا تھا؟ اس سے بے وفائی کر کے اس نے کون سی دولت، کون سی جنت پالی تھی؟ یہی سوچ کر ایک دن میں اس سے ملنے اس کے گھر گلرگ جا پہنچی۔ میں اس کے گھر ایک بار زماں طالب علی میں اس کی بہن کی شادی کے موقع پر آ چکی تھی اس لیے باآسانی وہاں پہنچ گئی۔



## غزل

محبت کا چلا پھر سلسلہ ہے  
کسی سے بعد مدت دل ملا ہے  
اے دنیا سچ میں نہ آہمارے  
یہ میرا اور اس کا معاملہ ہے  
نہ کاٹو یہ شجر کہ اس شجر پر  
پرندوں نے بنایا گھونسلہ ہے  
مری تقدیر میں تھی بے وفائی  
بھلا اس شخص سے پھر کیا گلا ہے  
نظر کے سامنے رہتے ہیں مری  
دلوں میں پھر بھی کتنا فاصلہ ہے  
اسے گر جیتنے کا بس جنوں ہے  
تو مجھ میں ہارنے کا حوصلہ ہے

شاعر: ریحان آفاق

لازم مجھے شاندار و پر شکوہ ڈرائنگ روم میں  
بٹھا کر چلا گیا۔ تھوڑی دیر میں پردہ ہٹا کر راحیل کی  
چھٹی بہن حیرا آگئی۔  
”السلام علیکم حیرا!“ میں اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔  
اس نے غور سے مجھے دیکھا دوسرے ہی لمحے  
مجھ سے بغل گیر ہوگئی۔  
”باجی! آپ! آپ! دیکھ لیجئے میں آپ کو  
بھولی نہیں حالانکہ ہمارے درمیان چند ایک ہی  
ملاقاتیں ہوئی تھیں۔“  
”ہاں تمہاری یادداشت واقعی بہت اچھی  
ہے۔“ ہم دونوں صوفے پر بیٹھ گئیں۔ ”ہاں باقی  
لوگ کہاں ہیں؟ خالہ جان راحیل وغیرہ؟ راحیل کی

تو شادی ہوگئی ہوگی؟“

اس کے چہرے پر ایک دم ہی شدید رنج و کرب  
کی گھٹائیں چھا گئیں۔  
”ای کا انتقال ہوئے عرصہ گزر چکا باجی!.....  
ڈیڈی اُن سے پہلے فوت ہو چکے تھے اور راحیل  
بھائی!.....“ اس کی آواز جھرجھرائے لگی۔ ”مینٹل  
ہاسپٹل میں ہیں۔“  
”کیا!.....؟“ میں غش کھاتے کھاتے پچی۔  
”ہاں باجی!.....! وہ پاگل ہو چکے ہیں یہی  
کوئی بیس بائیس سال ہوئے۔“ اس کی  
آنکھوں میں آنسو رواں تھے۔ ”اُن کے ساتھ  
بہت ظلم ہوا باجی!.....! بے چارے راحیل  
بھائی!.....! کیا ہوتا اگر امی جان اُن کی شادی  
فرحانہ باجی سے کرنے پر آمادہ ہو جاتیں۔ یہ سب  
انہی کا کیا دھرا ہے۔ ان کی بے جا ضد مخالفت اور  
ہٹ دھرمی نے راحیل بھائی کو اس حال تک پہنچا  
دیا۔“ میں نے چونکتے ہوئے گہری نظروں سے  
اس کی طرف دیکھا۔

”کیا مطلب؟ میں تو اب تک بھی سمجھ رہی تھی  
کہ فرحانہ کی موت کا ذمہ دار راحیل ہے اس کی بے  
وفائی نے اس کی جان لی ہے۔“  
”نہیں باجی!.....! ایسی کوئی بات نہیں۔“ اس  
نے سخت لہجے میں کہا۔ ”راحیل بھائی نے ہرگز ہرگز  
ان سے بے وفائی نہیں کی۔ وہ فرحانہ باجی کے ساتھ  
مخلص تھے۔ اپنی محبت میں سچے اور ثابت قدم۔ آپ  
کو یاد ہوگا کہ جب آپ لوگوں کا آخری سیکسٹر ہوا تھا  
تو راحیل بھائی ڈیڈی کے کسی کام سے امریکہ چلے گئے  
تھے۔ پیچھے سے اسی بہ پروگرام بنانے لگیں کہ ان کی  
شادی چھوٹی خالہ کی بیٹی عرشہ سے کر دی جائے جو بے  
حد ماؤرن آزاد خیال اور گھر سے باہر کی دنیا میں گن  
رہنے والی مغربی رنگ میں رنگی ہوئی لڑکی تھی۔ اسے

رہنے والی مغربی رنگ میں رنگی ہوئی لڑکی تھی۔ اسے  
خاندان میں کوئی بھی پسندیدگی کی نظروں سے نہیں  
دیکھا تھا۔ ڈیڈی نے اس رشتے کی مخالفت کی۔ ہم  
بہن بھائی بھی اس پر راضی نہیں تھے لیکن امی اپنی ضد  
پراوری رہیں پھر جب راحیل بھائی امریکہ سے لوٹے  
تو امی نے ان سے رشتے کی بات کی۔ اس پر راحیل  
بھائی نے انہیں فرحانہ باجی کا بتایا کہ وہ شادی کریں  
گے تو صرف ان سے اور کسی سے شادی کا وہ سوچ ہی  
نہیں سکتے۔ اس پر امی نے قیامت ہی کھڑی کر دی  
ان کا کہنا تھا کہ ایک تو راحیل بھائی بھی گنگے بہرے  
تھے دوسرے فرحانہ باجی بھی گنگی بہری اس لیے ان  
کے ہاں جو بچے ہوں گے وہ بھی گنگے بہرے ہی پیدا  
ہوں گے۔ وہ گنگے اپنے خاندان کی نسل خراب نہیں  
کریں گی۔ وہ ہر قیمت پر عرشہ سے ہی راحیل بھائی  
کی شادی کریں گی۔ انہوں نے راحیل بھائی پر بہت  
زور دیا سخت کی دھونس دھکیوں سے کام لیا لیکن راحیل  
بھائی عرشہ سے شادی پر آمادہ نہ ہو سکے۔ ہم بہن  
بھائیوں اور ڈیڈی کی ہمدردیاں انہی کے ساتھ تھیں۔  
سب نے اسی کو بہت سمجھایا بھجھایا خوشامدیں کیں ہوش  
مند کی اور عقل سے کام لینے کو کہا لیکن وہ اپنے فیصلے  
سے ٹس سے مس نہ ہوئیں۔ راحیل بھائی پر اس کا بہت  
برا اثر پڑ رہا تھا۔ ان کی صحت خراب رہنے لگی تھی انہو  
سے بے تحاشہ سگریٹ نوشی شروع کر دی تھی پھر  
شراب بھی پینے لگے تھے ساری ساری رات جاگتے  
تھے۔ ان کی یہ حالت دیکھ کر سب ہی بے حد پریشان  
تھے لیکن امی جانے کس مٹی کی بنی ہوئی تھیں کہ ان پر  
کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔ وہ بدستور اپنی ضد اور ہٹ دھرمی پر  
اڑی ہوئی تھیں۔ اس نے رک کر کبھری ٹوٹی سانسیں  
بھرا کیں۔ ”پھر ہمیں معلوم ہوا کہ فرحانہ باجی کا  
انتقال ہو گیا ہے۔ ہمیں شدید دکھ پہنچا تھا۔ راحیل  
بھائی پر تو قیامت ہی ٹوٹی پڑی شدید رنج اور صدمے

نے ان کا دماغ الٹ دیا۔ وہ بہکی بہکی باتیں کرتے  
اور پاگلوں جیسی حرکتیں شروع کر دیتے۔ اب تو امی  
کے بھی ہاتھ پاؤں پھولے۔ انہوں نے اپنی ضد اور  
ہٹ دھرمی چھوڑ کر راحیل بھائی کی خوب ناز و دریاں  
اور لاڈ پیار شروع کر دیا۔ ان کا بوی سنڈی سے علاج  
ہونے لگا لیکن پانی سر سے گزر چکا تھا۔ راحیل بھائی کا  
مرض بڑھتا ہی گیا۔ ان کی یادداشت ختم ہو کر رہ گئی وہ  
کسی کو پہچانتے تھے نہ ان میں کوئی سمجھ بوجھ رہی تھی۔  
چار و ناچار ڈاکٹروں کے مشورے پر انہیں مینٹل ہاسپٹل  
داخل کر دانا پڑا۔ اب امی ان کی صحت یابی کے لیے  
خوب صدقہ خیرات کرنے لگیں۔ قرآن خوانیاں  
کروانے لگیں۔ وہ جب کبھی راحیل بھائی سے ملنے  
ہاسپٹل جاتیں تو رو رو کر ان سے معافیاں مانگتیں۔  
جواب میں راحیل بھائی دیوانہ وار قہقہے لگاتے۔  
احساس جرم و پریشانی نے امی پر برا اثر ڈالنا شروع کیا  
وہ دل کی مریض بن گئیں۔ گھر میں کسی کو ان سے  
ہمدردی نہیں تھی لیکن سب ان کی خدمتیں کر رہے تھے۔  
انہی حالات میں ایک دن ڈیڈی چپکے سے سفر آخرت  
پر روانہ ہو گئے۔ راحیل بھائی کا غم انہیں اندر ہی اندر کھا  
گیا۔ ان کی موت کے بعد امی بھی زیادہ عرصہ زندہ نہ  
رہیں۔ ان کی موت کے بعد اب میں میرے شوہر اور بچے رہتے  
ہیں باقی سب بہن بھائی سب باہر ہیں۔“  
”اور راحیل؟ اس کا کیا حال ہے؟“  
”وہی پہلے جیسا میں سوچتی ہوں انہیں مینٹل ہاسپٹل  
میں موت تک کا وقت گزارنے کی بجائے یہاں گھر لے  
آؤں۔ یہاں کم از کم وہ اپنوں میں تو رہیں گے۔“  
میں جب راحیل کے گھر سے نکل رہی تھی تو  
میرے قدم بو مصل اور دماغ سن تھا۔ مجھے اپنا وجود  
کسی پہاڑ تلے پستو محسوس ہو رہا تھا۔

☆☆☆

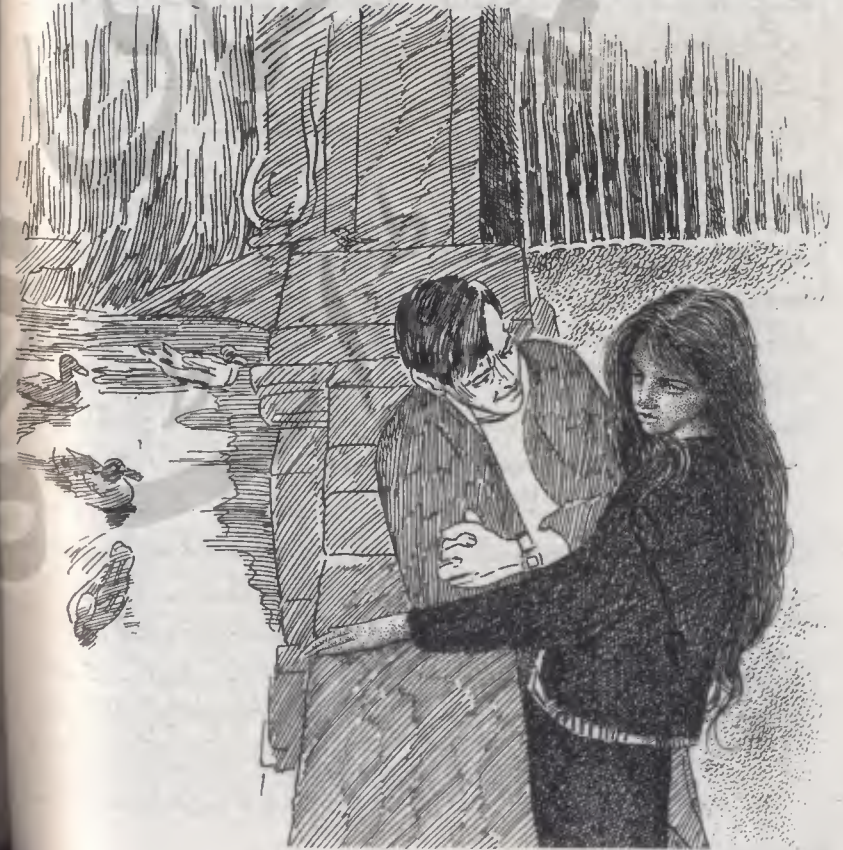


## چودھویں کا چاند

ملک صفدر عباس اعوان

لڑکی پرچھے جنون سوار تھا۔ اس نے آغا خانہ میں چلا تک  
لگا دی۔ شواہد کی نہایت تیز آواز کوئی اور لڑکی پانی میں غائب  
ہوئی چلی گئی۔ دوسرے کنارے پر کھڑا اکرم بکا بکا.....

## دوسری جگہ جہانیاں



اکرم اُس روز گھر سے بہت دور نکل آیا تھا۔  
آبادی سے دور پرے وہ علاقہ خاصا دیران اور  
سنسان تھا۔ ایک لمبی لمبی سڑک جس کے اطراف  
میں سفیدے اور شیشم کے درختوں کی لمبی قطار تھی  
سڑک کے ساتھ ہی ایک نہر بہہ رہی تھی جس کا پانی  
چڑھا ہوا تھا۔ نہر کی چوڑائی تو زیادہ نہیں تھی مگر اس کی  
گہرائی ٹھیک ٹھاک تھی۔ نہر پر ایک پرانا سا چھوٹا سا  
لکڑی کا پل بنا ہوا تھا جو کہ سالہا سال موسموں کا  
مقابلہ کرتے کرتے خستہ حال ہو چکا تھا۔ نہر کے  
دوسری طرف جنوب میں ایک بڑا سا قبرستان تمام تر  
پراسراریت لیے ہوئے موجود تھا۔ نہر پر بنا ہوا شکستہ  
سائیل نہر کے اُس پار قبرستان کی طرف جانے کے  
لیے بنایا گیا تھا۔

اکرم اس طرف پہلے کبھی دن میں بھی نہیں آیا تھا  
اور یہ تو رات کے کوئی نو دس بجے کا وقت تھا صاف  
آسمان پر پورا چاند اپنی پوری آب و تاب سے جگمگا  
رہا تھا۔ ہر طرف روشنی ہی روشنی بکھری ہوئی تھی۔  
چاند کی چاندنی سے اندھیرا کہیں دبک کر بیٹھ گیا تھا۔  
وہ اُس لمبی سڑک پر آہستہ آہستہ مردہ قدموں  
کے ساتھ چلتا ہوا نہر کے کنارے اُگی ہوئی گھاس پر  
جا بیٹھا۔ وہ قبول صورت نو جوان تھا اور اُس وقت  
غلے رنگ کی میلی جیکلی شلوار قمیص میں ملبوس تھا جیسے  
اس نے کافی دنوں سے کپڑے تبدیل نہیں کیے  
ہیں۔ اس کے بال بھی بکھرے اٹکھے ہوئے بے  
ترتیب سے تھے جبکہ اُس کے چہرے کی حالت بھی  
اچھی نہیں لگ رہی تھی، شیوہ بھی ہوئی تھی رنگت اڑی  
اڑی سی تھی جس پر پریشانی جھلک رہی تھی۔ وہ خاصا  
منظر ب اور بے چہین نظر آ رہا تھا۔

دراصل وہ ایک ناقابل علاج مرض میں مبتلا  
ہو گیا تھا۔ ایک ایسا مرض جس میں بندہ اپنے ہوش و  
حواس ہونٹھتا ہے۔ اس کا کھانا پینا پہننا اوڑھنا سب

کچھ ختم ہو جاتا ہے۔ اکرم کو بھی وہی بیماری لگ گئی  
تھی۔ اس بیماری کا نام تھا عشق و محبت..... اسے کسی  
سے محبت ہو گئی تھی اور اسی محبت میں مبتلا ہو کر وہ آج  
اس حالت کو پہنچ گیا تھا۔ یہ کوئی چھوٹا موٹا مرض تو نہیں  
تھا ہر زمانے میں ہر درد میں بہت سے بندے اس  
میں مبتلا ہوئے اور جنوں بنے دیوانے کہلائے۔

اپنی حالت اور اپنے ارد گرد سے بے خبر نہر  
کنارے بیٹھے اکرم نے نہر کے پانی میں چاند کے  
عکس کو دیکھا جو بخوبی صاف نظر آ رہا تھا۔ عکس کو تکتے  
تکتے اس نے اپنی گردن اٹھا کر ایک تک آسمان پر  
چمکتے ہوئے چاند کی طرف نظر دوڑائی جو تاروں کی  
جھلجھل کرتی ہوئی بارات میں بڑا ہی دلکش نظر آ رہا  
تھا۔ کافی دیر تک وہ یونہی آسمان پر چاند تکتا رہا۔ وہ  
نجانے کب تک اسی طرح چاند کو دیکھتا رہتا کہ کسی  
کے دوڑنے کی آواز پر وہ چونک پڑا۔ اس نے بے  
اختیار ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ جلد ہی چاند کی صاف  
شفاف چاندنی میں اس کی نگاہوں نے سفید کپڑوں  
میں ملبوس ایک لڑکی کو بھاگتے ہوئے دیکھا جس کے  
بال کھلے ہوئے تھے اور پاؤں میں چپل بھی نہیں تھی  
ننگے پاؤں بھاگتی ہوئی وہ لڑکی نہر پر بنے ہوئے اس  
شکستہ پل پر سے دوسری طرف قبرستان کی طرف  
بھاگ نکلی۔ رات کے اس عالم میں اس سنسان جگہ  
پر کسی لڑکی کا یوں بھاگتے ہوئے اس پر اسرار قبرستان  
کی طرف جانا جہاں لوگ دن کے وقت بھی جانے  
سے گھبراتے تھے۔ یہ منظر دیکھ کر یہی کہا جاسکتا تھا کہ  
وہ لڑکی کوئی بدروح یا ڈاؤن تھی اسے دیکھ کر اکرم کے  
جسم میں گویا سنسنی سی دوڑ گئی۔ خوف کی ایک لہر نے  
اسے کاپنے پر مجبور کر دیا۔ اس نے چاہا کہ وہ سر پر پیر  
رکھ کر یہاں سے بھاگ جائے۔ اپنے اس خیال کو  
عملی جامہ پہنانے کے لیے وہ بجلی کی سی تیزی سے  
نہر کے کنارے سے اٹھا ہی تھا کہ لڑکی کے دوبارہ



بھاگنے کی آواز نے اسے اپنی جگہ ساکت کر دیا۔ اس کے پاؤں جیسے سن ہو گئے، بھاگنے کی شدید خواہش کے باوجود بھی وہ اپنی جگہ کھڑا رہا۔ وہ لڑکی اب دوسری طرف نہر کے کنارے کھڑی ہوئی تھی پھر اس نہر میں چھلانگ لگانے کے لیے پرتولنے لگی۔ اکرم جو دوسرے کنارے پر کھڑا یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا اب اسے احساس ہوا کہ وہ کوئی روح نہیں بلکہ جیتی جاگتی گوشت پوست کی بنی کم عمر لڑکی تھی جو نہر میں چھلانگ لگا کر شاید اپنی زندگی کا خاتمہ کرنا چاہتی تھی۔ اس کا ڈر خوف یکدم ہی ہوا ہو گیا تھا۔

”اے لڑکی.....! رو.....“ اس نے چلا کر لڑکی کو اس کے ارادے سے باز رکھنا چاہا۔ اس کی آواز پر لڑکی بوکھلا کر اپنی جگہ جیسے جم سی گئی اور بے اختیار سامنے کی طرف دیکھنے لگی جہاں اسے ایک نوجوان کھڑا دکھائی دیا جو اسے نہر میں چھلانگ لگانے سے روک رہا تھا۔

”سک..... کون ہو تم؟“ وہ بوکھلاتی ہوئی تیز آواز میں بولی۔

”میں اپنے بارے میں تمہیں سب بتا دوں گا مگر تم نہر میں چھلانگ مت لگاؤ۔“ لڑکی نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور پھر نہر میں چھلانگ لگانے کے لیے پرتولنے لگی۔

”دیکھو، ٹھہرو، میری بات سنو یہ نہر بہت گہری اور خطرناک ہے، تم ڈوب کر مر بھی سکتی ہو۔“ اکرم نے اسے باز رکھنا چاہا۔

”تم..... تم ہوتے کون ہو مجھے روکنے والے؟“

مجھے تنگ مت کرو۔“ لڑکی پر جیسے جنون سوار تھا۔ یہ کہتے ہی اس نے آنا فانا نہر میں چھلانگ لگا دی۔ شرواپ کی نہایت تیز آواز گونجی اور لڑکی پانی میں غائب ہوئی چلی گئی۔ دوسرے کنارے پر کھڑا اکرم ہکا بکا کھڑا رہ گیا۔ ایک لمحے کے لیے تو اس کی سمجھ

میں ہی نہ آیا کہ کیا کرے پھر اگلے ہی لمحے اس نے بھی نہر میں چھلانگ لگا دی۔ وہ تیراکی جانتا تھا چنانچہ اس نے جلد ہی خاصی تنگ دود کے بعد لڑکی کو جا لیا۔ منہ میں پانی جانے کی وجہ سے لڑکی نیم بے ہوش سی ہو گئی تھی۔ وہ لڑکی کو ہاتھ سے تھامے جلد ہی کنارے پر لے آیا لڑکی اوندھے منہ پانی کی اٹلیاں کرنے لگی۔ اکرم اس کی پشت پر آہستہ آہستہ سے ہاتھ مارتا رہتا تھا کہ اس کے پیٹ سے سارا پانی نکل جائے۔ لڑکی کے منہ اور ناک سے بے تحاشہ پانی نکل رہا تھا۔ جلد ہی وہ لڑکی یونہی اوندھے منہ پڑی زور زور سے سانس لینے لگی پھر اکرم نے اس کی حالت جانچنے کے لیے جیسے ہی اسے سیدھا کیا تو وہ چونک پڑا۔ وہ غیر نہیں تھی بلکہ رانی تھی۔ رانی..... جو اس کی پہلی اور آخری محبت تھی۔

اکرم شمال میں واقع ریلوے کالونی میں رہتا تھا جو شہر کے تقریباً قریب ہی واقع تھی۔ اس کا باپ فیض دین ریلوے میں ملازم تھا۔ اکرم کا ایک بڑا بھائی اسلم تھا جو شہر کے اسکول میں چپرا سی لگا ہوا تھا۔ اسلم کی شادی ہو چکی تھی۔ اس کی بھابھی بہت سلیقہ مند اور پیار کرنے والی عورت تھی۔ اکرم کی ماں بچپن میں ہی اسے چھوڑ کر اگلے جہاں چلی گئی تھی اسی لیے وہ متا کے پیار سے ناواقف تھا۔ اس کا باپ صبح جاتا تو شام کو تھکا ہارا گھر لوٹتا۔ وہ سارا دن گھر میں اکیلا پڑا اپنے باپ کا انتظار کرتا رہتا۔ شاید اسی وجہ سے وہ زیادہ بڑھ لکھ نہ سکا۔ اس نے صرف پانچ جماعت تک ہی پڑھا تھا جبکہ اس کا بڑا بھائی اسلم دس جماعتیں پاس کر چکا تھا۔

فیض دین نے اسے اسکول میں داخل تو کر دیا تھا مگر اس کی تعلیم و تربیت پر توجہ نہ دے سکا۔ اکرم اسکول جانے کی بجائے سارا دن ریلوے کالونی کے بچوں کے ساتھ کھیلتا رہتا۔ اس میں اس کا چچا زاد

کزن مختار بھی ہوتا تھا۔ وہ دونوں سارا دن گلیوں میں آوارہ گردی کرتے اور شام کو اپنے گھروں کو واپس آ جاتے۔ باپ کی لاکھ مار پیٹ ہزار جتن کے باوجود بھی اکرم تعلیم حاصل نہ کر سکا۔ آخر باپ نے تنگ آ کر اسے ایک ورک شاپ میں لگا دیا۔ وقت اسی طرح گزرتا رہا جوانی آ گئی۔ اب وہ ماہر ملکنک بن چکا تھا۔ جوانی نے اسے زیادہ جذباتی بنا دیا، غصہ تو اس کی ناک پر ہی دھرا رہتا تھا۔ اب تو اس کے باپ اور بھائی نے بھی اسے کچھ کہنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ گھر میں اگر کسی کا لاڈلا تھا تو اپنی بھابھی کا جو اسے اپنے بچوں کی طرح پیار کرتی تھی مگر ایک روز اس کی آسودہ زندگی میں پیار کا ایک ایسا طوفان آیا جس نے اس کے دل و دماغ کا سکون ہمیشہ سے ختم کر کے رکھ دیا۔

رانی اس کی زندگی میں یوں شامل ہوئی کہ اسے اپنی زندگی کا حصہ محسوس ہونے لگی۔ کاجل سے بھری ہوئی اس کی غرائی کٹوہہ آنکھیں جنہیں دیکھ کر اسے پہلی بار احساس ہوا کہ واقعی زندگی خوب صورت ہے۔ رانی چند ہفتے پہلے ہی اپنے ماں باپ کے ساتھ اس ریلوے کالونی کے ایک خالی کوارٹر میں شفٹ ہوئی تھی۔ اس کا باپ مولوی ستار درس و تدریس کے شعبے سے منسلک تھا۔ وہ ایک دینی ادارے میں بچوں کو اسلامیات اور عربی پڑھاتا تھا۔ نوکری سرکاری تھی دوسرے شہر سے اس شہر میں تبادلہ ہوا تو رہائش کے لیے کرائے کا کوئی کوارٹر ملنا مشکل ہو گیا۔ کسی کے کہنے پر ادھر ریلوے کالونی میں انہیں کم کرائے پر دو کمروں کا ایک کوارٹر مل گیا جو کہ کافی عرصہ سے خالی پڑا ہوا تھا۔ انٹیشن ماسٹر سے سلام و دعا کی وجہ سے انہیں کچھ زیادہ مشکل بھی نہ ہوئی تھی۔

وہ دن اس کی زندگی کا خوب صورت ترین دن تھا جب وہ شام کو ورک شاپ سے اپنے گھر لوٹا تو اپنی گلی میں پہلی بار رانی کو دیکھا جو اپنے والدین کے

ساتھ سامنے سے چلی آ رہی تھی۔ سیاہ برقع میں خود کو اس طرح لپیٹے کہ آنکھوں کے علاوہ اس کے جسم کا کوئی حصہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ہر نی جیسی چلتی ہوئی اکرم کو وہ اتنی نازک لگی کہ مبادا وہ نزاکت سے کہیں گر ہی نہ جائے۔ اس ایک لمحے میں وہ اس کے دل کے کسی گوشے میں جا بیٹھی تھی۔ اس رات وہ پلنگ پر کروٹیں بدلتے ہوئے اس کے ہی خیالوں میں کھویا رہا۔ نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی وہ سونے کے لیے اپنی آنکھیں بند کرتا تو اس کا حسین سراپا اس کے سامنے آ جاتا۔ اس کی حسین آنکھیں وہ بھلا نہیں یاد رہا تھا۔ اس کی ساری رات کروٹیں بدلتے ہوئے گزرتی۔

اور پھر تو گویا یہ اس کا روز کا معمول بن گیا اور صبح اس کی آنکھیں سرخ اور سوجی ہوئی ہوتیں۔ یہ رات بھر جاگنے کا شاخسانہ ہوتا تھا۔ ایک دن اس کی بھابھی نے پوچھا۔

”اکرم! لگتا ہے تو رات کو ٹھیک طرح سے سو نہیں جاتا؟“ بھابی کے اس سوال پر وہ آئیں بائیں شائیں کر کے رہ جاتا۔ اکیلی بھابی ہی تھی جو اس کا خیال رکھتی تھی۔

اُس دن بھی وہ کچی نیند سے بیدار ہوا تو بھابھی کو اپنا منظر پایا۔

”اکرم! جلدی سے ناشتہ کر لے پھر مجھے برتن دھونا ہے اور جھاڑو بھی لگانا ہے۔“ اپنی بھابھی کی اتنی جلد بازی دیکھ کر وہ اس سے پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔ ”کیوں بھابھی! خیریت؟“ وہ چائے کا کپ اٹھاتا ہوا بولا۔

”ہاں! ہاں! خیریت ہی ہے، وہ ناں محلے میں میلاد ہے۔ اس کی وجہ سے جلدی کر رہی ہوں۔ میلاد میں شرکت کرنی ہے ناں۔“ ”اچھا!!“ اس نے ہنکار بھرا۔



”کس کے گھر ہے میلاد؟“ اس نے یونہی پوچھا۔  
 ”وہ..... ابھی چند دن پہلے جو مولوی صاحب  
 ریلوے کالونی میں آئے ہیں اُن کی بیوی نے کرایا  
 ہے۔ مجھے خاص طور پر آنے کی تاکید کی ہے۔“ اس  
 کی بھابی برتن اکٹھے کرتے ہوئے بولی۔  
 ”اچھا!“ یہ سب سن کر اس کی بانجھیں کھل  
 گئیں۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ بھی میلاد  
 میں چلا جائے تاکہ ایک جھلک رانی کی دیکھ لے جس  
 نے اس کی راتوں کی نیند اور دن کا چین چھین لیا تھا۔  
 ”بھابی، صرف عورتوں کو ہی بلایا ہے؟“ وہ بے  
 دھیانی میں کہہ گیا۔

”تو..... تو..... جھلا ہی ہے ارے عورتوں کا  
 میلاد ہے تو عورتیں ہی جائیں گی۔“ بھابی نے ہنستے  
 ہوئے کہا۔

”میں تو ویسے ہی.....“ وہ شرمندہ ہو گیا پھر اس  
 کی بھابی گھر کے کام نمنا کر پڑوس میں چلی گئی تھی۔  
 وہ اس روز دکان بھی نہیں گیا۔ بھابی کے انتظار میں  
 گھر پر ہی بیٹھا رہا کیونکہ اسے رانی کے متعلق کچھ نہ  
 کچھ جاننا بھی تو تھا۔ سہ پہر تک بھابی کی واپسی  
 ہوئی وہ اسے گھر میں ہی موجود دیکھ کر حیران رہ گئی۔

”اکرم آج دکان پر نہیں گیا؟ تیری طبیعت تو  
 ٹھیک ہے نا؟“ بھابی نے تشویش سے پوچھا۔

”ہاں..... بس..... ویسے ہی.....“ اس سے  
 کوئی جواب نہ بن پایا۔

”اچھا.....“ وہ دھیرے سے بولی۔  
 ”بھابی، تم نے بڑی دیر لگا دی؟“ وہ تو بے  
 صبری سے بھابی کی آمد کا ہی منتظر تھا۔

”میلاد میں دیر تو ہو ہی جاتی ہے۔ ساری کالونی  
 کی عورتیں جمع تھیں وہاں۔ مولوی صاحب کی بیوی  
 زبان و بیان کی اتنی میٹھی کہ دل خوش ہو گیا۔ میلاد  
 میں بھی بڑا ہی روحانی سکون ملا۔“ بھابی مختصر آجتا کر

چپ ہو گئی۔

”اور..... بس.....“ وہ تو کچھ اور جاننے کا  
 مشتاق تھا۔

”اور کیا بڑے ہی اچھے لوگ ہیں ایک ہی بیٹی  
 ہے، وہ بھی لاکھوں میں ایک، چندے آفتاب چندے  
 ماہتاب ہے، شرم و حیا کی پیکر۔ پورے میلاد میں  
 نظریں جھکا کر بڑے ادب و احترام سے بیٹھی رہی۔  
 مجال ہے کہ آنکھ اٹھا کر کسی کی طرف دیکھا بھی ہو۔  
 اتنی شریف، حیا دار لڑکی اب بھلا کہاں ملتی ہیں۔  
 کالونی کی ساری عورتیں ماں بیٹی کی تعریف کرتے  
 نہیں تھک رہی تھیں۔“ بھابی نمنا آنے لگی کیا کیا  
 بولے جا رہی تھی مگر وہ تو بس رانی کے خیالوں میں  
 کھوسا گیا۔ اتنی تعریف سننے کے بعد اسے دیکھنے کی  
 چاہ نے اس کے دل کی آج کو شعلہ بنا دیا تھا۔ اس کا  
 بس نہیں چلتا تھا کہ وہ کسی طرح اس کا ایک دیدار ہی  
 کر لے۔ اچھی بات تو یہ تھی کہ اس نازنین کا گھر اس  
 کے گھر کے بالکل سامنے تھا۔ اس کو صرف دیکھنے کی  
 چاہ میں وہ گلی کے نمنا آنے لگے چکر لگاتا، کبھی اپنی  
 چھت پر چڑھتا، کبھی اپنے دروازے میں کھڑا ہو  
 جاتا مگر سب بے سود۔ اب اس کا دل مایوس ہو کر  
 جلنے لگا تھا۔ وہ پردے کی بڑی پابند تھی۔ آخر مولوی  
 کی بیٹی تھی۔ ان کے ہاں سخت پردہ تھا۔ اس محبت نے  
 اسے کسی کام کا نہ چھوڑا تھا۔ ہر کام سے اس کا گویائی  
 ہی اٹھ گیا تھا۔ اس نے دکان پر بھی جانا کم کر دیا تھا  
 اور اپنے آپ پر بھی توجہ دینا چھوڑ دی تھی۔ بڑھی شیو  
 اچھے بالوں، گندے کپڑوں میں وہ اب مجنوں سا  
 لگنے لگا تھا۔ بھابی اس کی حالت دیکھ کر پریشان  
 ہوتی رہتی تھی۔ باپ بھائی کو بھی اس کی فکر لاحق  
 ہونے لگی تھی اس کی یہ اجڑی ہوئی حالت سب ہی  
 کے لیے فکر کا باعث تھی۔ پہلے وہ اپنے آپ پر غور  
 توجہ دیتا تھا حالانکہ اس کا کام ورک شاپ کا تھا مگر پھر

بھی وہ خوش تھا لیکن اب اس کے گھر والے پریشان  
 اور نگر مند رہنے لگے تھے۔ سب کے لاکھ پوچھنے  
 پر بھی چپ کا تالا اس کے ہونٹوں پر لگا رہتا تھا۔ ہر  
 وقت خیالوں میں مگن اکرم کو بس رانی کے دیدار کی ہی  
 تمنّا تھی کہ اس روز اس کی تمنّا پوری ہو گئی۔

ایک دوپہر اس نے اس نازنین کا دیدار کر ہی  
 لیا، وہ اپنی چھت سے کپڑے اتارنے آئی تھی۔ اکرم  
 معمول کی طرح دکان سے جلدی آ کر چھت پر کھڑا  
 اسے دیکھنے کی چاہ میں تھا۔ وہ اس کی طرف پشت  
 کیے ہوئے کھڑی تھی۔ اس کے سیاہ گھٹے، لمبے بال کمر  
 پر بکھرے ہوئے تھے۔ وہ پھول دار گلانی رنگ کی  
 فرّاک اور پاچاے میں ملبوس تھی۔ اسے دیکھ کر اکرم  
 کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا لیکن وہ اس کا چہرہ  
 نہیں دیکھ پایا تھا۔ رانی اس بات سے بے خبر کہ کوئی  
 نوجوان اسے دیکھ رہا ہے، وہ اپنے کام میں مصروف  
 تھی۔ اکرم کو فکر کھئی کہ کہیں وہ ایسے ہی نیچے نہ اتر  
 جائے۔ آخر دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس نے ہلکی  
 سی سیٹی بجا کر اس کو متوجہ کرنے کی کوشش کی۔ رانی  
 جو کپڑے اتار کر ان کو نیچے لے جانے کی فکر میں تھی،  
 سیٹی کی آواز پر اس نے چونک کر پلٹ کر دیکھا  
 دوسری چھت پر ایک نوجوان کو اپنی طرف متوجہ پایا تو  
 وہ بولکھائی۔ اسی بولکھاٹ میں وہ سر پر دو پیڑ درست  
 کرتے ہوئے کپڑوں کو وہیں چھوڑ کر تیزی سے  
 بھاگتی ہوئی نیچے اتر گئی۔ اکرم کو احساس ہوا اس نے  
 رانی کو متوجہ کرنے کے لیے کوئی مہذب طریقہ نہیں  
 اپنایا تھا۔ پتا نہیں، وہ کیا سمجھی اور چھت سے چلی  
 گئی۔ وہ یہی سوچتا ہے آپ کو کوسٹار لیکن بہر حال  
 وہ رانی کا دیدار کرنے میں تو کامیاب ہو ہی گیا  
 تھا۔ اسے دیکھ کر اسے اپنی بھابی کی بات کی نفی کرنا  
 پڑی۔ بھابی نے اسے چندے آفتاب چندے  
 ماہتاب کہا تھا لیکن وہ تو اس سے بھی بڑھ کر حسین اور

دلکش تھی۔

دوپہر کا وقت تھا، چھت پر گرمی بے تحاشہ تھی پھر  
 وہ جانے کب سے اوپر کھڑا گرمی میں کوئلہ ہو رہا تھا۔  
 رانی کے جاتے ہی وہ سینے میں شرابور تیزی سے نیچے  
 آیا تو اپنے کزن مختار کو اپنا منتظر پایا۔ وہ کافی دنوں  
 بعد اس کے گھر آیا تھا۔

”ارے مختار تو کافی دنوں بعد چکر لگایا، کیا یہی  
 دوستی ہے کہ بندہ دوسرے کو شکل دکھانا ہی بھول  
 جائے؟“ اس نے مختار سے گلے لگ کر شکوہ کیا اور  
 اسے اپنے کمرے میں لے آیا۔

”اچھا تو“ تو ایسے کہہ رہا ہے کہ جیسے روز مجھ سے  
 ملنے آتا ہو۔ میرے کام دھندے کا تو تجھے پتا ہی ہے  
 فرصت ہی نہیں ملتی۔“ مختار سبزی منڈی میں ریڑھی  
 لگاتا تھا۔ صبح سویرے نکلتا اور شام تک گھر لوٹتا تھا۔  
 ”اچھا چھوڑ“ تو کہاں گم ہے اور یہ حلیہ کیا بنایا ہوا  
 ہے؟“ مختار نے اس کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

”کیا مطلب؟ کہاں گم ہوں؟ یہیں ہوتا ہوں“  
 میں نے کہاں جانا ہے۔“ اس نے کندھے اچکائے۔  
 ”وہی تو پوچھ رہا ہوں، ہر وقت گھر پر پڑے  
 رہتے ہو، کام پر کیوں نہیں جاتے؟ بھابی گھر آئی  
 تھی وہ بتا رہی تھی کہ آج کل تیری حالت عجیب سی ہو  
 رہی ہے۔ نہ کھانے پینے کا ہوش نہ سپنے اوڑھنے کی  
 پروا، دیوانے سے بنے پھرتے رہتے ہو، آخر کیا  
 معاملہ ہے؟“

”نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں۔“ وہ نظریں  
 چراتے ہوئے بولا حالانکہ اسے معلوم تھا مختار سے  
 کچھ چھپانا محال تھا۔ ”وہ..... بھابی تو بس ایسے  
 ہی.....“

”ایسے تو کچھ نہیں ہوتا، کہیں کوئی چکر  
 وکر..... اوئے..... تجھے عشق تو نہیں ہو گیا؟ کروت  
 تو تیرے یہی بتا رہے ہیں۔“ مختار نے جیسے اس کی



## خوف

”کچھ سنا بھی تم نے! ہمارے پڑوسی کی بیوی پچھلے ہفتے بھاگ گئی اور دوسرے ہی دن وہ بھی گھر چھوڑ کر فرار ہو گیا۔“

”وہ کیوں؟“

”ڈرتا تھا کہ کہیں بیوی واپس نہ آجائے۔“

کامران فیصل۔ ملتان

چوری پکولی۔

”اچھا جس کو عشق ہو جاتا ہے اس کی حالت میری طرح ہو جاتی ہے کیا؟“ اکرم نے بولنا ہٹ سے پوچھا جبکہ اس کا جواب خود اس کے پاس تھا۔ ”ہاں اس کی حالت بالکل ایسی ہو جاتی ہے جیسا اب تو ہے۔“ مختار نے ہنسنے لگا۔

”اچھا! زیادہ بکواس نہ کر۔“ وہ ناراض سا ہو گیا۔ ”چل ٹھیک ہے مذاق چھوڑتے ہیں۔ اب سچ سچ بتا، کون ہے وہ خوش قسمت جو ہمارے شہزادے کو دیوانہ کر گئی ہے؟ اس نے تو کسی کام کا نہیں چھوڑا تھا۔“

”میں تجھے سب بتا دوں گا مگر دیکھ تو کسی کو بتائے گا تو نہیں ناں؟“ وہ رازدارانہ لہجے میں بولا۔ ”قسم لے لے کسی کو نہیں بتاؤں گا۔ چل تیری قسم۔“ مختار نے اس کے سر پر ہاتھ مارا۔

”پھر مذاق جا میں نہیں بتاتا۔“ وہ خفا ہو گیا۔ ”اچھا..... اچھا..... اب مذاق ختم۔ اب بتا۔“ مختار بے چینی سے بولا۔

”وہ..... اس ریلوے کالونی میں چند ہفتے پہلے جو مولوی ستار آئے تھے ناں ان کی بیٹی ہے رانی، بس اسے ایک نظر دیکھتے ہی جانے مجھے کیا ہو گیا ہے کسی پل چین نہیں۔“ اکرم اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔ مختار اس کا منہ تکتا رہا اور پھر زوردار قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔

”اوئے ہوئے جناب کے ابھی سے ایسے پلان ہیں میں ابھی یہ بات جا کر موجودہ بھابھی کو بتا دوں ہونے والی بھابھی کو بعد میں دیکھیں گے۔“ مختار اٹھ کر کمرے سے باہر جانے لگا۔ ”دیکھ مختار تو نے مجھے قسم دی ہے۔“ وہ گھبرا کر بولا۔

”میری قسم تیرے گھونے سے ٹوٹ چکی ہے۔ میں تو چلا۔“ وہ نکلنے کی کوشش کرنے لگا تو اکرم اسے پکڑنے کے لیے پیچھے بھاگا تو اپنی بھابھی کو دروازے کی اوٹ میں کھڑے پایا۔ بھابھی نے ان دونوں کی تمام باتیں سن لی تھیں۔ اس نے اس وقت اکرم سے کوئی بات نہیں کی، بس غصے سے وہاں سے چلی گئی مگر شام کو اس کے باپ اور بھائی کو سب کچھ بتا دیا۔ باپ نے اسے خوب ڈانٹا۔

”یہ تمہی شریف زادے کے کام ہیں جو تو کرتا پھر رہا ہے؟ میری عزت کو خاک میں ملانے پر تلا ہوا ہے۔ کوئی کیا کہے گا کہ فیض دین کا بیٹا یہ کام کر رہا ہے؟ میری کیا عزت رہ جائے گی اس کالونی میں؟ اور پھر وہ مولوی ستار کیا سوچے گا، کیسے گندے لوگ ہمارے پڑوسی ہیں، کسی کی بہن بیٹی کا لحاظ نہیں کرتے۔“

نجانے کتنی دیر اس کا باپ اس کو کھری کھری مانتا رہا۔ بعد میں وہ کافی دیر اپنے کمرے میں پڑا رہا اس نے رات کا کھانا بھی غصے میں نہیں کھایا تھا اور کسی کو بتائے بغیر وہ گھر سے اتنی دور ادھر نکل آیا تھا۔

وہ جانے کب سے اپنی سوچوں میں گم تھا کہ رانی کے تیز کھانسنے کی آواز پر وہ جیسے ہوش میں آ گیا۔ اس نے رانی کے چہرے کو غور سے دیکھا، چاندنی شفاف چاندنی میں اس کا چہرہ دودھ سے بھی زیادہ ہوا لگ رہا تھا۔ وہ واقعی دیوالائی حسن کی

مالک تھی۔ اکرم نے آج پہلی بار اسے اتنے قریب سے دیکھا تھا۔

کھانسی سے بے حال رانی کو بھی اچانک احساس ہوا کہ کوئی اس کے بہت قریب ہے اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا وہی اجنبی لڑکا اس کے قریب بیٹھا نظر آیا جو اسے نہر میں چھلانگ لگانے سے روک رہا تھا۔

”کک..... کک..... کون..... کون ہو تم؟“ وہ ہراساں سی بولی اور آہستہ آہستہ گھاس پر پیچھے کی طرف سرکنے لگی۔

”میرا نام اکرم ہے۔ ڈرو نہیں.....“ اکرم اسے سمجھانے کے لیے اس کی طرف بڑھا۔ ”دیکھو میرے قریب مت آؤ۔“ وہ بے حد خوف زدہ لگ رہی تھی۔

”دیکھو میں کہہ رہا ہوں ناں کہ ڈرو نہیں۔ میں وہیں ریلوے کالونی میں ہی رہتا ہوں جہاں تم رہتی ہو اور میرا گھر تمہارے گھر کے سامنے ہی ہے۔ میں فیض دین کا بیٹا ہوں۔ تم جانتی ہونا؟“

”میں..... میں..... چاہتا نہیں۔“ وہ انک انک کر بولی اور اکرم کو غور سے دیکھنے لگی۔

”میں نے ہی تمہیں بچایا ہے، اگر میں نہ ہوتا تو تم ڈوب جاتیں.....“ اکرم کو اب اس پر غصہ آ رہا تھا۔ وہ اپنی جان کے درپے تھی حالانکہ وہ اس کی جان تھی۔

”تم نے مجھے کیوں بچایا؟ مرنے دیا ہوتا میں اسی قابل تھی کہ مر جاتی.....“ رانی اب زور زور سے رونے لگی۔



اسے دیکھا۔

”ہاں رانی، وہ میں ہی ہوں جو تمہارے بنا جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتا اور تم ہو کہ جینا ہی نہیں چاہتیں۔ آخر ایسا کیا ہوا ہے تمہارے ساتھ؟“ اکرم نے دل کی بات رانی کو بتا دی۔

رانی پھر رونے لگی۔

”میں نہیں جینا چاہتی، مجھے مرنا ہے..... شاید مرکز بھی مجھے سکون نہ ملے، میں جی کر اب کیا کروں گی؟“

”رانی، مجھے بتاؤ تمہارے ساتھ کیا ہوا ہے؟“ اکرم پیار بھرے لہجے میں بولا۔

”جس لڑکی کی عزت ہی نہ رہی ہو وہ بھلا جی کر کیا کرے گی؟“

”کیا مطلب؟“ اکرم کے لیے یہ بات کسی دھماکے سے کم نہیں تھی۔

”کسی نے میری عزت تار تار کر دی، میری عزت کا جنازہ نکال دیا۔ میں روتی رہی، فریاد کرتی رہی مگر.....“

”یہ..... یہ..... سب..... کیسے؟“ میرا مطلب.....“ اکرم کو لگا جیسے کسی نے اس کی جان کو مٹھی میں ڈال لیا ہو۔ اس کا وجود سن سا ہو گیا تھا۔

”آج میں گھر میں اکیلی تھی، میرے ماں باپ ایک شادی میں شہر سے باہر گئے ہوئے تھے۔ دوپہر سے شام اور پھر رات کی تاریکی بڑھنے لگی۔ میں اکیلی دروازہ بند کر کے کمرے میں دبی ہوئی بیٹھی تھی کہ دروازے پر زور سے دستک ہوئی۔ میں سمجھی کہ

میرے ماں باپ واپس لوٹ آئے ہیں، میں نے دروازہ کھولا مگر..... وہ کوئی لمبے قد، گھٹگریا لے بالوں والا آدمی تھا جس کی بڑی بڑی سیاہ موچیں تھیں وہ

زبردستی مکان میں گھس آیا اور پھر.....“ اس سے آگے رانی کچھ نہ کہہ سکی اور تھر تھر کانپنے لگی۔

”میری عزت لوٹ کر وہ مجھے مارنا چاہتا تھا۔

میں بڑی مشکل سے اپنی جان بچا کر ادھر بھاگ آئی ہوں..... تم..... تم..... مجھے بچالو! آکر وہ آدمی ادھر آ نکلا تو.....“ خوف سے رانی کا وجود خشک پتے کی طرح

لرز رہا تھا۔ اکرم کو لگا جیسے اس کا دماغ پھٹ جائے گا۔ وہ کافی دیر تک خود فراموشی کے عالم میں بیٹھا

رہا۔ رانی بھی سکاریاں لینے لگی۔

”کون تھا وہ حرام زادہ؟ کیا تم اس کو پہچانتی ہو؟“ اکرم کا دل چاہا کہ وہ اس کہنے کے ٹکڑے

ٹکڑے کر دے۔ اچانک ہی اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔

”میں..... نہیں..... مجھے نہیں پتا.....“ رانی گم صم صی بولی اور پھر اچانک اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔

”مجھے گھر جانا چاہیے۔ میری اماں میرا انتظار کر رہی ہوگی۔ تم مجھے گھر تک چھوڑ دو گے؟“ وہ اسے امید

بھری نظروں سے دیکھنے لگی۔ وہ بنا جواب دیئے اس کے ساتھ چل دیا۔

”تم میرے اماں بابا کو کچھ مت بتانا ورنہ وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔“

”نہیں، میں انہیں کچھ نہیں بتاؤں گا۔“ اکرم کو رانی کی معصومیت پر پیار آنے لگا، بھلا ایسی باتیں

چھپائے چھپتی ہیں۔

”تم بہت اچھے ہو۔“ وہ اسے دیکھ کر مسکرا دی۔

”تم میرا کہنا مان لیتے ہو۔“ وہ خوشی سے تالیاں بجانے لگی۔ غم کی شدت سے شاید وہ اپنا ذاتی توازن

کھو بیٹھی تھی اس کا انداز بالکل بچوں جیسا تھا۔

”تم اس بندے کو بھی خوب مارنا بلکہ اس کی گردن مروڑ دینا“ ایسے..... ایسے.....“ وہ ہاتھوں سے اکرم کو آہستہ آہستہ مارتے ہوئے بولی۔ ”مارو گے ناں؟“ وہ بالکل بچی سی بن گئی تھی۔

”ہاں ہاں، بس وہ ایک بار مل جائے۔“ اکرم

واقعی غصے سے کانپنے لگا۔

بچی پگھلندی پر وہ دونوں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے کہ ایک موٹر

مڑتے ہی اچانک ان کے سامنے مختار آ گیا۔ رانی، اکرم کے تھوڑے پیچھے تھی اس لیے مختار اس کو نہیں

دیکھ سکا۔

”ارے اکرم، کہاں غائب ہو گیا تھا؟ میرے پار، ہم سب تجھے..... جوٹ ڈھونڈ کر پاگل ہو گئے ہیں“ کتنے پریشان ہیں تیرے گھر والے، سارا ریلوے

کالونی جھان مارا پھر میں تجھے ڈھونڈتا ہوا ادھر آ نکلا۔ اب چل میرے ساتھ۔“ مختار اس کا ہاتھ

پکڑنے کے لیے آگے بڑھا مگر عقب میں ایک لڑکی کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ رانی کی نظر جیسے ہی مختار پر پڑی

وہ چلا آگئی۔

”یہی ہے وہ..... یہ بد معاش وہی ہے۔“ کانپتے جسم کے ساتھ وہ ہڈیاں انداز میں پیچنے لگی۔

”مجھے مارنے ادھر بھی آ گیا.....“ اکرم کے لیے یہ سب ناقابل یقین تھا۔ مختار بھی بوکھلا سا گیا تھا۔

”رانی، کیا کہہ رہی ہو؟ ہوش کر دے، میرا کزن مختار ہے یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ اکرم تیزی سے بولا۔

”میرا یقین کرؤ خدا کی قسم یہی بندہ تھا، میں..... میں سچ کہہ رہی ہوں۔“ وہ زور زور سے چلانے لگی۔

”یہ کون ہے اور میرے متعلق کیا کہہ رہی ہے؟“ رانی کے یوں چیخنے چلانے سے مختار گھبرا گیا

تھا۔

”تم..... تم..... بے غیرت انسان، آستین کے سانپ.....“ اکرم نے اس کا گریبان پکڑ کر تین چار

پھڑاس کے منہ پر بڑبڑائیے پھڑاتنے زور کے تھے کہ وہ ہلکا کر مرٹ کر گر گیا۔

”کیا کر رہے ہو تم؟ مجھے کیوں مار رہے ہو؟“ مختار شدید غصے میں آ گیا تھا۔

”تو نے میری زندگی تباہ کر دی اسی لیے تجھے

اپنی محبت کے بارے میں بتایا تھا کہ تو مونی پا کر میری محبت کو برباد کر دے۔“ اکرم نے اسے لاتوں

پر رکھ لیا۔ ”بول، ایسا کیوں کیا تو نے؟ تو نے رانی کی عزت پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کیسے کی؟“ اکرم اسے

بری طرح مار رہا تھا۔

”یہ کیا کہہ رہا ہے تو؟ میں نے ایسا نہیں کیا، میں تو تجھے ڈھونڈتے ڈھونڈتے یہاں آیا ہوں۔“ مختار کے منہ ناک سے خون جاری ہو گیا تھا۔ مار کھا کھا کر

وہ ادھ مواسا ہو گیا تھا اور برابر چیخ رہا تھا۔

”جھوٹ مت بول مختار میں تجھے وہ سزا دوں گا جس کا تو نے سوچا بھی نہ ہوگا۔“ اس نے آگے بڑھ کر مختار کا منہ زور سے نوچ لیا۔

”دیکھ اکرم، میں تیرا دوست ہوں، تیرا چچا زاد بھائی بھی ہوں تو مجھے.....“ وہ آگے بولنا چاہتا تھا مگر

درد کی شدت سے بول نہ سکا۔

”تجھے مرنا ہوگا، تیری موت سے میرے اندر لگی انتقام کی آگ ٹھنڈی ہوگی۔“ اکرم نے اب پاس

پڑا زنی پتھر اٹھالیا تھا اور آٹا ٹاٹا مختار کے سر پر دے مارا۔ مختار نے اسے روکنے اور اس پتھر سے بچنے کی

بہت کوشش کی مگر اس کی کوشش بے سود رہی، پتھر نے اس کے سر کو چل کر رکھ دیا، نہایت ہولناک چیخ مختار

کے منہ سے نکلی اور پھر خاموشی سی چھا گئی۔ مختار مر چکا تھا۔ اکرم نے اپنی آستین سے اپنے منہ پر لگے مختار

کے لہو کے چھینٹے صاف کیے۔

رانی ایک طرف کھڑی سب کچھ دیکھ رہی تھی مگر وہ اب بھی خوف زدہ نظر آ رہی تھی۔

”رانی.....! تیرا مجرم اپنے انجام کو پہنچ گیا ہے، میں نے مار دیا اسے.....“ اکرم نے جوش سے کہا مگر رانی کچھ نہ بولی۔

پھر دونوں خاموشی سے کافی دیر تک چلتے رہے



## ملی نغمہ

چاند تاروں سے روشن ہمارا وطن  
یہ ہمارا وطن پیارا پیارا وطن  
اس پہ رحمت خدا کی ہے سایہ گلن  
یہ ہمارا وطن پیارا پیارا وطن  
عزم و جہد و عمل نے بہاراں کیا  
یاں شہیدوں کے خوں نے چراغاں کیا  
کتے پر نور ہیں اس کے کوہ و دمن  
یہ ہمارا وطن پیارا پیارا وطن  
محتوں کے اثر سے چن کھل اٹھے  
یاں پسینے کے قطرے سے سونا بنے  
غنچہ غنچہ پہ آئی ہے کیسی ہنسن  
یہ ہمارا وطن پیارا پیارا وطن

صفیہ سلطانہ

اور اپنے محلے ریلوے کالونی کے بہت قریب جا  
پہنچے۔ رات کافی بیت چکی تھی چاند اب بھی اسی طرح  
اپنی چاندنی ہر طرف بکھیر رہا تھا۔ اسی وقت اکرم کو  
ریلوے کالونی سے ایک مرد اور عورت اپنی طرف  
آتے ہوئے نظر آئے۔ جیسے ہی وہ قریب پہنچے اکرم  
نے انہیں فوراً پہچان لیا، وہ رانی کے ماں باپ تھے۔  
وہ دونوں شدید گھبرائے ہوئے خاصے پریشان لگ  
رہے تھے۔ پاس آنے پر دونوں نے پہلے اکرم کو  
دیکھا اور پھر اپنی بیٹی کو گھورا۔  
”اری او کم بخت..... کہاں بھاگ گئی تھی؟

والدین کی عزت مٹی میں ملانے پر تلی ہوئی ہے؟“  
اس کی ماں اسے بری طرح مارنے لگی۔

اکرم سے رہا نہ گیا، اس نے رانی کو اس کی ماں  
سے چھڑوایا۔

”اے اس طرح کیوں مار رہے ہو؟ اس کا کوئی  
قصور نہیں ہے۔“

”تم..... تم..... میری بیٹی کے ساتھ اس وقت  
کیا کر رہے ہو؟“ مولوی ستار جانتا تھا کہ وہ فیض  
دین کا بیٹا ہے۔ ”سچ بتاؤ نے کہیں میری بیٹی کے  
ساتھ کچھ ایسا ویسا.....“ مولوی ستار نے اکرم کو  
گریبان سے پکڑ لیا۔ ”بول میں تیری جان لے لوں  
گا۔“

”میں نے تمہاری بیٹی کے ساتھ کچھ نہیں کیا بلکہ  
میں نے تو اس کی جان بچائی ہے۔ یہ نہر میں ڈوب  
کر مرنا چاہتی تھی۔ میں نے نہر سے اسے نکالا ہے اور  
آپ مجھے گواہی دے رہے ہو؟“ اکرم نے مولوی  
کے ہاتھ سے اپنا گریبان پھراتے ہوئے کہا۔  
”اس پر کیا بیت گئی ہے؟ کچھ خبر بھی ہے آپ  
کو؟“

”کیا مطلب؟“ مولوی اور اس کی بیوی دونوں  
بے اختیار بول پڑے۔

”سنئے گا حوصلہ ہے آپ دونوں میں؟“ اکرم  
نے دونوں کے چہروں کو دیکھا۔  
رانی ایک طرف کھڑی آہستہ آہستہ سسکیوں  
سے روئے جا رہی تھی۔

”کیا پہیلیاں بھجوا رہے ہو لڑکے؟ صاف  
صاف بتاؤ۔“ مولوی کا لہجہ سخت تھا۔

”جلدی بتاؤ میرا تو دل بیٹھا جا رہا ہے۔“  
مولوی کی بیوی بھی خاصی بے تاب سے بولی۔

”آپ دونوں میاں بیوی تو دوپہر کو کسی شادی  
میں شرکت کے لیے باہر گئے ہوئے تھے اپنی بیٹی کو کدھ

پر کیا چھوڑ کر۔ پچھلی رات موقع پا کر کسی نے تمہاری  
بیٹی کی عزت تار تار کر دی اور پھر اسے جان سے مارنا  
چاہتا تھا۔ یہ اپنی جان بچا کر ادھر اٹنگی اور مجھے مل  
گئی۔“ اکرم نے اپنے کزن مختار کا نام نہیں بتایا۔  
”لیکن وہ بندہ بھی ادھر اس کو مارنے چلا آیا، پر میں  
نے اسے اس کے انجام تک پہنچا دیا۔ اسے ایسی  
موت دی کہ سالہا مرنے کے بعد بھی تڑپتا رہے گا۔“  
اکرم نے تھوک نگتے ہوئے ساری بات کہہ دی۔

”اوہ.....!“ مولوی کے منہ سے بے اختیار  
نکلا۔ ”کیا تم نے اسے مار دیا؟ یہ تم نے اچھا نہیں  
کیا۔“ مولوی کی حالت دیکھنے کے قابل تھی۔

”کیا!! جس نے تمہاری بیٹی کے ساتھ یہ سلوک  
کیا اس کو موت کے گھاٹ اتار کر میں نے اچھا نہیں  
کیا۔ اگر موت سے بھی کوئی بڑی سزا ہوتی تو میں اس  
کینے کو دیتا۔ مولوی صاحب.....! آپ کی سوچ  
پر مجھے حیرت ہو رہی ہے۔“

”حیران تو میں بھی ہوں۔“ مولوی ایک انک  
کر بولا۔ ”کہ تم نے میری بیٹی کی باتوں پر یقین کر  
لیا؟ تم نے بہت ہی برا کیا۔“

”میں سمجھا نہیں.....“ اکرم کو ابھدا سالگا۔

”میری بیٹی دماغی مریضہ ہے..... اس کے  
دماغ میں کوئی نقص ہے جس کی وجہ سے یہ اوٹ  
ٹانگ باتیں کرتی رہتی ہے، من گھڑت کہانیاں  
سناتی ہے یہ اپنے ہوش و حواس میں نہیں رہتی بالکل  
پاگل ہو جاتی ہے۔ یہ کیفیت اس وقت زیادہ ہو جاتی  
ہے جب چاند پورا ہوا اس لیے پورے چاند کی راتوں  
میں اسے ہم گھر میں باندھ کر رکھتے ہیں لیکن آج  
غلطی سے یہ موقع دیکھ کر باہر بھاگ گئی۔ ہمیں بڑی  
فکر ہو رہی تھی کہ یہ یہ پاگل پن میں کہیں اپنے آپ کو  
بھونک دے۔“ اکرم کو یقین نہیں آ رہا  
تھا کہ بچہ کچھ اس نے سنا، وہ واقعی درست تھا؟

”نہیں، یہ نہیں ہو سکتا، کہہ دو، یہ سب جھوٹ  
ہے.....“ اس نے مولوی کو جھنجھوڑ ڈالا۔

”یہی سچ ہے، ہم کب سے اسے ڈھونڈ رہے  
تھے۔ تم نے ناحق ایک انسان کی جان لے لی۔“  
مولوی نے افسوس سے کہا۔ اکرم نے رانی کو دیکھا جو  
اپنی انگلیاں مروڑتی، اپنے بالوں کو نوچتی، بالکل پاگل  
لگ رہی تھی۔ اکرم کے ذہن میں فوراً ایک خیال  
آ گیا۔ رانی نے جس آدمی کا حلیہ بتایا تھا، اس حلیے  
والے آدمی کا قد لمبا، بال گھنگھریالے اور گھنی مونچھیں  
تھیں جبکہ مختار کا قد چھوٹا، بال سیدھے اور مونچھیں تو  
اس کی تھیں ہی نہیں۔ اسی وقت وہاں سے ایک بوڑھا  
دودھ والا سائیکل پر سوار گزرا، وہ ریلوے کالونی میں  
دودھ بیچتا تھا۔ رانی کی نگاہ اس پر پڑی تو اس کی  
حالت خراب سی ہونے لگی۔ وہ ہذیبائی کیفیت میں  
ایک بار پھر چلائے لگی۔

”یہی ہے وہ..... یہی وہ بندہ ہے.....“  
رانی اسی طرح چلا رہی تھی جیسے مختار کو دیکھ کر چلائی  
تھی۔

اکرم کو لگا جیسے زمین اس کے پاؤں کے نیچے  
سے نکل رہی ہو۔ اسے مختار کا خیال آیا۔ رانی کی  
باتوں میں آ کر اس سے ایسی غلطی ہو گئی تھی جس کی  
تلافی ممکن نہیں تھی۔ وہ تیزی سے اسی طرف بھاگا  
جہاں مختار کی لاش پڑی تھی کہ اچانک ایک طرف  
سے آتی ہوئی تیز رفتار کار کی زد میں آ گیا اور اچھل کر  
دور زمین پر جا گرا۔ کار کی شدید ٹکر جان لیوا ثابت  
ہوئی تھی۔ اکرم پر موت کا اندھیرا اچھانے لگا۔ اپنی  
بند ہوئی آنکھوں سے آخری بار اس نے آسمان کی  
طرف نگاہ دوڑائی جہاں چاند پوری آب و تاب سے  
چمک رہا تھا اور پھر اس کی گردن ایک طرف ڈھلک  
گئی.....

☆ ☆ ☆



# قدرت کا انتقام

انٹرنل

”زرخان ابھی بھی غصے سے چارپائی پر بیٹھا تھا ماں ڈرتے ڈرتے بہت ہی منت سماجت کر کے اس کے ہاتھ سے گن لے کر جیسے ہی دوسرے کمرے میں رکھنے گئی زرخان نے چارپائی سے اٹھ کر کمرے میں جا کر نتاشا کو لاتوں اور مکوں سے مارنا شروع کر دیا ماں دوڑتی ہوئی بیٹی کو بچانے آئی“

تھری جگ ہی چار سے



پچھلی رات محلے میں ارباز خان کے گھر چوری ہو گئی تھی۔ اس نے ایف آئی آر درج کراتے وقت بنا کسی جھجک کے اپنے پڑوسی لعل خان کے بیٹے زرخان کا نام درج کروایا تھا۔ زرخان علاقے کا بہت بڑا بد معاش اور ڈکیت تھا۔ ارباز خان نے رپورٹ درج کراتے ہوئے کہا تھا۔

”میں اس بدنام زمانہ زرخان کا پڑوسی ہوں۔ جب بھی پولیس اس کی تلاش میں کہیں چھاپہ مارتی ہے تو اسے ہمیشہ مجھ پر ہی شک ہوتا ہے کہ میں نے اس کی خبری کی ہے اپنے اسی شک کی وجہ سے اس نے میرے گھر میں ڈکیتی کی ہے۔“

”آپ فکر نہ کریں ہم اس کے خلاف بھرپور کارروائی کریں گے۔“ پولیس آفیسر نے ارباز خان کو تسلی دی۔

پھر ہوا ابھی کچھ ایسا ہی زرخان مہینے میں ایک مرتبہ اپنی بیوی اور بیٹی سے ملنے رات کی تاریکی میں چھپ چھپا کر آتا تھا۔ ارباز خان نے پولیس سے وعدہ کر لیا تھا کہ اب وہ زرخان کی ٹوہ میں رہے گا اور پولیس کو اس کے گھر آنے سے متعلق ضرور اطلاع دے گا۔ ارباز خان نے راتوں کو جاگ کر زرخان کے گھر پر نظر رکھنا شروع کر دی۔ چوری کے واقعے کے کوئی تیس دن بعد آدھی رات کو زرخان چوروں کی طرح اپنے گھر میں داخل ہوا۔ دروازہ اس کی بیوی نے کھولا تھا۔ ارباز خان نے فوراً پولیس کو اطلاع کر دی مگر پولیس کے آنے سے کچھ ہی دیر پہلے وہ گھر سے نکل چکا تھا۔ جیسے ہی پولیس وین پہنچی ارباز خان نے بتایا کہ چند لمحوں پہلے وہ فلاں سمت کی جانب گیا ہے۔ پولیس نے تعاقب کیا اور زرخان کو جالیا۔ اس نے پولیس کو دیکھ کر فائرنگ کر دی۔ پولیس نے بھی ہائی فائرنگ کی جس سے علاقے میں خوف و ہراس پھیل گیا۔ کچھ ہی دیر کی کارروائی کے بعد پولیس نے سٹیمر کر دیا۔ صبح جب لوگوں کو صورت حال کا علم

ہوا تو علاقے میں مسرت وطمینان کی لہر دوڑ گئی۔ زرخان علاقے کے انتہائی دولت مند شخص لعل خان کا بیٹا تھا۔ لعل خان کے تین بیٹے اور چار بیٹیاں تھیں۔ لعل خان کا تعلق اس پٹھان قبیلے سے تھا جہاں بیٹیاں بکاؤ مال ہوتی ہیں۔ اس کے دو بیٹے بہت چھوٹے تھے مگر زرخان سب سے بڑا اور باپ کے بے جالا ڈیپار کی وجہ سے کافی بگڑا ہوا تھا۔ اس کی نظر میں ماں بہنوں کی کوئی اہمیت نہ تھی اس لیے وہ ہمیشہ ان کے ساتھ بہت برا سلوک کرتا تھا۔ وہ جب گھر میں ہوتا تو بہنیں کنوئں کھدروں میں چھپی رہتی تھیں۔ ماں کو بھی وہ کچھ نہ سمجھتا تھا اور بات بے بات جھڑک دیتا تھا اس لیے ماں بھی اس سے سبھی سبھی رہتی تھی۔

ایک روز اٹھارہ سالہ چھوٹی بہن نتاشا نے اپنی ماں سے اجازت لے کر زرخان سے چوری چھپے پستو گانوں کی ایک کیسٹ بازار سے اپنی سہیلی سے منگوائی۔ خدا کا کرنا، جس وقت اس کی سہیلی کیسٹ نتاشا کو دے رہی تھی اسی وقت زرخان گھر میں داخل ہوا اور اس نے یہ منظر دیکھ لیا۔ وہ غصے سے دھاڑا اور جھپٹ کر نتاشا کے ہاتھ سے کیسٹ چھین کر کھڑے نکلے کر دی اور طیش میں آ کر اندر سے اپنے باپ کی گن اٹھالایا۔ ماں سامنے آئی تو دونوں کو مارنے کی دھمکی دینے لگا۔ ماں نے فوراً نتاشا اور خود کو کمرے میں بند کر لیا۔ خاصی دیر بعد ماں نے سوچا اب بیٹے کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا ہوگا وہ کمرے سے باہر آئی زرخان ابھی بھی غصے سے چارپائی پر بیٹھا تھا۔ ماں نے ڈرتے ڈرتے بہت ہی منت سماجت کر کے اس کے ہاتھ سے گن لے کر جیسے ہی دوسرے کمرے میں گن رکھنے گئی زرخان نے چارپائی سے اٹھ کر کمرے میں جا کر نتاشا کو لاتوں اور مکوں سے مارنا شروع کر دیا۔ ماں دوڑتی ہوئی بیٹی کو بچانے آئی مگر زرخان کے سر پر خون سوار تھا اس نے دونوں ماں بیٹی کو اس زور کا دھکا



# غزل

آئینے محرومِ جوہر ہو گئے  
پتھروں میں رہ کے پتھر ہو گئے

سب ندی نالوں سے لیتے ہیں خراج  
کون سے دریا، سمندر ہو گئے

سانس کی آواز بھی لگتی ہے چیخ  
کان سناٹوں کے خوگر ہو گئے

رونا چاہیں بھی تو رو سکتے نہیں  
تنبہ جن کا مقدر ہو گئے

وجہ لکھوں گا برے حالات کی  
جب کبھی حالات بہتر ہو گئے

حزین صدیقی

تھا۔ اسے زر خان سے کسی شادی کے لیے کوئی  
اچھا سا سوٹ چاہیے تھا اس لیے بار بار کال کر رہا  
تھا۔ نازیہ نے اسے بتایا کہ زر خان گھر پر نہیں ہے۔  
لڑکے نے اچانک پوچھ لیا۔ ”آپ زر خان کی  
مور (ماں) ہیں؟“

”میں اُس کی بہن بول رہی ہوں۔“ نازیہ نے جواب  
دیا۔ اُس نے اچھا کہہ کر کال منقطع کر دی۔ اب نازیہ کو اپنی  
بے وقوفی کا احساس ہوا کہ اسے کچھ نہیں بتانا چاہیے تھا مگر  
اب کیا ہو سکتا تھا تیر مکان سے نکل چکا تھا۔ ادھر زر خان کے  
اس دوست کی ملاقات زر خان سے ہو گئی۔

”زر خان یا زرم کدھر ہو؟ ابھی میں نے تمہارے  
گھر فون کیا تھا۔ تمہاری بہن سے بات ہوئی یا زرمجھے  
شادی میں جانا ہے۔ تم اپنا وہ سوٹ دے دو جو تم نے  
وہاب کی شادی میں پہنا تھا۔“ وہ دوست اپنی رُو میں  
اُس کی بہن کا ذکر کر بیٹھا۔ زر خان نے بہن کے ذکر  
کے بعد کچھ نہ سنا کہ نیل کیا کر رہا ہے، غصہ سے اس کی  
کینیت ہی بدل گئی۔ وہ دوست کو کچھ جواب دیے بغیر  
شدید غصے میں آدھی طوفان کی طرح گھر میں داخل  
ہوا اپنے کمرے کی ٹیبل کی دروازے سے پھسل نکلا اور صحن  
میں عشاء کی نماز کے لیے وضو کرتی نازیہ پر اندھا دھند  
فائرنگ کر دی۔ فائرنگ کی آواز سے سب دہل گئے۔

یہ کارنامہ سراسر انجام دے کر زر خان گھر سے جا چکا تھا۔  
ماں سنا کہ زر خان نے اپنے کمرے سے نکل کر صحن  
کی طرف بھاگے، کسی کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ  
زر خان کس نے؟ صرف زر خان کی بیوی نے سارا  
حادثہ دیکھا تھا۔ یہ سب کچھ سنا آنا نا ہوا تھا کہ وہ کچھ کر  
تی تھی اور وہ بے چاری کرتی بھی کیا اگر وہ کچھ کرنے  
کی ہمت نہ کرتی، اس وقت ایک کی بجائے دو لاشیں  
پڑتی تھیں۔ زر خان نے بیٹی کو اٹھایا۔ گولیاں اُس کی  
پشت پائی تھیں۔ وہ بھی زر خان کی آمد سے بے خبر وضو  
کے میں مصروف تھی۔ نازیہ شدید زخمی تھی۔ لعل

میں داخل ہوئے تو سمجھ گئے، موٹی بارٹی ہے لہذا لڑکی  
کے اچھے دام ملیں گے اور یہی ہوا، لعل خان نے بیٹے  
کی خواہش کے پیش نظر لڑکی کے باپ بھائیوں کا منہ  
بھاری رقم سے بھر کر بلکہ بند کر کے انہیں پھر بھی اس  
طرف نہ آنے کی تاکید کے ساتھ رخصت کر دیا۔

زر خان کی حرکتوں کی وجہ سے محلے میں لعل خان  
کے گھر کی کافی بدنامی ہو چکی تھی، غیر پٹھان محلے دار تو  
پہلے بھی ان سے دور ہی رہتے تھے مگر اب ان کے رشتہ  
دار وغیرہ نے بھی ان سے تقریباً قطع تعلق کر لیا تھا۔ اس  
وجہ سے لعل خان نے وہ گھر بیچنے کا فیصلہ کر لیا مگر چونکہ  
اس کا کاروبار گھر سے نزدیک ہی تھا لہذا اس نے نہیں  
دور جانے کی بجائے اسی علاقے میں کچھ فاصلے پر ایک  
بہت بڑے پلاٹ پر عالی شان دو منزلہ بنگلہ تعمیر کروایا۔  
وہ بنگلہ کسی محل سے کم نہیں تھا، جو بھی اس میں قدم رکھتا  
دنگ رہ جاتا۔ بڑی بڑی راہداریاں، قیمتی فرنیچر سے  
سجے کمرے، ریشمی پردے، سبز و شاداب بو اسباغیچہ۔

اس نئے گھر میں سولہ سالہ نازیہ اپنے بھائی  
زر خان کے ستم کا نشانہ بنی۔ ہوا کچھ یوں کہ گھر کے  
ٹیلی فون کو استعمال کرنے کا حق صرف لعل خان یا  
زر خان کو حاصل تھا۔ دونوں کی غیر موجودگی کی  
صورت میں ماں صرف آنے والی کالز سن سکتی تھی  
تاکہ دونوں کے گھر آنے پر انہیں مطلع کر سکے۔ اُس  
رات دونوں باپ بیٹا ابھی گھر نہیں آئے تھے۔ زر  
خان نے تو اب چوری کی وارداتیں کرنا بھی شروع  
کر دی تھیں جس کی وجہ سے وہ اکثر راتوں کو بھی گھر  
سے باہر ہی ہوتا تھا۔ اس روز فون کی کھٹی مسلسل بج  
رہی تھی۔ ماں چھوٹے بچے کو لے کر قریبی کلینک تک  
گئی ہوئی تھی۔ فون بار بار رنج رہا تھا۔ زر خان کی بیوی  
اور نازیہ میں ہمت نہ تھی کہ فون ریسیو کرتیں، فون  
جب تیسری بار بجا تو نازیہ نے ہمت کر کے ریسیو  
اٹھالیا۔ دوسری جانب زر خان کا کوئی دوست بول رہا

دیا کہ بے چاری نتاشا کا سر بری طرح سے دیوار سے  
ٹکرایا اور وہ بے ہوش ہو کر گر پڑی۔ ماں، بیٹی کو  
اٹھانے کی کوشش کر رہی تھی مگر وہ تو ہوش و خرد سے بے  
گاہ نہ ہو چکی تھی۔ چھوٹے بچے اس منظر سے خوف زدہ  
کونوں میں چھپے بیٹھے تھے کہ اسی وقت نتاشا کا باپ  
لعل خان گھر میں داخل ہوا۔ باپ کو دیکھ کر زر خان  
جھٹ گھر سے نکل گیا۔ لعل خان کو جب ساری  
صورت حال معلوم ہوئی تو اس نے فوراً گاڑی نکالی  
اور بیٹی کو لے کر ہسپتال بھاگا جہاں ڈاکٹر زرنے وجہ  
پوچھی تو لعل خان نے کہہ دیا کہ سیڑھیوں سے گرنے  
سے بے ہوش ہوئی ہے۔ اسے فوری طور پر ایمرجنسی  
میں لے جایا گیا مگر سر پر چوٹ گہری آئی تھی، بے  
چاری نتاشا کو کیا خبر تھی، کیسٹ کا منگوانا اس کی زندگی  
کے خاتمے کا سبب بن جائے گا۔ ڈاکٹر زکی جان توڑ  
کوشش کے باوجود نتاشا اسی بے ہوشی کے عالم میں  
اس دنیا سے چپ چاپ منہ موڑ گئی۔ والدین اس کی  
لاش گھر لے آئے۔ لعل خان نے بیوی کو راستے میں  
ہی کہہ دیا تھا کہ اصل بات منہ سے نہ نکلے۔ تمام محلے  
داروں اور رشتہ داروں کو سیزرھی سے گرنے والی کہانی  
ہی بتائی ہے۔ غم سے نڈھال ماں نے منہ پر چپ کی  
پٹی باندھ کر سینے پر صبر کی سل رکھ لی۔ بہن کے  
جنازے میں زر خان ایسے مکاری کے آنسو بہا رہا تھا  
جیسے اسے بہن کے مرنے کا بہت ہی دکھ ہو۔

اتنے بڑے حادثے پر لعل خان نے زر خان کو  
کچھ نہ کہا جس سے اسے مزید شہ لی اور وہ زر خان جو  
بہن کے گانے سننے پر غیرت سے آپے سے باہر ہو گیا  
تھا، بیس سال کی عمر میں وزیرستان سے کسی دوسرے  
قبیلے کی لڑکی بھگالایا۔ لڑکی کے گھر والوں نے غیرت  
سے زیادہ اس بات کے لیے لڑکی کا پیچھا کیا کہ سونے  
کی چیز یا کچھ دیے بغیر ہی ہاتھ سے نکل گئی تھی۔ جب  
وہ زر خان کے باپ لعل خان کی بڑی سی شاندار حویلی



# خوشیاں ماتم میں ڈھل گئیں

نہرت سرفراز

جیسے ہی سکتل گرین ہوا ڈرائیور نے گاڑی آگے بڑھائی جبکہ دوسری طرف سکتل ریڈ ہونے کے باوجود ایک ٹرک ڈرائیور نے تیز رفتاری سے سکتل توڑ کر اپنا ٹرک نکالنا.....

چوٹی جگہ بنی اسلام آباد سے



اور ماں سے بڑھ کر ہمدردوں ہو سکتا تھا اور ویسے بھی لعل خان نے گزشتہ دس سالوں سے اسے میکے جانے نہیں دیا تھا مگر اب اس کی حالت کو دیکھتے ہوئے لعل خان نے اسے گاؤں لے جانے کا وعدہ بھاتے ہوئے عید سے تین دن قبل اپنی گاڑی میں آدھی رات کے وقت بیوی اور چاروں بچوں کے ہمراہ رخصت سفر بائندھا تھا۔ فجر کے وقت ڈرائیونگ کرتے ہوئے لعل خان کو نیند کی چھٹی آگئی اور اسی لمحے ہائی وے پر سڑک کنارے کھڑے ٹرالر سے ان کی گاڑی اتنی شدت سے ٹکرائی کہ آدھی سے زیادہ گاڑی ٹرالر کے نیچے گھس گئی۔ چھ افراد پر مشتمل گھرانے میں سے کوئی بھی زندہ نہ بچ سکا۔ زندہ تو کیا بچتا، کسی کی ڈیڈ باڈی بھی سلامت نہ تھی۔ پولیس نے لعل خان کے بریف کیس سے نمبر لے کر اس کے بھائی کو اطلاع دی جو وہیں علاقے میں رہتا تھا۔ شام کو پولیس وین میں چھ تابوت لعل خان کے بنگلے کے گیٹ پر پہنچ چکے تھے۔ لوگوں کا ایک جم غفیر منہ دیکھنے کے لیے اٹھ آیا تھا مگر تابوت بند تھے۔ پولیس کے مطابق، نعشیں دکھانے کے قابل نہ تھیں جنہیں اسی حالت میں دفن کر دیا گیا۔ زرخان کا کہیں پتا نہ تھا۔ اب لعل خان کا بھائی اس محل نما بنگلے میں شفٹ ہو گیا تھا کیونکہ زرخان کی بیوی تنہا رہ گئی تھی پھر تقریباً چھ ماہ بعد بہن کے قتل کے بعد زرخان اپنے بنگلے کی طرف آیا تھا۔ اس دوران زرخان کی بیوی نے دو جڑواں بیٹیوں کو جنم دیا اور دونوں کا نام مناشا اور نازیہ رکھا تھا۔ زرخان والدین اور بہن بھائیوں کی ہلاکت کا سن کر بہت پریشان ہوا اور اسی پریشانی میں گھر سے نکل گیا مگر چند لمحوں بعد خود بھی پولیس مقابلے میں مارا گیا۔ اب اس کی بیوی اپنی دو بیٹیوں اور چچا کی فیملی کے ساتھ اس محل نما بنگلے میں رہتی ہے۔ اس محل میں عجیب سی دیرانی کا راج رہتا ہے۔

☆☆☆

خان اُسے فوراً ہسپتال لے جانا چاہتا تھا مگر فائرنگ کی آواز پر ارد گرد کے گھروں کے لوگ فائرنگ کی آوازیں کر لعل خان کے بنگلے کے گیٹ پر جمع ہو چکے تھے۔ لعل خان نے حاضر دماغی سے کام لیتے ہوئے اپنے دس سالہ بیٹے کریم کو یہ کہہ کر بھیجا کہ باہر لوگوں کو کوہڑا کچھ نہیں ہوا، ابونے ہوائی فائرنگ کی ہے۔ لوگ یقین اور بے یقینی کی کیفیت میں ٹولیوں کی صورت کھڑے اپنے اپنے انداز میں تبصرہ کر رہے تھے۔ اندر نازیہ کا خون تیزی سے بہہ رہا تھا۔ لعل خان نازیہ کو گود میں لیے بیٹھا تھا۔ نازیہ کے خون سے اُس کے تمام کپڑے بھر چکے تھے۔ نازیہ کا وقت پورا ہو چکا تھا، کچھ دیر بعد اُس نے بڑی خاموشی سے کوئی شکوہ کیے بغیر باپ کی گود میں جان دے دی۔ وہ باوضو اور بے گناہ لڑکی اپنے بھائی کے ظلم کی بھینٹ چڑھ گئی۔ اس واقعے کی بھنگ لگی کو پڑ گئی جس نے پولیس کو بھی خبر کر دی مگر لعل خان نے پولیس کو خاموش کر دیا۔ صرف 30 ہزار میں صرف قتل کا کوئی اندراج نہ ہوا بلکہ محلے والوں سے چھپ کر رات کے اندھیرے میں نازیہ کی لاش کو زمین میں دبائے کے عمل میں بھی پولیس نے لعل خان کی معاونت کی اور یوں اس گھر کی ایک اور جان بھائی کی بے نام غیرت کے ہاتھوں پیوند خاک ہو گئی۔ محلے والوں کو واقعے کی کچھ کچھ سن لگ چکی تھی مگر وہ بس تھے کیونکہ پولیس مجرموں کی محافظ بن چکی تھی۔ زرخان فرار تھا اور بے خبر تھا کہ اس کا دولت مند باپ اپنی دولت سے اس کے راستے کے تمام کانٹے چن چکا ہے مگر اب قدرت کے انتقام کا وقت آن پہنچا تھا۔ وہ رمضان المبارک کا بابرکت مہینہ تھا۔ لعل خان کی بیوی اپنی دو بیٹیوں کی اندوہناک موت پر غم سے غڈ حال تھی اور بہت بیمار رہنے لگی تھی۔ وہ اپنے گاؤں اپنی والدہ کے پاس جانا چاہتی تھی۔ اسے اپنی بیٹیوں کے غم کو کم کرنے کے لیے کسی ہمدرد کے کندھے کی ضرورت تھی



ٹھیک تین دن بعد ثقلین کی بارات تھی۔ گھر مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ تین بھائیوں میں سب سے چھوٹا اور لاڈلا ثقلین بلا کا ذہین اور حاضر جواب تھا۔ دونوں بڑے بھائی شادی سے پہلے ہی کینیڈا سیٹل ہو چکے تھے جبکہ اُس نے اپنی امی کے ساتھ پاکستان میں ہی رہنے کو ترجیح دی تھی۔ اس کی امی بھی پاکستان میں رہنے کی خواہش مند تھیں۔ وہ اپنے دونوں بڑے بیٹوں کے پاس رہنے کے لیے کینیڈا گئیں مگر وہاں کے ماحول میں اپنے آپ کو ایڈجسٹ نہ کر سکیں اور واپس آ گئیں حالانکہ اُن کے بہو بیٹے چاہتے تھے کہ امی اُن کے پاس رہیں۔ دونوں بیٹوں کے ماشاء اللہ تینوں بچے بھی دادی سے بہت پیار کرتے تھے اور اُن کی واپسی کے لیے بالکل راضی نہ ہوتے تھے کہ دادی رات میں اُن کو نیوٹ کے قصبے بادشاہوں کی کہانیاں اور حمد، نعتیں بھی سنایا کرتی تھیں۔ انہیں اس دیا غیر میں رہنے کے لیے بیٹے اصرار کرتے تو وہ کہتیں۔

”نا بابا، تم لوگ ہی رہو اس فریزر جیسے سرد ماحول میں جہاں تم لوگ دنوں اور ہفتوں کو نہیں بلکہ سالوں کو گنتے ہو کہ کتنے سال پہلے فلاں سے ملاقات ہوئی تھی اب کتنے سال بعد فلاں خالو یا ماموں سے ملاقات ہو سکی؟ یہاں کے سرد ماحول نے جذبے اور ولولے تک منجمد کر دیے ہیں۔ مجھے تو اپنا ملک ہی بھلا ہے جہاں آس پڑوں میں آنا جانا ہوتا ہے بلکہ روزمرہ پکائے جانے والے کھانوں کا تبادلہ بھی ہوتا ہے اور سب چھوڑو ہم زبان اور ہم مذہب تو ہیں۔ گھر سے نکلے ہی اجنبیت کے ماحول کا احساس تو نہیں ہوتا۔ اپنا گھر اپنی جنت اور یہاں تو نہ کفن اپنا اور نہ میت میں رشتے دار..... میں تو بس اپنے وطن کی مٹی میں پیوند خاک ہوں گی۔ پرانے دیس کی مٹی سے اللہ بچائے۔ کوئی فاتحہ کو بھی نہ آئے۔“

تینوں بیٹوں سمیت بہو ویں اور پوتا پوتی اُن کی ایسی دلیلیں سن کر مسکرا دیتے۔

بڑا بولتا۔ ”امی جان! لوگ تو ترستے ہیں کینیڈا کی امیگریشن کے لیے وہاں کے ویزے کے لیے اور آپ ہیں کہ اس جنت جیسے ملک کو ٹھکرا رہی ہیں؟“

”بھائو میں جائے ایسی جنت میری نظر میں تو جہنم سے کم نہیں ہے جہاں نہ شادی کا مزہ نہ میت کا پرسہ۔ ہمیں تو اپنا پاکستان ہی بھلا۔“ امی نے کانوں کو ہاتھ لگایا تھا۔

”اچھا چھوڑو ان باتوں کو ثقلین! یہ بتاؤ بارات کا جوڑا اٹھا لیا تم نے درزی کے پاس سے؟ اچھا ہوتا اگر ایک بار پہن کر دیکھ لیتے۔“

”نہیں امی.....! صرف ٹاپ کے لیے پہن کر میں اپنا بارات کا جوڑا پرانا نہیں کروں گا۔ میں تو ڈائریکٹ نیا کور جوڑا اُسی دن پہنوں گا۔“

”ارے! ایک دفعہ پہن کر ٹرائی کرنے سے کون سا تمہارا جوڑا پرانا ہو جائے گا؟ بس ڈرافٹنگ کا اندازہ ہو جائے گا۔“ بڑی بھابھی بھی بولیں۔

”نہیں بھابھی.....! عمر ویں شیروانی تو میں بارات والے دن ہی پہنوں گا۔ یہ کیا بات ہوئی، پہلے پہنا نا پا اور اتار کر رکھ دیا اور پھر بارات والے دن اتارا ہوا جوڑا استری کر کے پھر پہن لیا۔“

”او ہونٹ کے لیے پہن کر دیکھنے سے تمہارا جوڑا پرانا نہیں ہوگا۔“ بڑے بھیا بھی دور سے چلائے۔

”بھیا! درزی کوئی اتار ڈی تو نہیں ہے براڈ ہے اور میرا ٹاپ لے کر ہی تو سلائی کیا ہے اس نے کیسے چھوٹا یا بڑا ہوگا؟“ ثقلین نے جواب دیا۔

”بس زیادہ زور نہ ڈالو اس پر۔“ ماں نے سب کو چپ کراتے ہوئے کہا۔ ”یہ اس کی بچپن کی عادت ہے جب یہ چھوٹا تھا تو اس کا عید کا جوڑا رمضان سے پہلے ہی لے لیا کرتی تھی کہ رمضان

میں روزہ رکھ کر کون بازاروں کے چکر لگائے گا تب بھی یہ مہینہ بھر عید کے جوڑے اور جوتوں کو روز دیکھتا مگر پہن کر بھی نہیں دیکھتا کہ یہ پرانے ہو جائیں گے تب بھی یہی کہتا کہ میں تو نیا جوڑا عید والے دن ہی پہنوں گا اور اب دیکھو اتنا بڑا ہو گیا ہے مگر عمر ویں جوڑے کے لیے بھی اس کی یہی ضد ہے۔ چلو کوئی بات نہیں، تم لوگ خدمت کرو، ثقلین کی خوشی میں ہی ہماری خوشی ہے اُسی دن پہن لے گا۔ بڑی بہو! تم نے دیکھ لیا ہے نا، جوڑا اور وہ گاڑی اور کمر سجانے کے لیے بھی تو آرڈر دیتا ہے۔ ہمارے گھر کی تو آخری شادی ہے سارے ارمان نکالنے ہیں۔“

”جی اماں!“ بڑی بہو نے جواب دیا۔ ”ویسی سچی بات ہے، ثقلین کا عمر ویں جوڑا ہے غضب کا! آف وائٹ شیروانی پر لال کلاہ جو سامنے کی طرف سے گھوم کر پیچھے جائے گا اپنا ثقلین تو راجا لگے گا راجا اور ہاں اماں! دوسرے کاموں کی فکر نہ کریں میں نے حمد ان کو کہہ دیا ہے وہ سب دیکھ لے گا۔ اپنے چھوٹے چاچو کی شادی پر سب سے زیادہ ایکساٹنڈ بھی تو وہی ہے۔ کینیڈا میں پاکستان جیسی ایسی دھوم دھام کی شادی کہاں ہوتی ہے وہ تو پہلی دفعہ پاکستانی شادی کی ایسی رونقیں دیکھ رہا ہے۔ ارے ہاں اماں! میں تو بھول ہی گئی، ثقلین کے سسرال سے نوں آیا تھا اُن کے گھر کی پہلی پہلی شادی ہے تو وہ بھی اسے یادگار بنانا چاہتے ہیں۔ دلہن کی امی کہہ رہی تھیں کہ جینز کا سامان تیار ہے اور کل مہندی سے قبل ہی وہ ثقلین کا کمر اُٹھائی گرائی میں سیٹ کروادیں گی۔ میرے لاکھ منع کرنے کے باوجود کہ کمرے میں پردے کا ریٹ سب ڈالے ہوئے ہیں وہ نہ مانیں۔ انہوں نے کھڑکیوں اور کمرے کا ٹاپ لے کر پردوں اور کارپٹ وغیرہ تک کا آرڈر بھی دے دیا ہے۔“

”ہاں بہو.....! یہ بات تو ہے، پہلو بھی کا بیٹا ہوا نا، اس کی شادی میں ہر طرح کے ارمان نکالنے کا

دل چاہتا ہے۔ ماشاء اللہ دو بھائیوں کی اکلوتی بہن بھی ہے اور چندے آفتاب چندے ماہتاب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ثقلین اور ماندہ کی صورت میں چاند سورج کی جوڑی بنائی ہے۔ اللہ دونوں کو سدا سلامت رکھے اور زندگی کی تمام خوشیاں عطا کرے۔ اس شادی کے بعد تو میں حج کرنے جاؤں گی اور اللہ جنتی تو متی دے گا عمرہ اور نمازیں پڑھ کے دُعائیں مانگا کروں گی سب کے لیے۔ اب تمام فرائض کی ادائیگی کے بعد بس یہی کام رہ جائے گا۔“

اگلے روز مہندی تھی۔ پورا دن خوب ہلہ گلہ رہا۔ ثقلین کی سالیوں نے بھی ہنسا ہنسا کر سب کے پیٹ میں بل ڈال دیے۔ ”نگ“ کی وصولی میں بھی اچھا خاصا ٹائم لگ گیا۔ سالیان جان چھوڑنے کو تیار نہیں تھیں اور ثقلین شرارت کے موڈ میں بجائے نگ دینے کے عجیب عجیب چٹکے چھوڑے جا رہا تھا۔ ادھر اماں دھڑا دھڑ بیٹے کی بلائیں لے رہی تھیں کہ خدا نظر بد سے بچائے اور سدا سلامت رکھے۔

بارات والی صبح بھتیجا حمد ان مذاق میں بولا۔ ”چاچو.....! آپ گھر سے ہی اپنی شیروانی پہن کر جائیں گے یا اسٹج پر چڑھتے ہوئے پہنیں گے کہ کہیں چند گھنٹوں میں یہ پرانی نہ ہو جائے اور چاچی کو پسند نہ آئے؟“ یہ کہہ کر اُس نے قہقہہ لگایا تو اماں نے دور سے ہی آواز لگائی۔

”حمد ان چندا! میرے بیٹے کو تنگ نہ کرو۔ آج تو وہ گھر سے حج دھج کر نیا جوڑا پہن کر دلہا بن کر جائے گا۔ کلاہ پہنوتی پہناتے گا اور جوڑا بڑا بھائی پہناتے گا۔“ تھوڑی دیر بعد ثقلین سیلون چلا گیا۔ واپس آیا تو چہرہ دمک رہا تھا آنکھوں میں آنے والے لحوں کی فسوں خیزی کے دیے جگمگا رہے تھے ہر لڑکے کی زندگی میں یہ دن خرد آتا ہے اور آنکھوں میں دیے بھی جگمگاتے ہیں مگر ثقلین کی آنکھوں کی چمک دمک



اور ان میں جلتے بجتے دیوں کی بات ہی الگ تھی۔ اماں کی ساری زندگی کی سخت محنت اور تربیت میں کسی چیز کی کمی نہ تھی اور ثقلین نے بھی اُن کی تربیت کا مان رکھا تھا۔ بہت سیدھا سادہ اور نیک بچہ تھا۔ اب تک اُس نے صرف تعلیم پر ہی پوری توجہ رکھی تھی۔ کسی بھی طرح کی فضول، غیر نصائی سرگرمیوں سے دور دور تک کا واسطہ نہ رکھا اور آج کل کے لڑکوں کی طرح جو لڑکیوں سے بے باکی کے ساتھ سیل فون پر رات رات بھر باتیں کرتے ہیں، جیسی علتوں سے بھی کوسوں دور تھا ڈیٹ پر جانا تو دور کی بات وہ تو ساتھی لڑکیوں سے بھی کبھی فہمی نہیں ہوا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ آج کے دن اُس کے چہرے پر ایک معصوم سی دل موہ لینے والی دل کو چھو جانے والی مسکراہٹ رقصاں تھی۔

بھابھیاں آج کل کے سائے میں اپنے پیارے دیور کو برآمدے میں لے کر آئیں۔ آف وائٹ زرتار شیروانی اور سرخ کلاہ کے ساتھ ثقلین واقعی کسی ریاست کا شہزادہ یا راجہ مہاراجہ ہی دکھائی دے رہا تھا۔ چھ فٹ سے نکلتا ہوا قد گہرے کالے ٹھنکریا لے بال اور سرخ و سفید رنگت اُس عروسی جوڑے کے ساتھ غضب ڈھا رہے تھے۔ اماں نے چیٹ چیٹ بلائیں اتاریں اور پیسے دارے۔ بارات تیار تھی دولہا کی گاڑی کی سچ دھج بھی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ بارات کا قافلہ روانہ ہوا۔ حمدان اور اس کے دوستوں نے دولہا کی گاڑی کے آگے موٹر سائیکلوں پر جانے کا پلان کیا تھا اور بارات کے نکلنے کے وقت تک یہ منصوبہ صیغہ راز میں رکھا ہوا تھا کہ کہیں بڑے منع نہ کر دیں۔

”چاچو کی جائے گی بارات“ بھیلی ہوگی رات میں موٹر سائیکل پر لے کر جاؤں گا بارات“ خود ساختہ شوخ ذہن پر گیت گنگنا تے ہوئے حمدان نمودار ہوا۔ ثقلین بولنا چاہ رہا تھا کہ حمدان میرے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر چلو مگر چاروں طرف رشتے داروں اور کزنز

کا ہجوم تھا ہر کوئی گاڑی میں بیٹھنے کی جلدی میں تھا اور لڑکے موٹر سائیکلوں پر سوار ہو چکے تھے۔

بھائی جان نے کہا۔ ”چلو ثقلین.....! تم گاڑی میں بیٹھو دونوں بھابھیاں تمہارے برابر میں اور اماں آگے بیٹھ جائیں گی۔ حمدان نے ماندہ کا گھر دیکھ رکھا ہے وہ ڈرائیور کو گاؤں کر دے گا اور ہم سب پیچھے کوٹر میں آ رہے ہیں۔ ماندہ کی امی کا دو بار فون آ چکا ہے کہ آپ لوگ نکلے کہ نہیں؟ میں نے اُن کو کہا کہ بس آئی.....! تمیں منٹ کا راستہ ہے، ہم لوگ نکل چکے ہیں، بس کچھ ہی دیر میں آپ کے دروازے پر ہوں گے۔ آپ بالکل فکر مت کریں۔“

بارات کا قافلہ رزواں دواں تھا۔ موٹر سائیکلوں پر حمدان اور نو جوان ٹولہ تھا درمیان میں دولہا میاں کی گاڑی اور پیچھے کوٹر۔ دولہا کی گاڑی میں فلمی گیت بج رہا تھا۔ ”لے چلی میں اپنے دیور کی بارات لے کر“ دونوں بھابھوں کے پیچھے ثقلین مسکرا دیا تو چھوٹی بھابھی بولیں۔ ”ثقلین.....! میں نے خاص آج کے دن اسی وقت کے لیے یہ گانا سوچا ہوا تھا۔ جب میں اس گھر میں آئی تھی تو تم میٹرک میں تھے اور آج ماشاء اللہ انجینئرنگ مکمل کر کے بیچنگ ڈائریکٹر کے عہدے پر ہوا اور میں اپنے بھائی جیسے چھیتے دیور کی بارات لے کر جا رہی ہوں۔ میں نے یہ گانا آج ہی کے دن کے لیے طے کر رکھا تھا۔ کتنا سوٹ کر رہا ہے نا، یہ گانا۔“ اور سامنے بیٹھی اماں بھی اپنی بہو کا پیار دیکھ کر مسکرائے پنا نہ رہ سکیں مگر چند ساتوں کے فاصلے پر کھڑی تقدیر بھی مسکرا رہی تھی۔ بارات کا قافلہ آگے بڑھ رہا تھا۔ دولہا کی سچی سبائی گاڑی سگنل پر کھڑی تھی جبکہ برابر میں موٹر سائیکلوں کا قافلہ اور پیچھے کوٹر بھی موجود تھی کہ اچانک وہ لمحہ آ گیا جس نے اس خوش و خرم خاندان کی تمام خوشیوں کو نکل لیا جیسے ہی سگنل گرین ہوا

ڈرائیور نے گاڑی آگے بڑھائی جبکہ دوسری طرف سگنل ریڈ ہو جانے کے باوجود ایک ٹرک ڈرائیور نے تیز رفتاری سے سگنل توڑ کر اپنا ٹرک نکالنا چاہا جیسے ہی دولہا کی گاڑی آگے بڑھی تیزی سے دندناتے ہوئے آنے والے ٹرک نے سائیڈ سے گاڑی کو اس بری طرح سے ہٹ کیا کہ دولہا کی گاڑی بے قابو ہوتی ہوئی فٹ پاتھ سے ٹکرا کر زوردار دھماکے سے الٹ گئی۔ ٹرک ڈرائیور کی غلط کے نتیجے میں ایک ہشتا بست خاندان نہیں نہیں ہو گیا۔ ٹرک ڈرائیور نے سائیڈ سے ٹرک تیزی سے نکالا اور چشم زدن میں تیز رفتاری کے ساتھ نکل گیا اور اپنے پیچھے ثقلین کی خوشیوں کو نکل گیا.....

دولہا کی گاڑی کا ڈرائیور بے ہوش تھا جبکہ پچھلی طرف سے ہٹ کیے جانے کی وجہ سے دونوں بھابھیاں بھی شدید زخمی تھیں۔ اماں کو بھی چوٹیں آئی تھیں مگر وہ ہوش میں تھیں۔ اُن کا دولہا بنا چیتا بیٹا اپنے ہی لہو میں نہا چکا تھا۔ اُس کی آف وائٹ شیروانی سرخ ہو رہی تھی۔ بٹے کو اس حال میں دیکھ کر اماں اپنا دل پکڑ کر رہی ہوئیں۔ وہ یہ منظر برداشت نہ کر پائیں اور دل کے دورے کا شکار ہو گئیں۔

ٹرک ڈرائیور کی غفلت، غلط اور قانون شکنی نے ایک ہشتے بستے گھرانے کی خوشیوں کو ماتم میں بدل دیا تھا۔ لمحہ بھر میں جائے حادثہ پر لوگوں کا رش لگ گیا۔ ایسولینوں کی آوازیں زنجیوں کی چیخ و پکار، لواحقین کے سکتے زدہ چہرے..... لفظوں کو اگر زبان مل جائے تب بھی وہ اس سانچے کو اس لمحے کو صغیر قمر طاس پر لہو سکر گھوں کے ساتھ بکسیر نے کی طاقت نہیں رکھتے۔

زنجیوں کو اسپتال منتقل کر دیا گیا۔ دولہا کی گاڑی اس حد تک بچک بچک تھی کہ گاڑی کی باڈی کو کاٹ کر ڈھکیں اور جال بچت ہو جانے والوں کو نکالا گیا۔ ثقلین کی ارامانوں بھری آف وائٹ شیروانی خود اُس کے

اپنے لہو سے تر بتر ہو رہی تھی۔ دولہا جائے حادثہ پر ہی جبکہ اماں دو روز موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا رہنے کے بعد انتقال کر گئیں۔ دونوں بھابھیاں بھی شدید زخمی تھیں مگر اللہ نے اُن پر کرم کیا وہ زندہ بچ گئیں مگر کئی مہینے اسپتال میں رہیں مگر بڑی بھابھی پھر بھی مکمل طور پر صحت یاب نہ ہو سکیں۔

میں خود اس حادثے کی چشم دید گواہ ہوں جب میں اپنی گاڑی میں جائے حادثہ کے رش سے گزر رہی تھی تو دولہا اور زخمی ایسولینوں میں لے جائے جا رہے تھے۔ دولہا کی سرخ گلابوں سے بھی سبائی گاڑی بری طرح بچکی ہوئی حالت میں خود اپنی آنکھوں سے میں نے دیکھی تھی۔ یہ منظر دیکھ کر کئی راتوں تک میں صبح طریتے سے سوچتی نہیں سکتی تھی۔ گلابوں سے بھی وہ ٹوٹی ہوئی گاڑی اور ایسولینوں کی آوازیں میرے کانوں اور وہ منظر میری نگاہوں کے سامنے گھومتا رہتا۔ دولہا کے متعلق دیگر تمام باتیں مجھے دولہا کی ایک رشتے دار خاتون سے معلوم ہوئی تھیں جو کہ میری بیٹی کی دوست کی والدہ بھی تھیں۔

اللہ تعالیٰ ہر ایک کو ایسی آزمائش اور برے وقت سے بچائے مگر سوال یہ ہے کہ سڑکوں پر دندناتے، نیند اور نشے سے چوران ڈرائیوروں کو کنٹنس شوٹکیٹ کون جاری کرتا ہے جو دوسروں کے گھر ویران کر دیتے ہیں؟ ان ٹرک ڈرائیوروں کی غفلت، تیز رفتاری کی سزا کتنے معصوم شہری اور کب تک کاٹیں گے؟ لہو پکار پکار کر انصاف کا طلب گار ہے، ہے کوئی انصاف دینے والا؟ بے شک اللہ سب سے بڑا منصف ہے۔ فرار ہو جانے والا ڈرائیور جو اس حادثے میں ملوث ہے وہ اس دنیا میں تو بھاگ سکتا ہے مگر روزِ حشر وہ بھاگ نہیں پائے گا اور روزِ حشر اُس کا جو حشر ہوگا وہ شاید اُس سے ناواقف ہے.....

☆☆☆

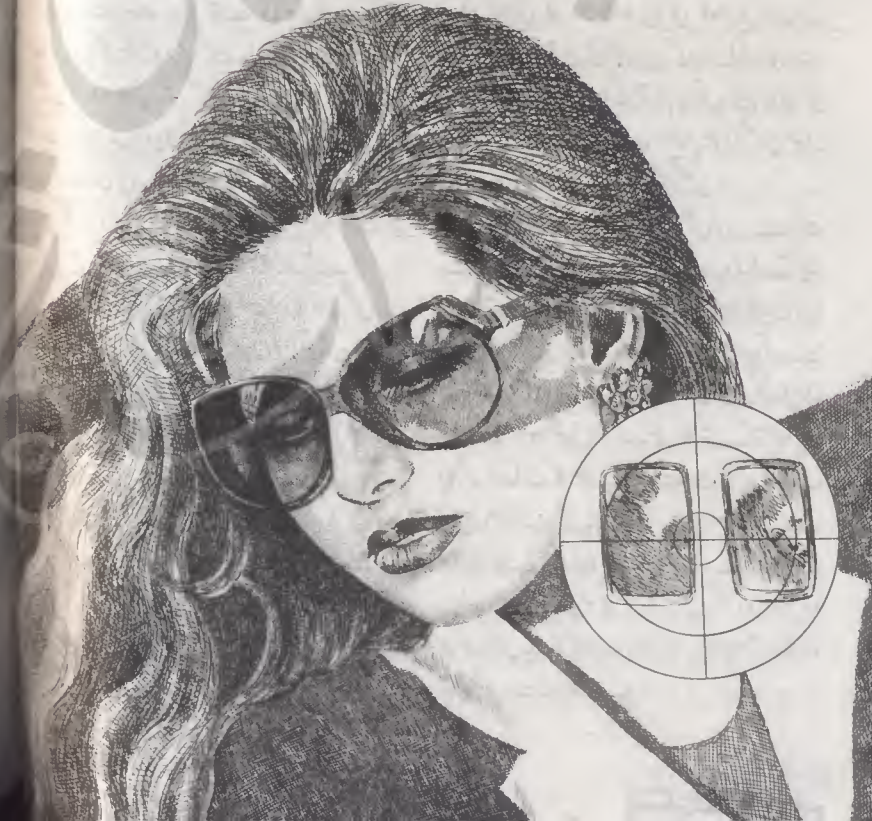


## بولتا دل تو قیامت ہوتی

قرۃ العین زینب

رضوانہ کو اُس وقت وہ رکے والا انسانی شکل میں فرشتہ محسوس ہوا تھا، اُس نے بڑی مشکل سے قریبی بازار کے بارے میں اسے بتایا تھا رکے والے نے اس کی مدد کی اور اُس دکان.....

پہلی بڑھائی لاہور سے



”کیا نصیب لے کر آئی ہے یہ لڑکی، ہر چیز اس کو بہترین ملتی ہے؟“ آج پہلی بار شامکہ کے لہجے میں رضوانہ کے لیے حسد کا عنصر تھا اور کیوں نہ ہوتا، علی احمد خان کا رشتہ رضوانہ کے لیے آیا تھا۔ سارے رشتے داروں میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی تھی۔ خاندان بھر کی لڑکیاں اس بات کی منتظر تھیں کہ خالہ صفیہ اپنے بیٹے کے لیے اُن کا رشتہ مانگیں۔ آخر دینی میں کمانے والا کماؤ پوت تھا، وہ دینی گیا تھا۔ اُن کے تو حالات ہی تبدیل ہو گئے تھے۔

خالہ صفیہ جن کا گھر پہلے معمولی سا تھا، اب ڈبل اسٹوری کونھی میں تبدیل ہو چکا تھا۔ علی احمد خان سب بہن بھائیوں میں بڑا تھا۔ اُس سے چھوٹی دو بہنیں تھیں جن کی وہ شادی کروا چکا تھا اور جوہیزہ اُس نے اپنی بہنوں کو دیا تھا، اس کی دھوم پورے خاندان میں مچ گئی تھی۔ اُس ڈبل اسٹوری گھر میں نیچے کا پورشن علی احمد نے چھوٹے بھائی بلال اور اوپر کا پورشن اپنے لیے تیار کیا تھا یعنی سب لڑکیوں کو علم تھا کہ وہ اس گھر کی بہن بن گئیں تو پھر اکیلے پورشن میں خود مختار حیثیت سے رہیں گی کیونکہ علی کے والد کی وفات ہو چکی تھی اور خالہ صفیہ اپنے چھوٹے بیٹے بلال کے ساتھ نیچے کے پورشن میں ہی رہتی تھیں۔ وہ خاندان کی ہر تقریب میں رشتے دار عورتوں کے ہجوم میں بر ملا یہ کہتی تھیں کہ علی احمد کی دلہن تو اُسی کے ساتھ دوہنی چلی جائے گی، سو ہر ماں کی خواہش یہی تھی کہ علی احمد جیسا کماؤ اور خوش شکل داماد انہی کا نصیب ہو اور اب قرعہ فال رضوانہ کے نام کھلا تھا جو کہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی اور بے حد لاڈ و پیار سے پروان چڑھ رہی تھی۔

کہنے کو تو ماں باپ دونوں کی جان رضوانہ میں تھی مگر اُسے اس لاڈ و پیار نے بگاڑا نہیں تھا بلکہ اُس میں مہر و مزی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وہ دیکھنے

میں بھی خوش شکل تھی اور اتفاق کی بات یہ تھی کہ بہت ساری بیٹوں کی مائیں بھی اسی تاک میں تھیں کہ اُن کو رضوانہ کا رشتہ مل جائے کیونکہ لڑکی کا خاندان جتنا چھوٹا ہوتا ہے، اتنا ہی ایسی خود غرض ماؤں کے لیے باعث سکون ہوتا ہے جو اپنے داماد کو بیوی کا تابع اور بیٹے کو اپنا ماتحت دیکھنا چاہتی ہیں۔ رضوانہ کے والد ریٹائرڈ ملازم تھے اور اب اُن کی زندگی کی بڑی خواہش یہی تھی کہ اُن کی بیٹی عزت سے اپنے گھر کی ہو جائے۔ رضوانہ نے علی کو دیکھا ہوا تھا، وہ بھی بہت خوش تھی کہ جس انسان کی تمنا خاندان کی ہر لڑکی کرتی تھی، وہی اُس کی زندگی کا ساتھی بنے جا رہا تھا۔ رشتہ ہوتے ہی دونوں خاندانوں کی طرف سے بڑی دھوم دھام سے شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ ایک سے بڑھ کر ایک چیز خریدی گئی اور یوں ایک خوشیوں بھری رات رضوانہ، علی کے گھر آ گئی تھی۔

رضوانہ جب جملہ عروسی میں علی احمد کا انتظار کر رہی تھی تو اُسے امی ابو بہت یاد آئے تھے مگر یہ لڑکی کی زندگی کا ایسا موڑ ہوتا ہے جس پر اُسے صبر و شکر کرنا ہوتا ہے۔ علی کے بارے میں رضوانہ کو کچھ زیادہ علم نہیں تھا ہاں مگر جتنا سنا تھا، اُس کے مطابق وہ انتہائی ملنسار اور خوش اخلاق تھا۔ وہ جس محفل میں بھی ہوتا، وہاں کی جان بن جاتا تھا۔ انہی سوچوں کے درمیان علی احمد آ گیا تھا اور آتے ہی اُس نے رضوانہ پر یہ واضح کر دیا تھا کہ اُس کی زندگی میں اُس کی ماں سے بڑھ کر کوئی نہیں اور وہ اُن کی خاطر سب کچھ کر سکتا ہے۔ رضوانہ کو علی احمد کی باتیں بری تو نہیں لگی تھیں مگر اُس کا لہجہ بہت اداس کر گیا تھا کیونکہ علی احمد نے اپنے سخت لہجے سے دوسرے لفظوں میں گویا رضوانہ کو یہ دھمکی دی تھی کہ اگر اُس کی ماں خوش نہ رہی تو وہ بھی خوش نہیں رہ سکے گی۔ اب رضوانہ کیسے اُسے اپنا سینہ چیر کر دکھائی کہ



اُس کے دل میں خالہ صفیہ کے لیے کتنی محبت اور خلوص ہے۔ خیر رضوانہ نے اُسے اس معاملے میں کوئی صفائی نہ دی تھی کیونکہ اُسے یقین تھا کہ وقت کے ساتھ ساتھ وہ اپنی خدمت و خلوص سے سب پر ثابت کر دے گی کہ..... وہ سب سے کتنی مخلص ہے!

دوسری صبح جب رضوانہ کے گھر والے ناشتہ لے کر آئے تھے تو علی احمد کی امی نے واضح بتا دیا تھا کہ ویسے والے دن رضوانہ گھر نہیں جائے گی بلکہ کچھ دن کے بعد علی خود اُسے صبح چھوڑ جائے گا اور شام کو لے آئے گا کیونکہ اُن کے خاندان کے بہت لوگ ملنے آرہے ہیں اور اگر دہن ہی گھر نہ ہوئی تو شرمندگی ہوگی۔ صفیہ خالہ نے کچھ اس انداز سے یہ بات کی تھی کہ سب نے اُن کی حمایت کی تھی۔ ویسے والے دن رضوانہ اور علی دونوں بہت خوش اور اچھے لگ رہے تھے اور سب بڑی رشک بھری نظروں سے دونوں کی جوڑی کو دیکھ رہے تھے۔ شائد جو رضوانہ کی چچا زاد بہن تھی، بہت رشک بھری نظروں سے رضوانہ کو دیکھ رہی تھی کہ..... اتنا اچھا سا بھی خوشحال زندگی اور محبت نچھاور کرنے والا سسرال ایک لڑکی کو مل جائے تو اور پھر کیا چاہیے تھا۔

رضوانہ کی امی نے ویسے کے دن بیٹی پر واضح کر دیا تھا کہ اب اُس کا جینا مرنا سسرال میں ہی ہے تو نہ چاہتے ہوئے بھی رضوانہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے اور وہ بولی تھی۔

”کیوں امی! کیا اب میں آپ کی بیٹی نہیں رہی یا پھر میں ایک بوجھ تھی جسے آپ اتارنا چاہتی تھیں؟“

رضوانہ کے لیے کی اداسی اُس کی امی کا بھی دل دکھا گئی تھی اور وہ بولی تھیں۔

”بیٹا.....! گھر بہت مشکل سے بستے ہیں عورت کو اپنا وجود ختم کر کے نئے سرے سے اپنے

مزارع کو بنانا پڑتا ہے۔ قدم قدم پر اپنے وجود کی نفی کرنی ہوتی ہے اور یہی قربانیاں ایک جنت جیسا پرسکون گھر تعمیر کرتی ہیں۔ اگر تم اپنے قدم آگے اور نظریں پیچھے رکھو گی تو گر بڑو گی اور زندگی میں جو چوٹیں تجربوں سے لگتی ہیں، وہ بہت گہرے زخم دیتی ہیں۔ ہمارا کام یہاں تک کا تھا۔ اب میں اور تمہارے ابو بس حج پر جانے کی خواہش رکھتے ہیں تاکہ اللہ کے سامنے جانے کے قابل ہو سکیں۔“

رضوانہ کے دماغ میں اپنی امی کی یہ نصیحت گھر کر گئی اور اسی لمحے اُس نے تہیہ کر لیا کہ وہ اپنے گھر کو جنت کا نمونہ بنائے گی۔

شادی کے ہفتے دو ہفتے بعد جب دعوتوں اور ملنے جلنے کا سلسلہ ختم ہوا تو علی احمد نے گھونٹے پھرنے کا پروگرام بنایا اور وہ دونوں پندرہ دن کے لیے شمالی علاقہ جات کی طرف نکل گئے..... یوں شادی کے بعد وہ پہلا مہینہ رضوانہ کے لیے حسین ترین ثابت ہوا تھا۔

علی احمد شادی کے لیے دو مہینے کی چھٹیاں لے کر آیا تھا اور اب ایک ہفتے کے بعد اُس نے چلے جانا تھا۔ رضوانہ اُس کے جانے پر بے حد اداس تھی۔ علی احمد نے جاتے ہوئے رضوانہ کو بہت ساری نصیحتیں کی تھیں جن میں زیادہ تر علی کی امی اور چھوٹے بھائی بلال سے متعلق تھیں کہ اُن کو خوش رکھنا ہے اور پھر آخر کار علی احمد کے جانے کا وقت بھی آگیا تھا۔

علی کیا گیا، رضوانہ کی ساری خوشیاں ہی چلی گئیں مگر پھر بھی اُس نے ہمت کر کے خود کو سنبھالا اور خود کو کام کاج میں مصروف رکھا۔ اب جوں جوں وقت گزرتا جا رہا تھا، رضوانہ کو خالہ صفیہ کے مزارع کی سمجھ آتی جا رہی تھی۔ شادی کے دو مہینے گزرنے پر بھی

وہ صرف تین بار ہی چند گھنٹوں کے لیے میکے جاسکی تھی۔ اب خالہ صفیہ نے چوں کہ سارے بچن اور گھر کے دوسرے تمام کاموں کی ذمہ داری رضوانہ ہی پر ڈال دی تھی، اس وجہ سے وہ صبح سے شام تک کام میں ہی مصروف رہتی۔ دیکھنے میں تو لگتا تھا کہ اُس گھر کے تین افراد ہیں یعنی رضوانہ، خالہ صفیہ اور بلال مگر ایسا نہیں تھا، علی کی دونوں بہنوں کا سسرال قریب قریب ہی تھا، اُس وجہ سے وہ دونوں بہنیں اکثر ماں کے پاس ہی رہتی تھیں اور پھر ایک اپنے چار بچوں اور دوسری دو بچوں کے ساتھ کھانے پینے کی مختلف فرمائشیں کرتی رہتی تھیں جن کو پورا کرنے کے چکر میں رضوانہ گھن چکر بن چکی تھی۔

دن اسی طرح گزر رہے تھے کہ اچانک رضوانہ کی طبیعت خراب رہنے لگی۔ خالہ صفیہ اور اُن کی بیٹیوں کو شروع شروع میں تو یہ بہانہ بازی لگی مگر بعد میں ڈاکٹر کے پاس جانے سے پتہ چلا کہ رضوانہ امید سے ہے۔ اُس دن رضوانہ نے علی کی کمی کو بہت شدت سے محسوس کیا۔ اب آہستہ آہستہ رضوانہ کی امی نے بھی رضوانہ کی حالت دیکھ کر حالات کا اندازہ لگالیا تھا کہ رضوانہ کے صبر و برداشت کا بے حدنا جائزہ فائدہ اٹھایا جا رہا ہے حد تو یہ تھی کہ علی احمد متواتر گھر فون کرتا تھا مگر صرف ماں بہنوں سے بات کر کے ہی فون بند کرتا، دوسری طرف خرچے کے نام پر بھی رضوانہ کو علی احمد کی طرف سے کوئی پائی پیسا نہیں ملتا تھا۔ بقول خالہ صفیہ کے، رضوانہ کو بھلا بیٹیوں کی کیا ضرورت تھی سب کچھ تو گھر میں موجود تھا، یہ تو رضوانہ کی امی تھیں جو ڈھکے چھپے بیٹی کو کچھ نہ کچھ دے دیا کرتی تھیں۔

رضوانہ کو علی احمد سے بہت شکایتیں تھیں۔ ”کیا کوئی انسان اپنی زندگی کے ساتھی سے اتنا بے نیاز بھی ہو سکتا ہے کہ اُس کا حال بھی نہ پوچھے؟“ خالہ

صفیہ اب بہت حد تک کھل کر سامنے آ چکی تھیں، اُن کا اور اُن کی بیٹیوں کا گٹھ جوڑا اتنا مضبوط تھا کہ رضوانہ کو زبان ہلانے کی بھی اجازت نہیں تھی۔ اُن دنوں رضوانہ کو بے حد نفرت رہنے لگی تھی، مسلسل ٹینشن اور بے آرامی نے اُسے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ سب لوگوں کو یہی لگتا تھا کہ تین افراد کا کام ہی کتنا ہوتا ہے! یہ بات خالہ صفیہ نے سب لوگوں کے ذہنوں میں بھی ڈالی ہوئی تھی مگر یہ صرف رضوانہ کو ہی علم تھا کہ اُسے تین خاندانوں کا کام کرنے میں کتنی مشکل ہو رہی تھی بڑی باجی اور چھوٹی باجی کا کھانا الگ، خالہ صفیہ کا بریڑی کھانا الگ اور بلال کے بن بلائے دوستوں کی دعوت الگ، اُس کے علاوہ گھر کی صفائی ستھرائی کرنا، گھر پر کام والی نہ رکھنے کی وجہ یہی بتائی جاتی تھی کہ تین بندوں کا کام ہی کتنا ہوتا ہے جو آج اتنی مہنگائی کے دور میں نوکروں جیسی عیاشی کی جائے دوسری طرف علی احمد کی کمائی سے گل چھڑے اڑائے جا رہے تھے۔

رضوانہ کو اس بات کا بہت دکھ تھا کہ علی احمد کی اتنی محنت سے کمائی گئی رقم کو بے دریغ اڑایا جا رہا تھا جبکہ وہ اپنے آنے والے بچے کے لیے کچھ بچ کرنا چاہتی تھی مگر بے بس تھی کیونکہ اُس کے اختیار میں کچھ نہیں تھا اور اب تو یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ خالہ صفیہ کا بیٹے کی شادی کرنے سے مقصد یہو لانا نہیں، کام کی مشین لانا تھا۔ اس مقصد کے لیے رضوانہ بہترین انتخاب ثابت ہوئی کیونکہ اُس کا میکہ مضبوط نہ تھا، بے چارے ماں باپ سوائے گھبرانے و پریشان ہونے کے، کیا کر سکتے تھے؟ جبکہ رضوانہ خود بھی اپنے والدین کو دکھ نہیں دینا چاہتی تھی، اس وجہ سے وہ اپنی باتیں کسی سے بھی کہہ نہیں سکتی تھی ہاں کبھی کبھار اُس کی کزن شائلہ ملنے آ جاتی تو اُسے اپنا مخلص سمجھتے ہوئے رضوانہ دے الفاظ میں اپنی



مشکلات کا تذکرہ کر دیتی مگر یہ ساری باتیں سن کر ہمیشہ شامہ کو یہی لگتا کہ عورت چونکہ ہے ہی سدا کی ناشکری اس وجہ سے رضوانہ ان معمولی باتوں کی وجہ سے شکوے کر رہی ہے کیونکہ خالہ صفیہ جس انداز سے رضوانہ کے شکوے کرتی تھیں اُس سے صاف طور پر اندازہ ہو جاتا تھا کہ رضوانہ نے ماں جیسی ساس اور بہنوں جیسی نندوں کی قدر ہی نہیں کی وہ اکلوتی ہونے کی وجہ سے اتنے لاڈ اٹھوا چکی تھی کہ اب آرام طلب ہو گئی تھی۔

جوں جوں دن گزرتے جا رہے تھے رضوانہ کی حالت خراب ہوتی جا رہی تھی۔ اُس کی امی کئی بار آ کر خالہ صفیہ سے منت کر چکی تھیں کہ رضوانہ کو اُن کے ساتھ بھیج دیں مگر انہوں نے صاف منع کر دیا تھا کیونکہ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ علی احمد یہ سوچے کہ یہ خرچہ رضوانہ کے ماں باپ نے اٹھایا ہے کیونکہ انہوں نے تو علی احمد سے رضوانہ کے اس مسئلے کی وجہ سے خرچہ بہت بڑھا کر بھیجے کا اصرار کیا تھا کہ وہ رضوانہ کا کسی بڑے اچھے ڈاکٹر سے علاج کروا سکیں جبکہ دوسری طرف رضوانہ کو محلے ہی کی ایک ہیلتھ ورکر سے ملنے کی اجازت تھی اور ڈاکٹر کے پاس نہ جانے کا یہ بہانہ تراشا گیا تھا کہ لیڈی ڈاکٹر کافی دور ہے اور وہ فوری آپریشن کرنے کا کہے گی۔

اُس رات رضوانہ اکیلی گھر کے نچلے حصے میں بنے ایک چھوٹے سے کمرے میں لیٹی تھی اُس کو شادی کے بعد جب سے علی احمد واپس گیا تھا اوپر سے نیچے شفٹ کر دیا گیا تھا جبکہ اُس کا اوپر کا سارا پورشن اُس کی نندوں اور اُن کے بدترین بچوں کے استعمال میں رہتا تھا یا پھر کسی رشتے دار کے آنے پر اُسے رضوانہ کا پھوپھو ہڑپن دکھانے کے کام آتا جو اوپر چمے گندہ اور رضوانہ کی خرابی سمجھتے ہوئے تو بہ تو بہ کرتے رہتے۔ رضوانہ جانتی تھی کہ اُس کی بات پر

کوئی یقین نہیں کرے گا اُس وجہ سے اس نے صفائیاں دینی چھوڑ دی تھیں۔ اُس دن کام نے رضوانہ کو ضرورت سے زیادہ تھکا دیا تھا اور اُسے اب بہت تکلیف محسوس ہو رہی تھی۔ آخر کار جب تکلیف برداشت سے باہر ہو گئی تھی تو اُس نے اپنی ساس کے کمرے کا رخ کیا تھا۔

”اے لو بہو! ابھی کہاں دن پورے ہوئے ہیں ابھی بہت دن باقی ہیں تم وہم مت کرو اور سو جاؤ۔“ پہلے پہل تو انہوں نے بہو کو نالنا چاہا تھا۔

”امی.....! میں جھوٹ نہیں بول رہی میری طبیعت بہت زیادہ خراب ہو رہی ہے کچھ کریں۔“ رضوانہ بہت بے بسی سے بولی تھی۔

خالہ صفیہ جیسے مجبور اُبڑتے برے دل سے اُس محلے والی ہیلتھ ورکر کو اُس کے گھر سے بلا کر لائی تھیں تو اُس نے رضوانہ کی حالت دیکھتے ہی کہا تھا۔ ”بابی.....! انہیں فوراً کسی ہسپتال لے جاؤ کچھ گڑبڑ ہے۔“

یہ سن کر رضوانہ کو ایک بڑے ہسپتال میں لے جایا گیا تھا جہاں فوری طور پر اُسے طبی امداد دی گئی تھی۔ لیڈی ڈاکٹر نے رضوانہ کی حالت دیکھی تھی تو وہ خالہ صفیہ پر برس پڑی تھی۔

”کیا ہو بیٹی جیسی نہیں ہوتی جو آپ اس کے ساتھ یہ سلوک کر رہی ہیں؟ اس کا وزن بہت کم ہے اور اس کو اتنی کمزوری ہے کہ اس کی جان کو ہی نہیں ہونے والے بچے کو بھی خطرہ ہے۔ کیا اس کو کھانے پینے کو آپ لوگ کچھ نہیں دیتے؟“

خالہ صفیہ اُس وقت لیڈی ڈاکٹر کے سامنے تو چپ رہی تھیں مگر گھر آ کر رضوانہ کی خوب ککلاں لی تھی۔ ”پڑ گئی تھنڈ کر دیا یا نازل کیل کس چیز سے روکا ہے تم کو؟ بس دو بندوں کا کام کیا کر لیا ہر جگہ ہمیں ذلیل کروانے لگیں۔ نہ بھائی اب علی احمد آئے گا تو

کہہ دوں گی اپنی بیوی کو الگ کر دے۔ ہم تو اتنی ذلت نہیں اٹھا سکتے۔“ اور ساتھ ہی انہوں نے رونا بھی شروع کر دیا تھا دونوں نندیں بھی اپنی ماں کے ساتھ مل گئی تھیں۔ بے چاری رضوانہ تو اپنی صفائیاں ہی دیتی رہ گئی تھی۔

کچھ دن کے بعد اچانک ہی علی احمد پاکستان آ گیا تھا۔ رضوانہ کی خوشی کا تو کوئی ٹھکانہ نہیں تھا مگر علی احمد کا رویہ اتنا سرد تھا کہ رضوانہ کے سارے ارمانوں پر اوس پڑ گئی تھی علی احمد صرف ضرورت کے تحت ہی رضوانہ سے ملاقات کرتا ورنہ تو سارا وقت بس ماں اور بہنوں کے درمیان گھرا بیٹھا رہتا۔ رضوانہ بے چاری تو علی احمد سے اکیلے میں بات کرنے کو ترس ہی گئی تھی اور پھر آخر کار وہ دن بھی آ ہی گیا تھا جب رضوانہ نے ماں کے درجے پر فائز ہونا تھا۔

رضوانہ کو ایک سستے سے کلینک میں لے جایا گیا تھا۔ وہ نیم بے ہوش سی تھی اور اسی حالت میں اُس نے نایک بیماری سی پنی کو جنم دیا تھا۔ وہ لیڈی ڈاکٹر اپنے پروفیشن میں ماہر نہ ہونے کی وجہ سے عورتوں کی جانوں سے کھیل رہی تھی۔ اُس نے رضوانہ کو نجانے کس قسم کا انجکشن لگایا تھا کہ اُس کے بدن کا آدھا حصہ مفلوج ہو گیا تھا دایاں بازو اور ٹانگ بالکل ہی بے جان ہو گئے تھے اور تو اور رضوانہ کی زبان بھی جیسے بے جان ہو چکی تھی۔ وہ بہت زیادہ گھبراہٹ ہوئی تھی اور بے بسی سے اپنی پنی کو روٹے دیکھتی رہی جو کہ سامنے ہی جھوٹے میں پڑی تھی۔

خالہ صفیہ نے اس صورت حال پر بڑا اوویلا مچایا جس کا فائدہ یہ ہوا کہ اُس لیڈی ڈاکٹر نے اپنی فیس وغیرہ سب معاف کر دی اور بغیر کچھ دیئے لیے بس واپس جانے کا کہا۔ اُن سب کو کیا چاہیے تھا مگر خالہ صفیہ کے دل میں تو کچھ اور ہی چل رہا تھا اپنے بیٹے

علی احمد سے سرگوشیوں کے بعد گھر کی طرف واپس جاتے ہوئے انہوں نے بیچ سڑک پر گاڑی روک دی۔ اُس وقت رضوانہ کی نومولود پنی خالہ صفیہ کی گود میں تھی۔ علی احمد نے دونوں ہاتھوں سے رضوانہ کو گود میں اٹھایا اور فٹ ہاتھ پر بٹھا کر بولا۔

”یہاں سے تمہارا گھر نزدیک ہے کسی نہ کسی صورت وہاں پہنچ ہی جاؤ گی۔ میری بوڑھی ماں بچی کو سنبھالے گی یا پھر تمہیں؟“

رضوانہ اپنے شہر کی یہ باتیں سن کر بے بسی سے رونے لگی۔ ایک ہاتھ سے وہ چٹنی مضبوطی سے علی احمد کو پکڑ سکتی تھی اُس نے پکڑ لیا۔ مغرب ہونے کو تھی اور اُسے شدید خوف محسوس ہو رہا تھا وہ تو واضح طور پر بول بھی نہیں پا رہی تھی۔ اُس کے پاس پیسے بھی نہیں تھے وہ اس حالت میں گھر کیسے جانی مگر علی احمد کو ترس نہیں آیا تھا اور وہ لوگ اُسے اُس فٹ ہاتھ پر چھوڑ گئے تھے۔

رضوانہ نے اپنے چاروں طرف دیکھا اور بے بسی سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اُسے اس حال میں اس طرح روٹے دیکھ کر ایک رکشا والے نے قریب آ کر پوچھا تھا۔

”بابی.....! کیا مسئلہ ہوا ہے؟ آپ کو کہاں جانا ہے؟“

رضوانہ کو اُس وقت وہ رکشے والا انسانی شکل میں فرشتہ محسوس ہوا تھا اُس نے بڑی مشکل سے قریبی بازار کے بارے میں اُسے بتایا تھا۔ وہاں شامہ کے شو ہر الیاس کی دکان تھی۔ رکشے والے نے اُس کی مدد کی اور اُس دکان پر لے گیا۔ رضوانہ کی قسمت تھی کہ وہاں دکان پر رضوانہ کے چچا کا چھوٹا بیٹا مراد بھی اپنی بیوی کے ساتھ سامان لینے آیا ہوا تھا۔

رکشے والے نے دکان پر جا کر کہا تھا۔



”بھائی!.....! انٹ پاتھ ر ایک بی بی ملی ہیں جو درہری تھیں۔ اب رکشے میں بیٹھی ہیں وہ صحیح طرح بول بھی نہیں سکتیں انہوں نے اس دکان کا بتایا ہے تو میں یہاں لے آیا ہوں۔“

الیاس جو گا بھوں کو سامان دینے میں مصروف تھا رکشے والے کی بات سن کر بری طرح چڑ گیا اور بولا۔ ”اوہ بھائی!.....! کیوں میرا دماغ خراب کر رہے ہو میں کسی ایسی عورت کو نہیں جانتا جو بول نہ سکتی ہو۔ پتہ نہیں کون ہے؟ ایسے ہی میرے سر مصیبت نہ ڈالو کہیں اور جاؤ۔“

رکشے والا الیاس کی باتیں سن کر گھبرا گیا کہ کہیں نیکی گلے نہ پڑ جائے۔ پتہ نہیں کون عورت ہے اور معاملہ کیا ہے؟ وہ واپس آیا اور رضوانہ سے بولا۔

”دیکھو بی بی!.....! میں نے صرف نیکی کے لیے آپ کی مدد کی ہے۔ مجھے کسی مسئلے میں نہ الجھانا۔ میں بھی بہن بیٹیوں والا ہوں اسی وجہ سے آپ کو روتے دیکھ کر مدد کی۔ اب وہ دکان دار ادھر نہیں آ رہا ہے تو میں کیا کروں؟“

رضوانہ سمجھ چکی تھی کہ رکشے والا گھبرا گیا ہے اور الیاس بھائی جب تک اُسے دیکھ نہیں لیں گے پہچانیں گے نہیں یہی سوچ کر وہ ہشتی ہوئی رکشے سے اتر گئی۔ اتنے میں رضوانہ کے چچا کا بیٹا مراد بھی دکان سے باہر نکل رہا تھا جیسے ہی رضوانہ کی نظر مراد پر پڑی اس نے رکشے والے کو اشارہ کیا کہ ذرا اُس سامنے والے شخص کو بلاؤ!

رکشے والا تقریباً بھاگتا ہوا گیا اور اُس نے اشارے سے مراد کو رضوانہ کو دکھایا۔ تھوڑی دیر کے لیے تو مراد اور اُس کی بیوی دونوں سکتے کی کیفیت میں آ گئے تھے انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ سامنے زمین پر بیٹھی روتی ہوئی عورت رضوانہ ہو سکتی ہے پھر

اچانک وہ میاں بیوی تیزی سے اُس کی طرف بڑھے تھے۔ رضوانہ اُن کو دیکھ کر مزید رونے لگی تھی۔ مراد فوراً ہی رضوانہ کو اپنی گاڑی میں ڈال کے ہسپتال لے گیا تھا۔ رضوانہ کے بے جان جسم کو دیکھ کر اُن کو یہی لگا کہ شاید رضوانہ کا کوئی ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے اُسی وجہ سے وہ یوں بے ہوش و نیم جان سی ہے مگر ہسپتال جا کر چیک اپ کرنے پر اُن پر انکشاف ہوا تھا کہ یہ حالت کسی ایکسیڈنٹ کی وجہ سے نہیں بلکہ فالج کی وجہ سے ہے یہ ایک ایسا پراسرار معاملہ تھا جس کی مراد کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ آخر ایسی حالت میں فٹ پاتھ تک کس طرح پہنچی؟ اُس نے فوراً ہی موبائل کے ذریعے رضوانہ کے ماں باپ اور دیگر عزیزوں کو اطلاع دے دی تھی، تھوڑی دیر میں سب کی ہسپتال آمد ہو گئی تھی۔

رضوانہ ہسپتال آنے کے بعد بے ہوش ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر کے مطابق اُس کا بی بی بہت ہائی تھا اور کسی طور کم نہیں ہو رہا تھا لگتا تھا جیسے اُسے نہایت شدید قسم کا ذہنی جھکام ملا ہو۔ رضوانہ کے ابو نے علی احمد کو فون کیا تھا تو اُس نے فون پہلے کاٹا اور پھر بند کر دیا تھا۔ مراد اُن کے گھر گیا تھا مگر وہاں بھی تالا تھا۔ مراد کی بہنوں نے بھی اس تمام معاملے سے لاعلمی کا اظہار کیا تھا۔

آخر کار دوسری صبح رضوانہ کو ہوش آ گیا تھا۔ اپنے ماں باپ کو سامنے دیکھ کر اُس کے ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے تھے اور وہ بری طرح سے رونے لگی تھی۔ سب بری طرح بے چین تھے وہ سب جاننا چاہتے تھے کہ آخر کار کیا ہوا ہے؟ جبکہ رضوانہ اپنی معصوم سی بی بی کے لیے بہت بے چین تھی ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں رضوانہ نے جو اور جتنا بتایا تھا وہ ناقابل یقین تھا۔ سب ہی سمجھ رہے تھے کہ اُن کو سمجھنے میں غلطی ہو رہی ہے۔ آخر کار شکام نے رضوانہ سے

پوچھا تھا۔

”رضوانہ!.....! بس اتنا بتا دو کہ وہ لوگ تمہیں کون سے کلینک میں لے گئے تھے؟ وہاں جا کر ہم ساری صورت حال کا پتہ کر لیں گے۔“ مگر بد قسمتی سے رضوانہ کو اس کا بھی علم نہیں تھا کیونکہ جس حالت میں اُسے کلینک لے جایا گیا تھا وہ اُس وقت اپنی تکلیف میں کسی دوسری طرف توجہ ہی نہیں کر سکتی تھی۔ ادھر علی احمد کے گھر والے مسلسل غائب تھے جبکہ علی احمد کی بہنوں نے بھولے سے بھی رضوانہ کا حال نہیں پوچھا تھا۔

رضوانہ مسلسل ایک ہفتہ ہسپتال میں رہنے کے بعد گھر آ گئی تھی مگر وہ اپنی بی بی کے لیے بے حد بے چین تھی۔ رضوانہ کی امی دن رات اپنی نیند آرام بھول کر رضوانہ کا خیال رکھ رہی تھیں اور یہ انہی کی محبت اور محنت ہی تھی کہ رضوانہ کی حالت رفتہ رفتہ بہتر ہو رہی تھی۔ اسی طرح دو مہینے کا عرصہ گزر گیا تھا۔

ایک دن اچانک مراد بڑے غصے کی حالت میں رضوانہ کے گھر آیا تھا اور کافی دیر تک اُس کے ابو کے ساتھ باتیں کرتا رہا تھا۔ رضوانہ کی امی حیران تھیں کہ مراد کو آخر ہوا کیا ہے؟

”یہ آج مراد اتنا غصے میں کیوں آیا تھا؟ خیر تو تھی؟“

”اللہ نے ہمارا بدلہ لیا ہے رضوانہ کی ماں!.....! ہماری بی بی کے آنسو اور آہوں نے صفیہ اور اُس کے گھر والوں کو ڈوبو دیا۔“

”کیا ہوا؟ آخر کچھ بتائیں تو؟ کیا وہ لوگ اپنے گھر واپس آ گئے ہیں؟“ رضوانہ کی امی نے ہولتے دل سے سوال کیا تھا۔

”اللہ کی بندی!.....! وہ صرف ہمارا سامنا نہ کرنے کے لیے دوسرے شہر چلے گئے تھے اور

رضوانہ کی بی بی پیدائش کے تیسرے دن ہی فوت ہو گئی تھی۔ ان خالکوں نے بی بی رضوانہ سے چھین کر اُسے فٹ پاتھ پر چھوڑ دیا تھا اور یہ جو رضوانہ کو فالج ہوا ہے یہ اس گھٹیا نام نہاد ڈاکٹر کی کارستانی تھی جس کے پاس یہ صرف اس لیے رضوانہ کو لے گئے تھے کہ خرچہ کم سے کم ہوگا۔“ یہ سب بتا کر رضوانہ کے ابو رونے لگے تھے۔

”مگر آپ کو یہ ساری باتیں کیسے پتہ چلیں؟ کیا مراد نے علی احمد سے ملاقات کی ہے؟“

”آج مراد کو علی احمد کا چھوٹا بھائی بلال ملا تھا“ اُس نے بتایا کہ یہ سب کچھ اُس کے سامنے ہوا، وہ رضوانہ کی بہت عزت کرتا تھا مگر چھوٹا ہونے کی وجہ سے ماں بہنوں کے آگے بے بس تھا۔ اسی نے مراد کو بتایا کہ اس کی ماں کو اپنی غلطی اور گناہ کا ذرا سا بھی احساس نہیں تھا۔ رضوانہ ان کے لیے صرف کام کرنے والی مشین تھی اور جب اُسے بی بی کی پیدائش کے وقت لیڈی ڈاکٹر کے غلط انجکشن سے فالج ہوا اور وہ کام کاج کے قابل نہ رہی تو اُسے یوں راستے میں چھوڑ دیا اور خود بی بی سمیت اُسی دن لاہور روانہ ہو گئے لیکن بی بی بے حد کمزور اور چھوٹی تھی اُس کو وہ لوگ سنبھال نہ سکے اور یوں بی بی فوت ہو گئی تب ان لوگوں نے لاہور میں علی بی کے رشتے کی بات چلائی اور پندرہ دن کے اندر ہی علی کی شادی کر دی پھر ایک مہینے بعد جب وہ دہلی واپس جا رہا تھا تو اسے ایئر پورٹ پر گرفتار کر لیا گیا تھا کیونکہ اس کے بیک سے جس برآمد ہوئی تھی۔ علی احمد کو کہتا ہے کہ وہ نہیں جانتا کہ یہ جس کہاں سے آئی؟ مگر پولیس نہیں مانتی اب وہ جیل میں ہے اور یہ لوگ اپنی آدمی سے زیادہ جانیدار اسے رہا کرانے کے چکر میں بیچ چکے ہیں اور ہاں! اس ظالم عورت، علی احمد کی ماں نے بیٹے کے جیل جانے کی یہ خیر سنی تھی تو پہلے اسے دل کا



## غزل

یہ جو بادیدہ تر آتا ہے  
روز یہ شخص کدھر جاتا ہے  
زندگی خواب نظر آتی ہے  
خواب کچھ اور نظر آتا ہے  
کوئی صورت ہو بدل جاتی ہے  
کوئی نشہ ہو اتر جاتا ہے  
طور بے طور ہوا چلتی ہے  
تال بے تال شجر گاتا ہے  
ٹوکسی روز ادھر آکر دیکھ  
آساں روز ادھر آتا ہے  
دل سے آگے کوئی صحرانے نباغ  
تو دبے پاؤں کدھر جاتا ہے

رسا چغتائی

دورہ پڑا تھا اور اب فالج سے اس کا نچلا دھڑ بے کار ہو گیا ہے اور اب وہ ظالم عورت رضوانہ سے معافی مانگنا چاہتی ہے مگر میں نے مراد کو کہہ دیا ہے کہ اگر وہ لوگ یہاں آئے تو میں انجام کی پروا نہیں کروں گا میں انہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔

جس نے یہ سب سنا وہ حیران تھا..... کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ رضوانہ ایسے درندوں میں پھنسی ہوئی تھی۔ رضوانہ ہر وقت اپنی بچی کو یاد کر کے روتی رہتی تھی۔ آخر کار سب نے فیصلہ کیا کہ رضوانہ کو صبر دلوانے کے لیے ضروری ہے کہ اس کو بتا دیا جائے کہ اس کی معصوم سی بچی اب جنت کی چنیا بن چکی ہے مگر رضوانہ کو یہ بتانا غلط فیصلہ ثابت ہوا شاید بچی سے ملنے کی آس نے ہی اسے زندہ رہنے کی ہمت دلائی ہوئی تھی۔ جس دن رضوانہ کو اپنی بیٹی کی موت کا علم ہوا اس کا بیٹی پھر شوٹ کر گیا اور ہسپتال لے جانے سے پہلے ہی اس کی دماغ کی رگ پھٹ گئی اور وہ اپنی بچی کے پاس ہی چلی گئی۔

رضوانہ کے اس المناک انجام اور علی احمد کے گھر والوں کی سفاکی نے ان سارے ہی بیٹی والوں کے دل دھلا دیئے جو اپنی بیٹی خالہ صفیہ کے گھر دینا چاہتے تھے..... اب رضوانہ کے ماں باپ بھی پچھتاتے ہیں کہ اگر بیٹی ان کے پاس نہیں آ سکتی تھی تو کم از کم وہ ہی ہر ہفتے اس کا حال پوچھ لیا کرتے مگر انہوں نے تو اس خیال سے کہ بیٹی کا سرال میں زیادہ دل لگے بیٹی سے رابطہ ہی کم کر دیا تھا اور کبھی وہ کچھ بتاتی بھی تھی تو صبر و تحمل کے درس دے کر اسے چپ کر دیتے تھے حالانکہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ ان کی بیٹی کا مزاج شکوے شکایتیں کرنے والا نہیں..... شاید اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ بیٹیوں سے ڈرنے لگتا، ان کے نصیبوں سے ڈر لگتا ہے۔

## میں انصیبوں والی ہوں

محمد اسلم آزاد

ایک رات اچانک میرے پیٹ میں شدید درد اٹھا تو میری آنکھ کھل گئی میں بے چینی سے کروٹیں بدلنے لگی۔ اسی وقت میرے کانوں میں کوئی غیر مانوس سی آواز.....

بلوچستان سے دوسری ہزار کہانی





## آداب شاہی منسوخ

مغلہ تاجدار اور نگ زیب عالمگیر ایک بار نماز جمعہ کے لیے مسجد میں پہنچا۔ کسی سبب اُسے تاخیر ہوئی تھی۔ وہاں اُس نے دیکھا کہ امام مسجد آمد شاہ کا منتظر تھا۔ اور نگ زیب نے کہا: ”وقت مقررہ پر نماز پڑھا دیتے، میرے انتظار کیا ضرورت تھی!“ پھر یہ کہہ کر امام کو برخاست کر دیا کہ جو امام احکام خداوندی کے مقابلے میں آداب شاہی کو زیادہ ملحوظ رکھے وہ امامت کے قابل نہیں۔

اشعر شایان۔ کراچی

کوپینہن آ گیا اور اس کے ہونٹ کانپنے لگے۔ وہ میری طرف دیکھ کر بولی۔ ”نصیبو.....! تو نے کے لیے ٹافیاں لاشاید یہ چپ ہو جائے۔“ یہ کہہ کر اس نے مجھے سیسے دینا چاہے مگر اس سے پہلے ہی ماسی نے آگے بڑھ کر میرے ہاتھ پر 10 روپے رکھ دیئے۔ ”بیٹی.....! پانچ روپے تیرے اور پانچ سنے کے لیے۔ جا اس کے لیے کی ٹائی لے آ۔“ میں خوش خوشی دکان پر چلی آئی۔

جب دکان سے میری واپسی ہوئی تو دیکھا کہ اماں کے پاس بہت سے روپے تھے جنہیں وہ گن رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر ماسی مہتاب نے سرگوشیاں انداز میں اماں سے کچھ کہا اور پھر اٹھ کر چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی اماں مجھ سے بولی۔

”تو اپنے ابا کو مت بتانا کہ ماسی نے مجھے روپے دیئے ہیں بلکہ کہنا کہ اماں محلے والوں سے ادھار لے کر آئی ہے۔“

میں نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ ”ہاں اماں! میں ابا کو یہی بتاؤں گی ویسے ماسی کتنی اچھی ہے جو تیرا اتنا خیال رکھتی ہے۔“ میری باتوں پر اماں خاموش سی ہو گئی پھر مجھ سے کہنے لگی۔ ”بس..... بس..... اپنے ابا کو نہ بتانا ورنہ وہ گھر میں ہنگامہ کھڑا کر دے گا۔“ چونکہ میں بھی ابا کے مزاج سے واقف تھی اس لیے میں نے اثبات میں گردن ہلا دی۔ اگلے دن ہم ابا کے ساتھ شہر گئے اور شاہد کو ایک اچھے ڈاکٹر کو

ساتھ ساتھ مجھے بھی رکید دیئے میں خاموشی سے مار کھا کر اپنے چھوٹے بھائی شاہد کو اٹھا کر ایک کونے میں بیٹھ جاتی۔ میرا یہ چھوٹا بھائی اکثر بیمار ہوتا تھا۔

ایک روز شاہد کو سخت بخار تھا۔ اماں اور میں اس سوچ میں پریشان بیٹھے تھے کہ اس کی دوائی کے لیے کہاں سے پیسوں کا بندوبست کریں؟ محلے والوں سے مدد کھا کر آسرا نہیں تھا، وہ کبھی چینی، کبھی نمک، کبھی مرچ مانگنے پر ہی غصہ کھاتے تھے اُن سے پیسوں کی توقع کیسے کی جاسکتی تھی؟ پھر بھی امی جان ایک دو محلے دار عورتوں کے پاس گئیں مگر کسی نے بھی مدد نہ کی تو مایوسی اور بڑھ گئی۔ اسی وقت ماسی مہتاب آ گئیں۔ اس نے شاہد کی حالت دیکھ کر امی سے کہا۔ ”دیکھو دینا بیٹی! میں نے پہلے بھی تمہیں کہا تھا کہ شاہد کو شہر کے کسی بڑے ڈاکٹر کے پاس لے جاؤ مگر تم کتنی ہی نہیں ہو۔“ اماں نے ایک سرد آدھ بھر کر کہا تھا۔ ”ماسی..... تجھے تو پتا ہے ہمارے پاس تو کھانے کو لالے پڑے ہیں شاہد کے علاج کے لیے کہاں سے پیسے لائیں؟“

”میں نے تو تجھے بہت سمجھایا ہے کہ میری بات مان لے مگر تو اپنی ضد پر اڑی ہوئی ہے۔ اب ایسے تیرا بچہ کیسے ٹھیک ہوگا اور نہ ہی تیرے گھر کے حالات! ڈاکٹر روز لڑائی جھگڑے میں اپنی زندگی تباہ و برباد نہ کرنا اپنے معصوم بچے پر ظلم کر بس تو میری بات مان لے اور ہاں کر دے۔“ ماسی مہتاب کی باتوں پر اماں

ہے اور جب کسی سفید پوش کی میلی نظر مجھ پر پڑتی ہے تو یہی کچرے کا ڈھیر میرے لیے امان مہیا کرتا ہے۔ میں کچرے کے اس ڈھیر میں گر کر اپنی عزت بچاتی ہوں کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ یہ سفید پوش بھیڑیے اپنے من کے میلے ہونے کی فکر نہیں کرتے بلکہ انہیں سفید کپڑوں کی زیادہ فکر ہوتی ہے۔ انہیں صرف یہی فکر ہوتی ہے کہ کہیں ان کی پوشاک پر کوئی داغ یا دھبہ نہ لگ جائے اس لیے میرے میلے بدن سے اٹھتی ہوئی بدبو انہیں دور کرنے کے لیے کافی ہوتی ہے ورنہ یہ سفید پوش بھیڑیے جانے کب کے مجھے پیر پھاڑ کر اپنا شکار کر چکے ہوتے.....

جب میں نے اس دنیا میں آنکھ کھولی تو غربت اور جہالت میری منتظر تھی۔ ابا ایک محنت کش تھا مگر نشے کی لت میں مبتلا تھا، نشے نے اس کی زندگی کو کھوکھلا کر کے رکھ دیا تھا جس سے وہ محنت مزدوری کم کرتا، نشہ زیادہ کرتا تھا، یوں گھر میں تنگ دستی نے ڈیرے ڈال دیئے تھے ہر وقت آٹا، گھی، چینی نہ ہونے پر اماں ابا میں جھگڑا ہوتا رہتا تھا، فاقوں سے تنگ آ کر اماں ابا سے لڑتیں تو اور کیا کرتیں؟ دن بھر گھر سے باہر رہنے والا شوہر جب شام کو نشے میں دھت آئے تو اس کی بیوی اور بچوں کو ہی اس دکھ اور غم کا اندازہ ہوتا ہے، دوسرے لوگ مثلاً محلے دار رشتے دار تو بس ان پہ ہنستے ہیں اور تماشا دیکھتے ہیں۔ جب اماں اور ابا میں جھگڑا ہوتا تو محلے دار دیواروں سے کان لگا کر سنتے یا جھانک کر دیکھتے کہ ابا نے میری امی کی ہڈی پہلی تو ایک نہیں کر دی؟

اسی شور شرابے لڑائی جھگڑوں اور چیخ و پکار کے ماحول میں، میں جوانی کی دہلیز پر پہنچی تھی۔ میرا بڑا ہونا میرے لیے عذاب سے کم ثابت نہیں ہوا تھا کیونکہ ابا اپنا غصہ اب مجھ پر بھی اتارنے لگے تھے۔ جب بھی اماں ابا میں جھگڑا ہوتا تو ابا، اماں کے

جانے کتنے سال بیت گئے میرے اندر خاموشی ہے اداسی ہے رنج کا موسم ہے اور آنکھوں سے اشکوں کی برسات جاری ہے۔ میرے اس درد و غم میں میرا کوئی غم گسار نہیں، کوئی ہمد نہیں، کوئی ہمدرد نہیں۔ میں تنہا یہ سب جھیل رہی ہوں۔ میرے تن پر تار تار لباس ہے جس کا دامن اشکوں سے بھیگا ہوا ہے اور آس پاس کچرے کے ڈھیر سے اٹھتی ہوئی بدبو ہے۔ خزاں رسیدہ پتے ہیں۔

میں اس کچرے کے ڈھیر کے قریب ایک سڑک کنارے پیڑ کے نیچے برسوں سے زندگی کا زہریلا رہی ہوں شاید میرے دکھ میرے غم اس پیڑ سے بھی نہیں دیکھے جاتے اسی لیے ہر دم اس پر بھی خزاں کا موسم طاری رہتا ہے۔ میں جب بھی سسکیاں لے کر رونے لگتی ہوں تو یہ بھی میرے ساتھ دوتا ہے۔ اس کے زرد پتے اشک بن کر میری جھولی میں گرتے ہیں۔ میں ان پتوں کو بڑے پیار سے چومتی ہوں اور پھر بھی بھر کر اس درخت سے اپنے دل کی بات کرتی ہوں اور اپنا غم بٹاتی ہوں تو مجھے ایک سکون سا حاصل ہو جاتا ہے۔

میرا کوئی گھر نہیں ہے، سڑک کنارے یہ پیڑ ہی میرے لیے چھت اور گھر کا کام کرتا ہے۔ لوگ مجھے پاگل سمجھتے ہیں، میری برباد زندگی پہ ہنستے ہیں میرا تماشا بناتے ہیں اور اپنے لیے تفریح کا سامان پیدا کرتے ہیں۔

مگر میں انہیں کیسے بتاؤں کہ میں پاگل نہیں دیوانی نہیں بلکہ میں خود جان بوجھ کر کبھی پاگل بنی ہوئی ہوں، کبھی ہنستی ہوں تو کبھی روتی ہوں۔ میں کچرے کے ڈھیر سے اپنے لیے ضروریات زندگی کشید کرتی ہوں۔ لوگ اپنے بوسیدہ کپڑے یہاں پھینک جاتے ہیں وہ میرا بدن ڈھانپنے کے کام آتے ہیں۔ باسی جھوٹا کھانا، گلے سڑے پھل فروٹ کچرے سے جن کر میں اپنے پیٹ کی دوزخ کو بھرتی ہوں اور اس آگ کو بجھاتی ہوں جو بھوک کی صورت میرے اندر لگی ہوئی



## غزل

میں ستاروں کی ضیا ہوں مجھے جانتے نہیں ہو  
میں زمین کی صدا ہوں مجھے جانتے نہیں ہو  
مجھے آزمانے والو! اتنا خیال رکھنا  
میں رسول کا گدا ہوں مجھے جانتے نہیں ہو  
بھری انجمن میں اس نے مجھے بے وفا کہا ہے  
ارے کیا میں بے وفا ہوں! مجھے جانتے نہیں ہو  
میں چراغ مفرد ہوں مجھے تیرگی سے ڈر کیا  
میں ہواؤں میں جلا ہوں مجھے جانتے نہیں ہو  
میں سدا بہار گل ہوں کوئی دشت ہو یا صحرا  
میں ہراک جگہ کھلا ہوں مجھے جانتے نہیں ہو

جاوید ثانی۔ جند انوالہ (بھکر)

دکھایا۔ کچھ دنوں میں شاہد کی طبیعت بہتر ہونے لگی  
ساتھ ہی گھر میں بھی ایک تبدیلی آنے لگی۔ پہلے جو  
روز شور شراب لڑائی جھگڑا ہوتا تھا وہ اب تقریباً ختم  
ہو گیا تھا کیونکہ گھر کی غربت میں جو کمی آتی جارہی  
تھی۔ اماں کے مرجھائے ہوئے چہرے پر اب ہمیشہ  
ایک مسکراہٹ سی رہتی تھی اور اس کی رنگت بھی بدلنے  
لگی تھی۔ کبھی کبھی اماں حد سے زیادہ خوش ہوتی اور  
بناؤ سنگھار کرتے ہوئے دیر تک آئینے کو مکتی رہتی  
تھی۔ میری اماں کی عمر زیادہ نہیں تھی وہ بہ مشکل تیس  
سے اوپر کی ہوگی اس کا ناک نقشہ بھی اچھا تھا۔  
بہر حال گھر کی اس پرسکون زندگی پر میرا دل خدا کا  
شکر ادا کرتا رہتا تھا۔

ایک رات اچانک میرے پیٹ میں شدید سا  
درد اٹھا تو میری آنکھ کھل گئی میں بے چینی میں کروٹ  
بدلنے لگی۔ اسی وقت میرے کانوں میں کوئی

غیر مانوس سی آواز آئی۔

”وینا..... تم اب تو خوش ہونا؟ میں نے  
تمہاری ہر خواہش پوری کر دی ہے تمہارا بیمار بچہ  
ٹھیک ہو گیا، تمہارے گھر کے حالات ٹھیک ہو گئے  
اب تم کسی بھی چیز کے لیے محلے داروں کی محتاج نہیں  
ہو بلکہ جو بھی حکم کرتی ہو میں حاضر کر دیتا ہوں۔ تمہارا  
شوہر بھی نہیں لڑتا ہے۔ تمہارے چہرے کا رنگ بھی  
کھلنے لگا ہے، تم خوب سے خوب تر ہوتی جا رہی ہو۔  
تمہارے اسی حسن اور خوبصورتی نے مجھے بے چین  
کرویا تھا تبھی تو میں ماسی مہتاب کو کہتا تھا کہ وہ نہیں  
منائے۔ یہ انجانی سی آواز سن کر میرے پاؤں تلے  
سے زمین نکل گئی اور پیٹ کا درد بھی غائب ہو گیا۔  
مجھے ساری بات سمجھ میں آ گئی تھی ماسی مہتاب گویا  
شیطان عورت تھی جس نے میری ماں کو اس راہ پر لگایا  
تھا اور میری ماں عسرت و تنگ دستی سے مجبور ہو کر اس  
راہ پر چل نکلی تھی۔

اس وقت میرے ابا بھی گھر میں تھے مگر وہ نشے  
میں دھت پڑے ہوئے تھے جبکہ اس غیر مرد کے پہلو  
میں اماں بیٹھی پیار بھری باتیں کر رہی تھیں۔ یہ منظر  
دیکھ کر مجھ سے رمانہ گیا اور میں نے اچانک شور مچانا  
شروع کر دیا۔ وہ شخص گھبرا کر فوراً دیوار پھلانگ کر  
بھاگ گیا مگر اماں نے مجھے پکڑ لیا اور چیخ چیخ کر ابا کو  
جگاتے ہوئے کہا۔

”تم تو نشے میں دھت ہو کر پڑ جاتے ہو اور  
تمہاری بیٹی کس گل کھلا رہی ہے یہ نہیں جانتے۔ شکر  
ہے میری آنکھ کھل گئی ورنہ یہ تو اپنا منہ کالا کر چکی  
ہوتی۔“ یہ سنتے ہی ابا نے آؤ دیکھنا نہ تاؤ اور مجھ پر  
پل پڑے لاٹوں گھونسوں کی بارش کرتے ہوئے  
انہوں نے مجھے گھر سے نکال دیا۔

”کیمین..... اگر تو نے اس گھر میں دوبارہ قدم  
رکھا تو تیری خیر نہیں میں تیرے نکلے کر دوں گا۔“

میں تو جیسے پتھری بن گئی مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ  
ماں ایسی بھی ہوتی ہے؟ اماں نے اپنا سارا گند میرے  
اوپر ڈال دیا تھا، میں اس گند کا بوجھ اٹھائے اسی وقت  
رات کی تاریکی میں کوسوں میل دور ایک چھوٹے سے  
ریلوے اسٹیشن پر آئی اور رین میں بیٹھ کر شہر آ گئی۔ شہر  
پہنچی تو ہزاروں گندی نظریں مجھے روندنے کے لیے  
بے تاب تھیں۔ ان سے بچنے کے لیے میرے پاس  
سوائے اللہ پاک کے اور کوئی مددگار نہ تھا۔ شہر میں  
گزری پہلی رات جوں جوں بڑھ رہی تھی میرے دل  
میں ایک خوف اور ڈر پیدا ہوتا جا رہا تھا کہ جانے  
میرے ساتھ کیا ہوگا؟ اسی خوف میں مجھے کھانے پینے  
کا بھی کچھ ہوش نہ تھا۔ اگر فکر تھی تو بس اپنی عزت  
کی۔ میں سڑک کنارے لگے اس درخت کے نیچے  
سہمی سکرٹی بیٹھی ہوئی تھی۔ نصف شب ہو چکی  
تھی میری آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔ اسی وقت  
دور سے ایک موٹر سائیکل کی روشنی نظر آئی۔ لمحوں میں  
وہ گاڑی میرے قریب آئی اس پر دو پولیس اہلکار سوار  
تھے۔ مجھ بے آسرا تنہا لڑکی کو دیکھ کر قانون کے ان  
رکھوالوں کی نیت میں کھوٹ آ گیا۔ رات کے سائے  
میں انہوں نے میری عزت پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش  
کی۔ میں نے ان کی بہت مت سماجت کی واسطے  
میں نے گران پر شیطان سوار تھا۔ ان میں سے ایک مجھے  
دبوچنے کے لیے آگے بڑھا تو خود کو بچانے کے لیے  
میں پیچھے ہٹی تو میرا پاؤں پھسل گیا اور درخت کے  
قریب بے گندے نالے میں گر گئی۔ یہ دیکھ کر وہ  
دونوں بھاگ گئے۔ میں نے بڑی مشکل سے خود کو  
نالے سے نکالا اور اسی حالت میں درخت کے نیچے  
ذری سہمی بیٹھی رہی۔

اگلی صبح جب سورج طلوع ہوا تو میرے بدن  
سے اٹھتی ہوئی بدبو سے لوگ میرے پاس آنے کے  
بھائے مجھ سے پرے ہٹ کر چلنے لگے تب مجھے

اندازہ ہوا کہ یہ سفید پوش لوگ سفید تن پسند کرتے  
ہیں، اگر مجھے اپنی عزت پیاری ہے تو مجھے اسی طرح  
جینا پڑے گا۔ کچرے کے ڈھیر سے کھانا پینا اوڑھنا  
حاصل کرنا پڑے گا اور کچرے کے ڈھیر پر ہی زندگی  
بسر کرنی پڑے گی۔ اماں نے مجھ پر جو اپنا گند ڈالا  
تھا اس گند سے یہ گند تو بہر حال لاکھ درجہ بہتر تھا۔

بس اسی دن سے شہر کے کوڑا کرکٹ کے  
ڈھیروں سے کھانے پینے کی اشیاء اور دیگر فالتو  
چیزیں چن چن کر اپنا دن گزارتی ہوں اور رات کو اسی  
کچرے کے ڈھیر پر سو جاتی ہوں، یوں زندگی کی  
جنگ لڑ رہی ہوں۔ اب سڑک کنارے چلتے پھرتے  
لوگوں کی بری نگاہوں، جن سے مجھے کوئی خوف نہیں  
کوئی ڈر نہیں خطرہ نہیں۔ یاں، اگر میرے گندے  
بدن سے بدبو نہ اٹھ رہی ہوتی تو شاید لوگوں کی میلی  
آنکھیں میرے من کو بھی کب کا میلا کر چکی ہوتیں۔  
میرا نام نصیبور کھا گیا تھا۔ آج سوچتی ہوں شاید  
میں نصیبوں والی ہوں کہ میرے مقدر میں بدبو دار  
زندگی ضرور ہے مگر ذلت بھری زندگی نہیں۔“

نصیبو کی یہ کہانی اس کی اپنی زبانی میں نے  
اسی کچرے کے ڈھیر کے قریب بیٹھ کر سنی ہے  
جہاں وہ رہتی ہے۔ بے شک اس کا بدن گندہ تھا  
اس کا لباس میلا تھا اس کے جسم سے ناقابل  
برداشت بدبو اٹھ رہی تھی مگر وہ اندر سے انتہائی  
پاکیزہ تھی۔ اب میری کوشش ہے کہ اس کے رہنے  
کے ٹھکانے کا کوئی بندوبست کر دوں جہاں وہ اپنی  
زندگی عزت کے ساتھ گزار سکے اور معاشرے  
کے بھٹیڑیوں سے بھی محفوظ رہے۔ اگر آپ میں  
سے کوئی میری اس نیکی میں مدد کرنا چاہے تو مجھ  
سے ضرور رابطہ کیجیے گا۔



## اللہ پر کھمروسہ

### کھیلانجم طارق

وہ اسی طرح باقاعدگی سے نماز تہجد کے لیے بیدار ہوتی تھی۔ اب اُس کی دعاؤں میں شدت آ گئی تھی۔ وہ رہ دعائیں مہیر ہی کو مانگتی تھی اور اللہ تعالیٰ سے اپنی محبت کے سرخرو ہونے کی التجا کرتی.....

### لاہور سے تیسری نماز تہجد



رات حسب معمول دھیرے دھیرے بیت رہی تھی۔ وہ اٹھ بیٹھی تھی۔ اسے اندھیرے سے اجالے تک کا سفر بہت بھاتا تھا۔ جب فانی دنیا کے فانی ہو جانے والے لوگ اپنے اپنے بستروں پر بیٹھی نیند کی آغوش میں سو رہے تھے جب ہر سو سناٹا اور پُر کیف سی خاموشی کا راج ہوتا تھا تب وہ اپنا گرم بستر چھوڑتی اور وضو کر کے نماز تہجد کے لیے نیت باندھ لیتی۔ یہ معمول چند مہینوں سے اُس کی روٹین کا حصہ بن گیا تھا۔ ویسے وہ بچپن ہی سے نماز اور روزوں کی پابندی کرتی چلی آ رہی تھی گوکہ گھر کا ماحول بہت زیادہ مذہبی نہیں تھا اور نہ ہی اُس پر کوئی دباؤ تھا تاہم وہ اپنے رب کی محبت میں باقاعدگی سے اس کے آگے بھٹکا کرتی تھی۔ وہ تین بجائیوں کی اکلوتی بہن تھی اور اس کا نام خوشبو تھا۔ خوشبو کی عادت تھی کہ وہ اپنا ہر کھٹہ ہر سکھ اپنے مالک حقیقی سے بیان کرتی تھی۔ ہر معاملے میں اس سے رہنمائی اور مدد حاصل کرتی تھی۔ اس عمل سے اسے دل سکون اور روحانی اطمینان حاصل ہوتا تھا اور یہ اندرونی سکون اور خوشی جب اس کے چہرے سے چھلکتی تو اس پر ایک خاص قسم کی چمک نمایاں ہو جاتی تھی۔ یادِ الہی سے اُسے تسکین و راحت ملتی تھی۔

اس نے فوراً بستر چھوڑ دیا اور کلمہ پاک کا ورد کرتے ہوئے باہر آ گئی۔ وضو کے بعد نماز تہجد کی دو رکعت کے لیے نیت باندھ لی۔ اُس کا یقین تھا کہ پروردگار عالم تہجد کی نماز پڑھنے سے اُس کی ہر مشکل کو آسان کر دیتا ہے۔ اُس کی دعاؤں کو قبولیت کا شرف عطا کرتا ہے اُس کی مغفرت کرتا ہے اور اُسے اپنے قرب سے نوازتا ہے۔

نماز سے فارغ ہو کر وہ دعاؤں اور وظائف میں مشغول ہو گئی یہاں تک کہ مساجد سے اذان فجر کی پیش صدا آئیں بلند ہونے لگیں اور ساعتوں میں رس

گھولنے لگیں۔ نماز فجر کے بعد وہ دوبارہ سو جاتی تھی اور پھر صبح دس بجے سے لے کر عشاء تک اُس کے روزمرہ کے کام ملتے رہتے تھے۔

خوشبو کے خواب اکثر سچے ہوتے تھے۔ اُن دنوں وہ ایک خواب کثرت سے دیکھ رہی تھی کہ وہ پھولوں کے ڈھیر کے پاس بیٹھی ہوئی ہے اور پھول توڑ توڑ کر اپنی خوبصورت سی ٹوکری میں ڈالتی جا رہی ہے۔ اچانک سیاہ لباس میں ملبوس عورت آتی ہے اور اُس کی پھولوں بھری ٹوکری چھین کر دور پھینک دیتی ہے لیکن خوشبو اپنی ٹوکری اٹھا لاتی ہے اور نئے سرے سے پھول جمع کرنے میں لگ جاتی ہے۔

یہ خواب مسلسل کئی روز سے اسے نظر آ رہا تھا تاہم اس کی تعبیر اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ ایک دن اُس کے موبائل پر اس کی خالہ کے بیٹے نے میسج بھیجا کہ وہ ہمیشہ کے لیے اس کا ہونا چاہتا ہے کیا وہ اس کا ساتھ دے گی؟

خالہ زاد مہیر کا یہ پیغام اُس کے دل کو ایک نئی خوشی سے سرشار کر گیا۔ وہ دل ہی دل میں مہیر کو چاہتی تھی مگر نہیں جانتی تھی کہ اُس طرف بھی ہے آگ برابر لگی ہوئی..... حالانکہ وہ کردار کی بہت مضبوط لڑکی تھی لیکن مہیر وہ پہلا لڑکا تھا جس نے اُس کے دُورِ دل پر بیٹھی سی دستک دے ڈالی تھی۔ وہ جو ہر مشکل میں رب تعالیٰ سے مدد لیتی آئی تھی اُس بار بھی اُس نے اپنا یہ معاملہ اس کی عدالت میں پیش کر دیا اور اس سے مدد طلب کی۔ خوشبو نے نمازِ استخارہ کے ذریعے اللہ تعالیٰ سے مدد لی۔ پہلے ہی روز اسے تیز اور واضح سبز روشنی نظر آئی جس کا مطلب بالکل صاف تھا کہ یہ لڑکا اُس کے لیے بہتر رہے گا۔ اب

اس کی سمجھ میں اپنا خواب بھی آ گیا تھا۔ خوشیاں اُس کے گھر کا راستہ دیکھ رہی تھیں۔ اللہ سے مشورے کے بعد اُس نے مہیر کو جواب دیا کہ وہ اپنے والدین کو بھیج



سکتا ہے۔

وہ مطمئن تو ہوگئی تھی پر اُس کے دل میں ایک اندیشہ سر اٹھا رہا تھا کہ اُس کی خالہ اور ماں کے درمیان عرصے سے اختلافات چلے آ رہے تھے جو کسی صورت ختم ہونے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ اس جھگڑے کی وجہ اُس کی اپنی ماں جی چوہانی بہن سے خدا واسطے کا بیزاری تھی اور بھری محفل میں اپنی سگی بہن کو بے عزت کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتی تھی۔ اس کی ماں اور خالہ کی لڑائی کا فائدہ اس کے سگے ماموں اٹھاتے تھے جو اس کی ماں کے کان بھرتے رہتے تھے۔ شفقت بیگم کانوں کی ذرا کچلی تھیں، بغیر تحقیق کے بھائی کی باتوں پر ایمان لے آتیں اور وہی کرتیں جو وہ کہتے تھے نتیجتاً دونوں بہنوں میں دوریاں بڑھنے لگیں اور غلط فہمیوں نے دلوں میں دراڑیں ڈال دیں۔ غلط فہمیوں کو دور نہ کیا جائے تو رشتے ناتے اعتباراً محبت، سکھ سب کچھ تباہ ہو جاتا ہے اور خوشبو نہیں چاہتی تھی کہ ایسا ہو۔ دوسری طرف مہیر کی بھی یہی گوش خمی کہ دونوں بہنیں پھر سے ایک ہو جائیں تاکہ اُن کے ملن کی تمام رکاوٹیں دور ہو جائیں۔

خوشبو کے ماموں اپنے نکے اور آوارہ بیٹے کے لیے خوشبو کا رشتہ چاہتے تھے دوسری طرف خوشبو کی خالہ مہیر اور خوشبو کو ایک دیکھنا چاہتی تھیں کیونکہ وہ جانتی تھیں اُن کا بیٹا مہیر دیوانوں کی طرح خوشبو کو چاہتا ہے مگر یہ بات اُس کے ماموں کو بری طرح کھٹک رہی تھی سو وہ اپنی سگی بہن کی راہ میں کانٹے بچھا کر اپنے بیٹے کے لیے راہ ہموار کر رہے تھے اس بات سے بے خبر کہ اوپر والے کی اپنی تدبیر ہوتی ہے اس کی مرضی کے بغیر پتا بھی نہیں مل سکتا۔ مہیر جو کہ پڑھا لکھا تھا برس برس روزگار تھا لائق تھا اور ہر لحاظ سے موزوں تھا پر خوشبو کی امی اُسے بالکل لفت نہیں

کراتی تھیں۔ وہ اپنی اکلوتی بیٹی کے لیے امیر کبیر شخص کا رشتہ چاہتی تھیں جو اُن کی بیٹی کو کسی بھی چیز کے لیے ترسائے نہیں اور خوشبو اپنی ماں سے اختلاف کرتی، اُس کا کہنا تھا۔

”امی.....! اگر میں اتنی زیادہ دولت کے باوجود خوش نہ رہ سکی تو کیا فائدہ دولت کا اور دولت مند شخص کا؟ خوش رہنے کے لیے دولت نہیں محبت کرنے والے مخلص انسان کا ساتھ چاہیے ہوتا ہے۔“

شفقت بیگم اپنی بیٹی کی باتوں کو بھگانے سوچ سے تعبیر کرتیں اور نظر انداز کر دیتی تھیں جبکہ خوشبو سن ہی من میں مہیر کو چاہنے لگی تھی لیکن امی کے ڈر کی وجہ سے اُس نے یہ بات اپنے دل کے اندر ہی دبا کر رکھی تھی۔ گھر میں کسی کو بھی اُس کی اور مہیر کی پاکیزہ محبت کا علم نہ تھا۔

خوشبو اور مہیر دونوں رُب کے حضور اپنے ملن کی دُعائیں مانگتے تھے۔ اُن کے دُعا نفاذ اور نواقل میں شدت آنے لگی تھی۔ اچھے وقت کے انتظار اور رُب پہ مکمل بھروسے نے انہیں ایک نئی ہیئت دی تھی۔

اُس روز مہیر کی امی اپنے بیٹے کی خواہش پر رشتہ لے کر اپنی بہن کے گھر پہنچ گئیں مگر جوں ہی انہوں نے رشتے کی بات کی شفقت، بیگم بھڑک اٹھیں۔

”تمہاری ہمت کیسے ہوئی میری پھول جیسی بیٹی کا ہاتھ مانگنے کی؟ کہاں تمہارا بیٹا اور کہاں میری شہزادی۔ میری بیٹی کو مہیر خاک خوش رکھ پائے گا جب جب ہر وقت خالی رہتی ہو۔“ انہوں نے اُس کی اچھی خاصی نوکری کو بھی خاطر میں نہ لاتے ہوئے تنگ دلی کا طعنہ دے دیا حالانکہ مہیر اچھا کماتا، خوش حال تھا اور اس قابل تھا کہ اپنی بیوی کی بنیادی ضرورتیں پوری کر سکے۔

”شفقت باجی.....! یہ غلط ہے، مہیر کے پاس اللہ کے کرم سے سب کچھ ہے۔“ مہیر کی امی نے جواباً کہا۔

”ارے جاؤ، جاؤ بڑے آئے رئیس زادے..... تم جیسے ٹٹ پونجیوں کے ہاتھ میں اپنی بیٹی کا رشتہ ہرگز نہیں دوں گی۔ اگر ذرا بھی عزت عزیز ہے تو اپنے گھر کا راستہ لو اور دوبارہ ادھر کا رخ کرنے کی زحمت بھی نہ کرنا۔“ خوشبو کی امی نے اپنی بہن کو بے عزت کر کے نکال دیا اور وہ شرمندگی اور بے عزتی کا احساس لیے وہاں سے چلی آئیں۔

ادھر خوشبو اپنی امی کے تنک آمیز رویے کی وجہ سے سخت شرمندہ تھی تو دوسری طرف مہیر اپنی امی کی اس بے عزتی پر سخت ناراض تھا اب وہ مایوس بھی ہونے لگا لیکن خوشبو کو اپنے رُب پر پختہ یقین تھا۔ وہ اب بھی پرامید تھی اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ اللہ تعالیٰ اُس کی مدد ضرور کرے گا۔

وہ اسی طرح باقاعدگی سے نماز تہجد کے لیے بیدار ہوتی تھی۔ اب اُس کی دُعائوں میں شدت آگئی تھی۔ وہ ہر دُعا میں مہیر ہی کو مانگتی تھی اور اللہ تعالیٰ سے اپنی محبت کے سرخرو ہونے کی التجا کرتی۔ رُب سے اُس کے راز و نیاز خوب ہوتے تھے۔

”یا اللہ! تو جانتا ہے کہ میری خواہش کیا ہے میری چاہت کیا ہے؟ وہ مجھے اپنا ناچا ہوتا ہے۔ ہماری راہ کی دیوار اور رکاوٹوں کو ختم کر دے۔ میری ماں کی نفرت کو محبت میں بدل دے۔ میرے مولا! تو‘ تو شہ رگ سے بھی قریب ہے۔ میرے مہیر کو میرا کر دے ہماری اس آزمائش کو ختم کر دے اور ہمیں ایک کر دے۔“

مہیر اور خوشبو کی خاموش چاہت کو دو سال ہو گئے اس عرصہ میں مہیر کی بڑی بہن اور خوشبو کے بڑے بھائی کی بھی شادی ہوگئی۔ مہیر کے گھر والوں

نے شادی پر خوشبو کے گھر والوں کو دعوت دی تھی لیکن شفقت بیگم اپنی اُن کی تسکین کے لیے نہ گئیں جبکہ اپنے بیٹے کی شادی میں مہیر اور اس کی فیملی کو اصرار کر کے بلالیا۔ وہ شریف لوگ سب کچھ بھلا کر اُن کی خوشیوں میں شریک ہو گئے۔ اس عمل سے خوشبو کے دل میں مہیر اور اس کی عزت میں اور اضافہ ہو گیا۔

مہیر نے چار سالوں کے دوران خود کو شفقت بیگم کے کڑے معیار پر لانے کے لیے سخت محنت کی اُس کی کوششیں رنگ لائیں اور وہ ترقی کرتا ہوا بڑے عہدے تک پہنچ گیا ساتھ ساتھ اُس کا کاروبار بھی چمک اٹھا جو اُس نے سائیڈ بزنس کے طور پر شروع کیا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ مزید خوش حال ہو گیا۔ شفقت بیگم کی نظریں بھی مہیر کی بدلتی حالت سے لالچ سے چمکنے لگیں چنانچہ اب انہیں مہیر اور خوشبو کے رشتے پر کوئی اعتراض نہیں رہا تھا لہذا ایک روز انہوں نے بہن سے خود اس رشتے کا اظہار کر دیا۔ بہن کو بھلا کیا اعتراض ہوتا وہ تو خود ہی چاہتی تھیں لہذا خوشبو اور مہیر کی شادی دھوم دھام سے ہو گئی۔

آج وہ دونوں اپنی جنت میں بے حد خوش ہیں۔ دونوں فرض نماز کے علاوہ نماز تہجد بھی باقاعدگی سے ادا کرتے ہیں اور اپنے رُب سے اور بھی زیادہ قریب ہو گئے ہیں۔ یہ رُب پر اُن کا یقین ہی تو تھا جس نے انہیں مایوس نہیں ہونے دیا تھا، بکھرنے نہیں دیا تھا۔ اُن کی دُعائیں اور محنت رنگ لائیں اور وہ ایک ہو گئے۔ واقعی رُب پر غیر متزلزل یقین ہو تو طوفان جیسے مسائل، مصیبتیں یا پریشانیاں کوئی معنی نہیں رکھتیں۔ اللہ کے ہاں دیر ضرور ہے پر اندھیر نہیں۔

☆☆☆



## میری بہن میری دشمن

سدرہ انور علی

لیکن پھر میری آنکھوں کے آگے اندھا چراغاں کیا وہ آتے ہی سونے پر لیٹ گیا۔ اس کے کان سے موبائل فون لگا ہوا تھا وہ آہستہ آواز میں فون پر کسی سے بات کر رہا تھا فون کے دوسری طرف.....

میرا دل سے سرزد ہونے لگا



تشنے کستی رہتی تھی۔ مجھے بہت دکھ ہوتا اپنی بہن کے رویے سے، ابھی کبھی تو وہ اس حد تک گزر جاتی کہ مجھ سے برداشت نہ ہوتا مگر میں صبر کے گھونٹ پی کر رہ جاتی۔ اس کی باتیں ایسی ہوتیں جیسے وہ غسل کے غلاف میں لپیٹ کر مجھے جوتے مار رہی ہو۔ اس کے الفاظ میرا دل چھلنی کر دیتے تھے۔ وہ اپنے دوستوں میں رشتے داروں میں میرے خلاف بولتی میری جھولی بچی باتیں بنا کر انہیں بتاتی۔

ایک بار تو اس نے حد ہی کر دی میرے بیک میں ایک نازیا انگلش مودی کی سی ڈی ڈال دی۔ اسکول میں اس نے میرے ساتھ بیٹھنے والی لڑکی کو نہ جانے کیا کہا کہ اس نے میرے بیک سے وہ سی ڈی نکال کر پتھر کو دے دی اور پھر کلاس میں میری وہ انسلٹ ہوئی کہ الفاظ میں بیان نہیں کر سکتی۔ احساس ذلت سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں اپنی صفائی میں کچھ نہ کہہ سکی کہ ڈسک تو میرے ہی بیک سے نکلی تھی۔ پیچھرنے مجھے کلاس سے نکال دیا۔ بریک کے ٹائم میں فریج پر ملی تو اس کے ہونٹوں پر چمکتی مسکراہٹ دیکھ کر مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ کام اسی کا ہے لیکن میں کیا کر سکتی تھی آخر وہ میری بہن تھی اور مجھے اس سے بہت محبت تھی۔ امی کے بعد میں اسے اپنی ماں کی جگہ سمجھتی تھی۔ میں نے بھی اس سے زبان درازی نہیں کی تھی اس کے ظلم دیکھ کر میں صبر کے گھونٹ پی کر رہ جاتی تھی۔ کیا خوبصورت ہونا جرم تھا؟ مجھے ذلیل رسوا کر کے اسے بہت خوش محسوس ہوتی تھی اپنی تسکین کی خاطر اس نے مجھے اتنا تنگ کیا جس کی کوئی حد نہیں، میں راتوں کو اٹھ اٹھ کر روتی، اپنی بہن کے لیے دعا کرتی کہ اللہ اسے ہدایت دے۔ ویسے تو وہ مجھ سے بیرکھتی تھی مگر پاپا کے سامنے وہ میرے ساتھ ایسا دوستانہ رویہ اپناتی اس کے لہجے میں اتنی چاہت ہوتی کہ میرا دل چاہتا

ہم چار بہنیں اور دو بھائی تھے بڑی دو بہنیں شادی شدہ اور اپنے گھروں میں آباد تھیں۔ میری امی جان چند سال پہلے کینسر جیسے مہلک مرض کی وجہ سے نہیں روتا بلکتا ہوا چھوڑ کر اس بے رحم دنیا سے کوچ کر گئیں۔ دونوں بھائی چھوٹے ہیں جو ابھی پڑھ رہے ہیں۔ مجھ سے بڑی بہن اور میں بھی ابھی اپنی پڑھائی میں مصروف تھے کہ پاپا کو ہماری شادی کی فکر لگ گئی پھر یوں ہونے لگا کہ اکثر ہی لوگ ہمیں دیکھنے آنے لگے جن میں سے کوئی ہمیں پسند نہ آتا اور کسی کو ہم نہ بھاتے۔ میری بڑی بہن فریج جو کہ مجھ سے صرف ایک سال ہی بڑی تھی وہ بچپن سے ہی بہت ضدی اور گھر بھر کی لاڈلی تھی۔ ہمارے پاپا نے ہمیں کسی چیز کی کمی محسوس نہ ہونے دی تھی۔ انہوں نے ہمیں ماں کا پیار بھی دیا اور باپ کا بھی۔ فریج کی ضد کا پاپا نے بھی برائہ منایا تھا وہ اس کی ہر جائز ناجائز بات پوری کرتے تھے۔ ہم چاروں بہنوں میں فریج کی رنگت گہری سانولی تھی، میں نقش البتہ ٹھیک تھے۔ اگر اس کا رنگ ذرا سا گورا ہوتا تو وہ بہت ہی خوبصورت لگتی۔ لوگ ہمیں دیکھتے تو باتیں بناتے کہ باقی بہنیں تو خوبصورت ہیں یہ کس پر گئی ہے؟ لوگوں کی باتیں سن کر وہ چڑچڑی ہوئی چلی گئی اور پھر ہر بات میں اپنا اور میرا موازنہ کرنے لگی۔ اب وہ ہر معاملے میں مجھ سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتی تھی اسی لیے اس نے اپنا زیادہ وقت کتابوں میں لگانا شروع کر دیا تھا کیونکہ میں پڑھائی میں تیز تھی اور وہ اس راہ پر مجھے پیچھے چھوڑنا چاہتی تھی۔ وہ ہر طرح سے مجھ سے آگے جانے کی کوشش کرتی تھی بلکہ یوں کہتا بے جا نہ ہوگا کہ مجھ سے جلنے لگی تھی شاید وہ اپنی رنگت کی وجہ سے احساس کسری کا شکار ہو گئی تھی لیکن اس میں میرا قصور تھا؟ لیکن اس کے باوجود وہ مجھ پر طعن



کاش یہ لحاظ یہیں رک جائیں۔

اُن دنوں میں تھرڈ ایئر میں اور فریج فور تھ ایئر میں تھی کہ ایک روز ابو نے فریج کو کہا کہ بیٹا! کل تم تیار رہنا میرے ایک دوست کی نکلی تمہیں دیکھنے آئے گی اور کھانے پر بھی اچھا سا انتظام کر لیں۔

”جی اچھا“ فریج نے سعادت مندی سے جواب دیا تھا لیکن فریج نے اس بات کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی البتہ میں نے دوسرے دن کالج سے چھٹی کر لی اور تمام گھر کی صفائی کر کے ملازمہ کے ساتھ کھانا تیار کیا اور ساتھ ہی فریج آپ سے کہا۔

”آپی!..... آپ تیار ہو جاؤ اچھے سے کپڑے پہن لو۔ میرا خیال ہے آپ پارر چلی جائیں۔“

میری بات پوری ہوتے ہی اس نے قہقہہ لگایا۔

”اگر کسی نے مجھے پسند کرنا ہے تو اسی حلیے میں کر لے گا ورنہ جہنم میں جائیں مجھے شادی نہیں کرنی۔“ اس کی بات پر میں دہل گئی۔

دو پہر کو مہمان آ گئے، میں سب کے آگے پیچھے پھر رہی تھی اور دل میں خدشہ بھی تھا کہ کہیں یہ لوگ فریج کو مسترد نہ کر دیں۔ وہ لوگ دیکھنے میں بہت اچھے اور مہذب لگ رہے تھے۔

ایک خاتون نے مجھ سے پوچھا۔ ”بیٹا! آپ کا نام فریج ہے؟“

”نہیں..... آئی! وہ میری بڑی بہن ہیں۔ اندر اپنے روم میں ہیں۔ میں اسے بلاتی ہوں۔“ جب میں کمرے سے نکل رہی تھی مجھے عقب سے اسی خاتون کی آواز سنائی دی۔

”ہائے چھوٹی اتنی خوبصورت ہے تو بڑی کیسی ہوگی۔“ فریج بہت رف حلیے میں تھی تاہم میں اسے لے کر مہمانوں کے پاس گئی۔ وہ بیٹھ گئی اور پھر پانچ منٹ بعد ہی وہ اٹھ کر چلی گئی۔ کچھ دیر بعد وہ لوگ

چلے گئے اور پھر وہی ہوا جس کا ڈر تھا ان لوگوں نے فریج کو ناپسند کر دیا اور مجھے پسند کر لیا۔ اُس روز ابو میرے پاس آئے اور مجھ سے اس رشتے کے بارے میں رائے پوچھی۔ جواب میں میں نے سعادت مند بیٹیوں کی طرح سر جھکا دیا۔ میری رضامندی پر ابو نے اُن لوگوں کو ہاں کر دی۔ چھوٹی سی منگنی کی رسم کے بعد شادی کی ڈیٹ فکس ہو گئی۔ شادی دو ماہ بعد قرار پائی تھی لیکن اس عرصے میں ایک عجیب بات مجھے بہت کھٹک رہی تھی کہ میری منگنی کے بعد جب میرے سرال سے کوئی آتا تو فریج اُن کی بہت خاطر تواضع کرتی تھی۔ اُن کی خدمت میں کوئی کسر نہ چھوڑتی تھی پھر اس میں یہ تہذیبی بھی آئی کہ اب وہ باقاعدگی سے پارر بھی جانے لگی تھی حالانکہ پہلے وہ منہ پھاڑ سر جھٹاڑ حلیے میں رہتی تھی اسی لیے اس کا رنگ بھی کالی کھڑ گیا تھا۔ یہ باتیں مجھے ہضم نہیں ہو رہی تھیں۔ اس نے اپنے آپ پر اتنی توجہ دی کہ وہ ہم سب بہنوں سے زیادہ دلکش نظر آنے لگی۔ جوں جوں میری شادی کے دن قریب آ رہے تھے فریج کی دلکشی میں دن بہ دن اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ ایک بات اور فریج میرے منگیتر صادق سے روز موبائل پر بات کرتی تھی اور یہ گفتگو ایک ایک گھنٹے پر محیط ہوتی تھی۔ کبھی وہ میرے سامنے بات کرتی تو کبھی اپنا کرا بند کر کے حالانکہ منگیتر ہونے کے ناتے میں نے بھی صادق سے بات نہیں کی تھی اور ویسے بھی شادی سے پہلے بات چیت میں ملاقات مجھے پسند بھی نہ تھا۔ فریج میرے سامنے میرے منگیتر سے بات کرتے ہوئے اس طرح کے الفاظ استعمال کرتی کہ میں شرم سے پانی پانی ہو جاتی لیکن میں چپ کر کے یہ سب دیکھتی اور سستی رہتی۔ مجھ میں صبر بہت تھا۔ میں اسے کچھ کہہ بھی نہیں سکتی تھی اگر کہہ دیتی تو وہ مسئلہ کھڑا کر دیتی، سو میں نے اپنے منہ پر چپ کا قفل لگالیا تھا۔

خیر! دو ماہ گزر گئے اور دس اگست سن دو ہزار دس کو میں وداع ہو کر اپنے سرال آ گئی اور ہمیشہ کے لیے صادق کی ہو گئی۔ کچھ لڑکیاں مجھے جلد عروسی میں چھوڑ گئیں۔ یہ رات ہر لڑکی کا خواب ہوتی ہے۔ وہ پھولوں کی تیج پر بیٹھ کر خود کو خوش قسمت تصور کرتی ہیں لیکن جانے کیوں میرے دل میں خوشی کی رت تک نہ تھی میں سر جھکائے اپنے مجازی خدا کی منتظر تھی۔ آخر میرا انتظار ختم ہوا دروازے پر آہستہ سے کھٹک ہوئی۔ آنے والے کو میں دن دیکھے ہی پہچان گئی لیکن پھر میری آنکھوں کے آگے اندیرا اچھا گیا وہ آتے ہی صوفے پر لیٹ گیا۔ اس کے کان سے موبائل فون لگا ہوا تھا۔ وہ آہستہ آواز میں فون پر کسی سے بات کر رہا تھا فون کے دوسری طرف کون تھا یہ میں اچھی طرح جانتی تھی۔ پتا نہیں وہ کب سے بات کر رہا تھا؟ تقریباً دس منٹ بعد اس نے فون رکھ دیا اور میرے سامنے آ کر بیٹھ گیا۔ اس نے ایک گفت میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”میں تمہیں ہر آسائش دوں گا، کسی چیز کی کمی تمہیں نہیں ہوگی لیکن تم میرے معاملات میں بالکل دخل نہیں دوگی۔ میں کب آتا ہوں کب جاتا ہوں کیا کرتا ہوں تمہیں اس سے کوئی غرض نہیں ہوگی۔ میں تمہیں ہر طرح سے خوش رکھوں گا کیونکہ تم میرے گھر والوں کی خوشی ہو۔“

شروع شروع میں صادق کا رویہ میرے ساتھ ٹھیک رہا لیکن وہ روزانہ میری بہن جسے دمن کہنا زیادہ بہتر ہوگا۔ سے روزانہ گھنٹوں موبائل پر باتیں کرتا تھا اس کی گفتگو بہت نازیبا اور غیر اخلاقی قسم کی ہوتی تھی میں صبر کے گھونٹ پی کر رہ جاتی۔ میں کبھی کیا فریج کی فریج اکثر میرے گھر بھی آ جاتی اور صادق سے بے لالہ لڑائی جیسے وہ میرا نہیں اس کا شوہر ہو۔ اسات کے سامنے بے تکلفی کا مظاہرہ کرتی تھی سر پر

دو پنہ بھی نہ لیتی اس کا کھلا ہوا گلہ اٹھے ہوئے چاک سے میں خود شرم سے پانی پانی ہو جاتی۔ ایک روز تو حد ہو گئی اُن دنوں فریج میرے گھر آئی ہوئی تھی۔ اُس رات اچانک میری آنکھ کھلی تھی۔ رات کا شاید پچھلا پہر تھا میں نے اپنے برابر نظر ڈالی تو صادق بیڈ پر نہیں تھے۔ مجھے حیرت ہوئی اور میرے قدم غیر ارادی طور پر لاؤنج کی طرف اٹھ گئے۔ ٹی وی لاؤنج کی لائٹ روشن تھی۔ میں نے احتیاط سے دروازہ کھول کر اندر جھانکا تو سامنے کا منظر میرے ہوش اڑانے کے لیے کافی تھا۔ میرا شوہر اور میری بہن ایک دوسرے میں تمام حدوں کو پار کرتے ہوئے ایک دوسرے میں گم تھے۔ یہ شرم ناک منظر ناقابل دید تھا مگر میں دیکھ رہی تھی۔ میرے ہاتھ میں موبائل تھا جانے کیا سوچ کر میں نے ان کی ویڈیو بنالی حالانکہ میرے اندر اتنی ہمت نہیں تھی کہ یہ ویڈیو کسی کو دکھا سکوں۔

بہر حال وقت اسی طرح گزرتا رہا میں نے اب ان دونوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا تھا یہی سوچ کر کہ کبھی تو وقت میرے حق میں ہوگا۔ کبھی تو مجھے انصاف ملے گا۔ بے شک اللہ کی لاکھی بے آواز ہے اور میں اپنے اللہ سے مایوس نہیں تھی۔ میرے ایک ملازم شاندار خان کو بھی ان دونوں کے تعلقات کا پتا تھا۔ وہ ان کو کئی مرتبہ دیکھ کر مجھے بتا چکا تھا لیکن میں نے اسے روک دیا تھا کہ تم مجھے نہ بتانا کرو۔ وہ مجھے بہت سمجھاتا تھا۔ کبھی کبھی تو وہ مجھ سے الجھ بڑتا۔

”ربیعہ صیب! تم اپنا بہن کو سمجھانا کیوں نہیں ہے؟ ہمارے خاندان میں تو ایسی لڑکی کو قتل کر دیتا ہے۔ اگر آپ کہو تو میں اس کا صفایا کر دوں؟“ اس کی بات پر میں کانپ جاتی۔ وہ جیسی بھی تھی بہر حال میری بہن تھی۔

پھر ایک دن فریج میرے گھر آئی تو اس نے



## غزل

شامل جو محبت میں اذیت نہیں ہوتی  
اے دل کبھی تکمیل محبت نہیں ہوتی  
جو ہوش نہ ہو سر کا وہ ہوتی ہے عبادت  
سر جہدے میں رکھنے سے عبادت نہیں ہوتی  
کچھ اپنے ہیں اپنوں کا گلا کس سے کریں ہم  
ہیں غیر تو غیروں کی شکایت نہیں ہوتی  
جاں دیے کا گر شوق ہے تو سن لو یہ مجھ سے  
مقتل میں تڑپنے کی اجازت نہیں ہوتی

ملک ضیاء الرحمن اعوان۔ کراچی

مجھے کہا کہ وہ امریکہ جا رہی ہے وہاں جا کر آگے  
پڑھے گی۔ میں نے شکر کا سانس لیا۔  
وہ چلی گئی۔ سب کچھ اپنے معمول پر آ گیا لیکن  
صادق اب بھی پوری پوری رات فریج سے باتیں  
کرتے۔ وہ یہی سمجھتے تھے کہ مجھے کچھ معلوم نہیں۔ ان  
کی پوری گفتگو نہ کر کے صیغہ میں ہوتی لیکن مجھے تو پتا  
تھا۔ فریج کو امریکہ گئے ایک مہینہ ہوا تھا کہ اچانک  
صادق نے بھی برطانیہ جانے کی تیاری شروع کر  
دی۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ بڑس کے سلسلے میں جا  
رہے ہیں۔ ان دنوں میرے ہاں بچے کی ولادت  
ہونے والی تھی پھر اللہ نے مجھے چاند سا بیٹا عطا  
کیا جس کا نام میں نے شانزل رکھا۔ شانزل کی  
پیدائش کے دو ماہ بعد صادق نے یہ ملک چھوڑ دیا۔  
میں ننھے شانزل کو گود میں لیے صادق کے جہاز کو  
آسمان پر اڑا دیکھتی رہ گئی۔ مجھے پتا تھا صادق کہاں

جا رہے ہیں۔ میں تمام معاملہ سمجھ گئی تھی۔ مجھے اپنی  
بہن پر افسوس ہو رہا تھا میں نے کیا لگاڑا تھا اس کا جو  
وہ مجھ سے میرا شوہر بھی چھین کر لے گئی تھی؟ صادق کو  
گئے ہوئے تقریباً ایک سال ہونے کو آیا تھا لیکن  
انہوں نے کوئی رابطہ نہیں کیا تھا۔ میں اپنے مجازی خدا  
کا بے چینی سے انتظار کرتی تھی کیونکہ صبح کا بھولا شام  
کو واپس ضرور آتا ہے لیکن صادق تو نہیں بلکہ ایک  
روز ایک خط آ گیا۔

امریکہ سے آنے والے اس خط کو دیکھ کر مجھے  
حیرت ہو رہی تھی۔ میں نے کانپتے ہاتھوں سے لفافہ  
کھولا اور خط پڑھنے لگی۔

”ربیعہ.....! میں سوچ رہی ہوں تمہیں کس  
رشتے سے بلاؤں؟ میں نے تو تمہیں کبھی اپنا نہیں سمجھا  
یہ میرا پہلا اور آخری خط ہے جو میں تمہیں لکھ رہی  
ہوں۔ اس کے بعد تم سے کوئی رابطہ نہیں ہوگا۔ جب  
تمہیں یہ خط ملے گا تب تک میں اس دنیا کو چھوڑ کر  
اتنی دور جا چکی ہوں گی جہاں سے واپسی ناممکن ہوتی  
ہے۔ ربیعہ.....! میں نے ہمیشہ تم سے نفرت کی مگر اب  
اس نفرت کے بوجھ سے خود کو ہلکا کرنا چاہتی ہوں۔  
مجھے اس بات کا احساس ہے کہ میں نے تمہیں بہت  
ترپایا ہے بہت دکھ دیئے ہیں تمہارے دل میں  
میرے لیے جی محبت تھی لیکن میں مجبور تھی تم سے حسد  
و جلن کی عادت بھی تو صرف تمہاری وجہ سے پڑ  
گئی۔ تمہیں یاد ہے میٹرک میں جب تمہاری فرسٹ  
پوزیشن آئی تھی تو پاپا نے تمہیں کتنے اچھے الفاظ میں  
دش کیا تھا۔ میری سیکنڈ پوزیشن تھی لیکن میں ترس گئی تھی  
وہی جملے سننے کے لیے پھر میں نے اپنے آپ کو  
کتابوں میں گم کر لیا لیکن وہ جملے مجھے سننے کو نہیں لئے  
بس وہیں سے میں تمہاری دشمن ہو گئی اور جب کان  
میں ایک دن میں نے غلط مووی والی dvd تمہارے  
بیک میں ڈال دی تھی اور پورے کانچ میں تمہیں بدنام

کروایا تھا اس دن مجھے بہت تسکین ملی تھی میں بہت  
خود غرض تھی مجھے یہ احساس کبھی نہیں ہوا کہ تم میری سگی  
بہن ہو۔ میرے دل میں ندامت یا شرمندگی کا  
احساس تک نہیں ہوتا تھا۔ میرے دل میں تمہارے  
لیے نفرت ہی نفرت تھی اتنی نفرت کہ میں اگر ہر نکال  
دیتی تو سب کچھ ہضم ہو جاتا لیکن میں نے اپنی نفرت  
’منافقت کے پیچھے چھپا رکھی تھی۔ میں بظاہر تو تمہاری  
بہن تھی لیکن اندر سے تمہاری ازلی دشمن تھی پھر تمہاری  
زندگی کے اہم ترین موڑ پر میں نے تم سے بہت  
نا انصافی کی۔ اب یاد کرتی ہوں تو دل خون کے آنسو  
روتا ہے۔ تمہاری منگنی پر ہی میں نے تمہارے شوہر  
کو درغلا لیا تھا اس کی نظریں مجھ سے ہٹتی ہی نہیں تھیں  
اور پھر بھلا ہو موبائل کا بہت ساتھ دیا اس نے  
میرا۔ اگر موبائل نہ ہوتا تو آج تم اتنی تباہ اور میں  
امریکہ میں نہ ہوتی۔ لوگ محبت میں اندھے ہو جاتے  
ہیں لیکن میں نفرت میں اندھی ہو گئی تھی۔ صادق کو  
میں نے پوری طرح شیشے میں اتار لیا تھا۔ وہ آنکھیں  
بند کر کے میری ہر بات مانتا تھا اس کے دہم و گمان  
میں بھی نہیں تھا کہ میں اسے اپنی بہن سے انتقام کے  
لیے استعمال کر رہی ہوں۔ ہم رات دن موبائل پر  
باتیں کرتے تھے۔ اسے امریکہ آنے کے لیے بھی  
میں نے کہا تھا۔ یہ سارا پلان ہم نے موبائل فون پر  
سطے کیا تھا تاکہ تمہیں شک نہ ہو لیکن تم تو میرے  
ہالازے سے زیادہ بہت بدھونٹیں۔ دراصل تمہاری یہ  
’خصوصیت ہی میرے دل میں بھڑکتے انتقام کے شعلے  
بوزید بھڑکانی تھی۔ صادق امریکہ آ گیا لیکن میں  
نہیں جانی تھی کہ صادق کے دل میں کیا ہے؟ امریکہ  
آئے ہی وہ عورت اور شراب کے نشے میں ایسا ڈوبا کہ  
اس کی صحت تیزی سے گرنے لگی اور ایک دن وہ مر  
گیا۔ اس کے مرنے پر مجھے کوئی افسوس نہیں ہوا  
تو میری عزیز بہنا.....! میرا کوئی حق نہیں بنتا کہ تم

سے معافی مانگوں، ندامت، شرمندگی، معافی میرے جرم  
کے آگے بہت چھوٹے الفاظ ہیں۔ میں نے برائی  
جانتے ہوئے بھی برائی کی ہے۔ میں مسلمان تو  
کیا خود کو انسان کہلانے کی بھی حق نہیں ہوں۔ میں  
اس قابل بھی نہیں کہ مٹی میں دفن ہو سکوں۔ زندگی میں  
تمہیں اپنا چہرہ دکھا سکوں۔ اللہ بڑا غفور الرحیم ہے۔  
تو یہ کرنا اللہ کو بہت پسند ہے۔ میں تمہاری مجرم ہوں  
اور معافی کی طلب گار ہوں تاکہ میری رُوح کو قرار  
نصیب ہو سکے۔ مجھے امید ہے کہ یہ خط میری موت کی  
اطلاع کے ساتھ تم تک پہنچے گا۔

تمہاری بد نصیب بہن

فریجہ.....“  
خط کا ایک ایک لفظ میرے وجود میں نشہ کی طرح  
چھ رہا تھا۔ کیا آخری وقت ہاتھ جوڑ کر معافی مانگنے  
سے دکھ درد اور کم کا مداوا ہو جاتا ہے؟ کیا میری بہن  
کی موت میرے دکھوں کا مداوا ہو سکتی ہے؟  
فریجہ تو کتنی ظالم ہے کاش تو مجھے خط نہ لکھتی  
میں لاعلم ہی رہتی تو جاتے جاتے بھی غموں کی چٹان  
میرے سینے پر رکھ گئی۔ صادق کے والدین کو کیسے  
بتاؤں کہ جس بیٹے کے انتظار میں وہ پیل پیل کاٹ  
رہے ہیں وہ اب کبھی نہیں آئے گا کیونکہ ملک عدم  
جانے والے کبھی واپس نہیں آتے۔

قارئین.....! میں آپ کے سامنے ہاتھ جوڑتی  
ہوں کہ آپ موبائل کا غلط استعمال نہ کریں کسی کی  
باتوں پر یقین نہ کریں۔ میری التجا ہے کہ اپنے بچوں  
اپنی بہنوں کے ہاتھ میں موبائل نہ دیں۔ آپ میں  
سے کوئی اور ربیعہ جنم نہ لے۔ آپ سب میرے لیے  
دُعا کریں کہ اللہ مجھے صبر اور ہمت دے۔ میں اس  
راز کو راز رکھوں۔ صادق کے والدین کی امید کا دیا  
روشن رکھوں اور انہیں یہ نہ بتاؤں۔

.....



## وہم نہیں حقیقت

تمثیل زاہد

”عمر ایہ کیا پکڑ رکھا ہے؟ اتارے.....“ اماں بی میری سیاہ رنگ کی شرٹ پر آنکھیں کالے غصے سے مجھے مگور رہی تھیں۔ میں اُن کے اس رد عمل کے لیے تیار تھا۔ جانتا تھا کہ بچپن سے لے کر.....

## اس عرصہ کے تحت کیا ہوا



سرگوشیاں نہ انداز میں کہا تو قہقہوں کا شور اٹھ گیا اور شوخ فقرہ کی برسات ہونے لگی۔

”چلو اب اباجی اور اماں جی کو کچھ دیر کے لیے اکیلا چھوڑ دو اور تم سب جا کے انتظامات کی طرف دھیان دو۔“ مچھلی بہو نے مسکراتے ہوئے ہمیں پوتے پوتیوں کے جھرمٹ سے آزاد کر دیا تھا۔

”کتنے برس گزر گئے کرن بیگم! آج ہم اور ہمارے بچے خوش حال ہیں۔ یہ اللہ کا ہم پر خاص فضل ہے۔ زندگی واہموں سے نہیں گزرتی۔ اپنی رضا کو ہر حال میں اللہ کی رضا میں شامل رکھنا چاہیے۔ دیکھو آج ہم اسی برس کے ہو گئے ہیں اور زندہ ہیں۔“ میری بیوی آخری جملے پر تھرا کر رہ گئی اس کا رنگ سفید ہونے لگا۔

”ایسے نہ کہیے۔ اللہ آپ کو زندگی صحت دے۔“ اُس کی آنکھیں ڈبڈبائے لگیں۔

”اب زندگی کی نہیں سفر آخرت کی فکر ہے۔“ بیگم! تم نے ہمیں دل سے تو معاف کر دیا نا؟“ میں نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا اور بیوی نے میرے کئی بار کہا کہ جملہ سن کر اثبات میں سر ہلا دیا۔ مہمانوں کی آمد شروع ہو گئی تھی اور کرن استقبالیہ کمرے میں پہنچ کر سب کو خوش آمدید کہنے پہنچ گئی۔

میں آپ کو اپنی حیات کے اوراق پلٹ کر وہ داستان سنا تاہوں جو شاید پھر کبھی نہ سناؤں۔ میری ڈائری میں میری داستان کے تمام حروف محفوظ ہیں۔

میرا نام محمد عمر جو ہداری ہے۔ میری دو بہنیں ہیں اور میں اُن دونوں سے بڑا ہوں۔ قیام پاکستان سے قبل ہم لاہور میں مقیم تھے۔ یہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ پاکستان بننے کے بعد ہمیں ہجرت جیسی مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ میری پیدائش کے وقت میرے دادا جان جو ماہر دست شناس اور کئی علوم پر دسترس رکھتے تھے انہوں نے ماں سے کہا تھا کہ

آج میں پورے اسی برس کا ہو گیا ہوں۔ اس وقت گھر میں زبردست گہما گہما کا عالم ہے۔ چھ سو گز پر بنے میرے اس بنگلے میں میرے سب اپنے رہتے ہیں۔ میرے چار بیٹے، بہوؤں اور اُن کے بچوں کے بھی بچے اب جوان ہونے کو ہیں یہ سب مجھ سے بے پناہ محبت کرتے ہیں۔ میرے اس چچن کو میری بیوی نے اپنی محبت سے سمیٹ رکھا ہے۔ آج ہماری شادی کی پچاسویں سالگرہ بھی ہے۔ گھر میں سب ہی کے چہرے خوشی سے چھل رہے ہیں۔

لیکن میری بیوی کچھ مجھے بھی سی ہے ہر لمحہ مسکرائیں، بکھیرنے والی میری بیوی کے لیے یہ دن اُن تلخ یادوں کو تازہ کر دیتا ہے۔ گزرتے ایام کا دکھ اس کے دل کی چوکھٹ سنبھال لیتا ہے۔ مجھے وہ دن بھول نہیں پاتا جب اچانک ہی وہ کچھ ہو گیا جو کرن کے لیے غیر متوقع تھا۔ کرن کون؟ جی..... میری بیوی!

”اباجی! یہ کیا آپ ابھی تک تیار نہیں ہوئے؟“ مہمانوں کی آمد ہونے والی ہے۔ اماں کو تو آج اُن کی چہیتی پوتیاں تیار کریں گی۔ ابھی ابھی زبردستی انہیں ڈرائنگ روم لے گئی ہیں۔ اچھا یہ لیجیے۔“ سب سے بڑی، بہوشاہت کی آواز نے مجھے چونکا دیا جو کھلکھلا کر ہنستے ہوئے کہہ رہی تھی ساتھ ہی بہو نے سیاہ رنگ کی وہ شروانی مجھے تھادی جو بچوں نے خاص اس دن کے لیے بنوائی تھی۔ سیاہ رنگ کی شروانی دیکھ کر بے اختیار میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

”جیتتی رہو خوش رہو۔“ میں نے بہو کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی اور اپنے کمرے کی جانب چل پڑا۔ سیاہ رنگ دیکھ کر میرے دماغ کی اسکرین پر کچھ منظر اُٹنے لگے تھے۔ شروانی پہنے باہر آیا تو سامنے بیگم بیویوں اور پوتوں کے جھرمٹ میں بیٹھی تھی۔ غرارہ پہنے وہ پہلے دن والی دہن جیسا روپ سجائے ہوئے تھی۔

”مبارک ہو آج کا دن آپ کو۔“ میں نے



مجھے سیاہ رنگ سے دور رکھا جائے۔ میرے لیے سیاہ رنگ بدبختی کی علامت ہے۔ انہوں نے میری والدہ کو سختی سے اس پر عمل کرنے کی تاکید کی تھی۔ والدہ نے واقعی اس پر عمل کیا اور مجھے سیاہ رنگ کی کوئی بھی چیز پہننے کی اجازت نہ تھی۔ سیاہ رنگ کے کپڑے تو ایک طرف! اگر جوتوں کے نئے بھی سیاہ رنگ کے ہوتے تو وہ بھی میرے وجود سے دور ہوتے تھے۔

دادا جان کی وفات کے بعد بھی اماں میرے آنے جانے پہننے اوڑھنے پر کڑی نظر رکھتی تھیں۔

اُن دنوں کی بات ہے کالج کا آخری سال چل رہا تھا۔ ہم پانچ دوستوں نے دریا کی سیر کا پروگرام بنایا۔ بڑی مشکلوں سے منت ساجت اور دندن کی بھوک ہڑتال کے بعد اماں نے ڈھروں ڈھیر ہدایات دے کر اجازت دے ڈالی اور جاتے جاتے گویا دھکی دی۔

”پتر.....! مغرب سے پہلے اگر تیری گھر پر موجودگی نہ ہوئی تو اپنے بابا جی کے مولا جٹ کو یاد کر لیتا۔“ اماں کی آواز میرے کانوں میں گونج رہی تھی۔ ہم پانچوں دوست طے شدہ پروگرام کے تحت وسم کے گھر پر پہنچ گئے تھے۔

ویم ایک جاگیر دار گھرانے سے تعلق رکھتا تھا اور ظاہر ہے ہم سب میں مالی طور پر سب سے زیادہ مستحکم تھا۔ دریائی سیر کا پروگرام اور اپنے اپنے گھر والوں کو منانے کی ترکیبیں سب ہی کچھ وسم کی مہر ہوں منت تھا۔ وہ ڈر بہادر اور ایڈووچر کا شوقین لڑکا تھا۔ وسم کے علاوہ ہم باقی چاروں دوست اندر سے بزدل اور اپنے اپنے والدین کی پابندیوں سے لگے بندھے رہنے والے لڑکے تھے۔

دریا کی جانب ہمارا سفر وسم کی گاڑی میں شروع ہوا۔ اُس کی گاڑی اونچے اونچے راستوں سے ہوتی ہوئی ایک بڑے گھنے درخت کی چھاؤں میں جا رہی۔ یہ 1952ء کا دور تھا جب آبادی آج کی طرح منجبان نہ

تھی۔ ہم سب گاڑی سے اتر کر ہاتھ پیر سیدھے کرنے لگے۔ یہ ایک غیر آباد انسان علاقہ تھا جہاں دور دور تک آبادی کا نام و نشان نہ تھا۔ قطار میں لگے درخت اور آس پاس کی جھاڑیاں ہوا کے دوش پر لہرا رہی تھیں۔

”چل آ یا دریا میں نہاتے ہیں۔“ وسم کے کہنے پر ہم اپنے کندھوں پر اپنا سامان لٹکائے اُس کے پیچھے پیچھے چل دیے۔

دریا کا پاٹ اتنا چوڑا تھا کہ اُس کا دوسرا کنارہ دکھائی نہیں دے رہا تھا یوں لگ رہا تھا جیسے اُس کا دوسرا کنارہ ہی نہ ہو۔ پانی کی سفید چاند کی جیسی سطح دھوپ سے چمک رہی تھی۔ موسم خوشگوار تھا۔ مجھے دریا میں نہانے سے زیادہ کنارے پر چلنا اچھا لگ رہا تھا جبکہ میرے چاروں دوست دریا میں جھلانگ لگا چکے تھے۔ انہوں نے مجھے بھی دعوت دی لیکن میں نے منع کر دیا۔ وہ ایک دوسرے پر پانی اچھال کر

لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ہم سب تیراکی جانتے تھے اس لیے دریا کا گہرا پانی اُن کے فخل میں رکاوٹ نہیں بناتا تھا۔ میں نے اپنے آس پاس کا جائزہ لیا ہر طرف فضا پر سکون تھی۔ تازہ ہوا سے میں اپنی سانسیں معطر کر رہا تھا کہ کچھ دور ایک گھنے درخت کی چھاؤں میں ایک شخص بیٹھا نظر آیا۔

اس ویران جگہ پر تنہا ایک شخص کا وجود میرے دل میں تجسس اٹھا اور میرے قدم خود بہ خود اس کی جانب بڑھ گئے۔ قریب جا کے دیکھا تو وہ ایک ہندو جوگی تھا۔ وہ سر جھکائے اپنے خیالوں میں مگن تھا اس کے گلے میں خاکی رنگ کی موٹے دانوں والی لٹنج کی شکل کی کئی کالا میں لٹکی ہوئی تھیں۔ وہ نارنجی رنگ کے چنے میں سر سے پیر تک لمبوس تھا۔ میرے قدموں کی آہٹ پر اس نے نظر اٹھا کر دیکھا۔

”آگیا تو؟ اب آیا ہے بیٹھ جا۔“ وہ گرج کر بولا۔ میں سہم کر اس کے سامنے بیٹھ گیا پھر ڈرتے

ڈرتے پوچھا۔

”بابا جی! آپ یہاں اکیلے آپ کو ذرا نہیں لگتا؟“

”کیسا ڈر بچہ.....!“ اس کا بلند قبہ فضا میں

گونجا۔ اسی لمحے اس نے اپنی لال انگارہ آنکھیں

میرے وجود میں گاڑ دیں۔ مجھے لگا میں اپنی جگہ پتھر

کا بے جان بت بن گیا ہوں۔ میں نے بے بسی سے

جوگی کو دیکھا تو وہ مسکرانے لگا یوں جیسے اسے میری

بے بسی پر ترس آگیا ہوا اور اس نے اپنی نظریں ہٹا کر

پھر سے سر جھکا لیا۔ اس کے سر کا جھکنا تھا کہ میں جیسے

بند رسیوں سے آزاد ہو گیا۔ میرے جسم میں

سنسناہٹ سی دوڑنے لگی۔

”اچھا بابا جی! مجھے معاف کیجیے گا؟ میں یوں ہی

جلا آیا تھا۔ اب چلتا ہوں۔“ مجھ پر ایک عجیب

گہرا ہٹ طاری ہو گئی تھی۔

”کیا کنیاؤں کی طرح شرماتا ہے بچہ پوچھے گا

نہیں جو پوچھے آیا تھا؟“ وہ زنی سے بولا۔

”یا اللہ! یہ دل کا بھید جانتا ہے کیونکہ اسے دیکھ

کر میرے دل میں یہی خیال آیا تھا کہ اسے اپنا ہاتھ

دکھا کر مستقبل کے حوالے سے پوچھوں گا۔

”بابا جی! کیا آپ ہاتھوں کی لکیریں دیکھ کر

میری قسمت کا حال بتا سکتے ہیں؟“ میں نے ڈرتے

ڈرتے پوچھا کہ کہیں اس ہندو جوگی کو میری بات سن

کر غصہ نہ آجائے۔ اس دوران میرے دوست مجھے

دھمکتے ہوئے مجھ تک پہنچ چکے تھے۔ انہیں دیکھ کر

مجھے مزید ڈھارس ہوئی۔

”لا دکھا۔“ اس نے بارعب انداز میں کہا اور

میں نے اپنی ہتھیلی اس کے آگے کر دی۔

میرے ہاتھ کی لکیروں کو دیکھتے ہی جوگی بابا کی

پیشانی پر لکیروں کا جال بننے لگا۔ اس کے ماتھے کی

لکیریں بڑھ کر بھنوں کو چھونے لگیں پھر اس نے

میں سے ہاتھ کی لکیروں سے نظریں اٹھا کر میری

پیشانی کا جائزہ لینا شروع کر دیا جیسے کچھ ٹول رہا ہو۔

”تو کسی کا قتل کرے گا بچہ.....!“ اس کی زبان

سے نکلنے والا یہ جملہ اتنا غیر متوقع تھا کہ ہم بکا بکا ایک

دوسرے کی شکلیں دیکھنے لگے۔

”بابا جی! آپ کی قیافہ شناسی تو ہمیں فیل ہو گئی یہ

کیا کسی بندے کا قتل کرے گا؟ یہ تو بھی نہیں مار سکتا؟“

ویم نے قبہ لگاتے ہوئے کہا۔ جوگی بابا کو اس کی

بات اتنی ناگوار گزری کہ وہ غصے سے کھڑا ہو گیا پھر

غصیلی نظروں سے پہلے وسم کو اور پھر مجھے دیکھا۔

”بابا جی! معاف کر دیں میرے دوست کی بات کا

برائے نامیے گا بس اتنا بتا دیجیے کہ کیسے ممکن ہے؟“ میں

گرگڑانے لگا۔ مجھے جوگی کی بات پر حیرت ہو رہی

تھی۔ دل میں خیال آیا کہ کہیں اس بات کا راز سیاہ

رنگ کے عہد میں تو پوشیدہ نہیں کہ میری پیدائش پر دادا

جان نے اماں کو تاکید کی تھی کہ مجھے سیاہ رنگ سے دور

رکھا جائے؟ کیا واقعی میرے ہاتھوں کی قاتل کا تب

تقدیر نے لکھ رکھا ہے؟ مگر یہ کیسے ممکن ہے؟ کیسے؟

میرے دماغ میں اس قسم کے سوال گونج رہے تھے۔

ان کے جواب یہ جوگی ہی دے سکتا تھا۔ میں نے اس

کی نیتیں شروع کر دیں لیکن وہ نہیں رکا اور یہ کہتا ہوا چلا

گیا کہ یہ سب ہو کر رہے گا! اب بھاگ جا یہاں

سے۔ تیرے اوپر کالے سائے لہرا رہے ہیں۔“

جوگی کی اس کیفیت پر ہم سب دم بخود تھے۔

چاروں دوست شاکل نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔

وہ جوگی نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ میں نے غصے

سے وسم کو گھورا جولا پروائی سے کندھے اچکا رہا تھا۔ وسم

کی وجہ سے میں اپنی زندگی کا اہم راز جاننے سے رہ گیا

تھا وہ راز کہ مجھے سیاہ رنگ سے کیوں دور

رہنا ہے؟ حالانکہ میں نے سبھی اس بات پر یقین نہیں کیا

تھا لیکن آج ایک اور شخص کے منہ سے ایسی بات سن کر

مجھے یقین ہو گیا کہ کوئی انہونی ہے جو میری زندگی کا



حصہ ہے لیکن کیا؟ سیاہ رات، کالے کپڑے، ایک قتل، لیکن کس کا قتل اور کیوں؟ میں سوچتے سوچتے جھنجھلا گیا مگر ان سوالوں کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ دو سال گزر گئے، ہم سب دوستوں کا گریجویشن مکمل ہو چکا تھا۔ دو دوستوں کو لاہور میں ہی ملازمت مل گئی تھی۔ ایک نے اپنے والد کا کاروبار سنبھال لیا۔ دوسم نے کراچی جانے کا ارادہ کیا۔ ان دنوں کراچی میں لندن کھلاتا تھا اور نو جوانوں کے لیے ایک کشش رکھتا تھا۔ رونقوں سے آباد اس شہر کی طلسماتی دنیا دوسم کے دل میں کئی سالوں سے آباد تھی۔ دوسم کا گیرداری کے بجائے نوکری کرنا چاہتا تھا۔ دوسم کے والد کا گیردار ضرور تھے لیکن ان کی سوچ جاگیردارانہ نہیں تھی۔ وہ ایک پڑھے لکھے وسیع القلب، دوراندیش اور روشن خیال انسان تھے۔ دوسم اگر جاگیرداری کے بجائے نوکری کرنے کا خواہش مند تھا تو وہ اس کی راہ میں رکاوٹ بننا نہیں چاہتے تھے۔ ان کی اپنی بھی خواہش تھی کہ ان کا بیٹا زندگی کے ہر روپ کو دیکھے اس کی ہر اونچ نیچ کا سامنا کرے۔ میں نے جب سنا دوسم کراچی جا رہا ہے تو مجھ پر بھی وہاں جانے کا جنون سوار ہو گیا۔ دوسم نے والدین سے خوب منت سماجت کی لیکن وہ نہ مانے۔ میرے چچا زاد کزن شاہد بھائی کراچی میں نوکری کرتے تھے اور وہیں رہتے تھے۔ چاچا، چاچی ہمارے برابر والے پورشن میں آباد تھے۔ میں نے انہیں کہا اور انہوں نے اماں ابا کو راضی کر لیا، یوں شاہد بھائی کی ضمانت پر مجھے کراچی میں کام کرنے کی اجازت مل گئی۔ اس وقت گھر میں سب کو یقین تھا کہ میں نامراد واپس لوٹوں گا، دوسم اور میرا نوکری کا بھوت جلد ہی اتر جائے گا۔ میں پہلی بار ایک شہر سے دوسرے شہر کا سفر کر رہا تھا۔ ایک انہونی خوشی دل کو گدگداتی تھی اس وقت

میں خود کو ایک ایسے پرندے کی مانند محسوس کر رہا تھا جس کے چھوٹے چھوٹے پر نکل رہے تھے اور وہ ایک لمبی اڑان بھرنے کے لیے اپنے پر تول رہا تھا۔ کراچی میں کئی روز کی خواری اور سڑک چھاپ کے باوجود ہم دونوں کو کوئی نوکری نہ ملی تو ایک روز شاہد بھائی نے کہا۔ ”یوں بے کار وقت برباد کرنے سے بہتر ہے کوئی شارٹ کورس کر لو آج کل کی بھی جگہ ملازمت کے لیے پہلا سوال یہی کیا جاتا ہے کہ کیا آپ شارٹ ہینڈ رائٹنگ اور ٹائپنگ جانتے ہیں؟ اس کا ڈپلومہ کر لو گے تو ملازمت جلد مل جائے گی۔“ ہانڈی میں چھپ چلا تے ہوئے شاہد بھائی نے ہمیں مشورہ دیا تھا۔ رات کے کھانے کی تیاری وہ دفتر سے شام پانچ بجے آنے کے بعد کرتے تھے۔ دو کمروں کے اس کرائے کے فلیٹ میں شاہد بھائی گھر کی صفائی سے لے کر کپڑے دھوئے اور استری کرنے تک سارے کام خود کرتے تھے جبکہ ہم دونوں کے آرام طلب جسم اس محنت کے عادی نہ تھے۔ ”واہ بھئی شاہد بھائی! آج تو کھانے کی خوشبو بتا رہی ہے، کھانا لا جواب ہے۔“ دوسم شاہد بھائی کی بات نظر انداز کرتے ہوئے ہانڈی کی طرف الجھائی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”بھئی ہوئی مرغی کی خوشبو سے ہمارے خالی پیٹ چیخ چیخ کر التھا کر رہے تھے۔ نوکری کے لیے جانے والی تمام دن کی بھاگ دوڑ سے جسم محکم سے پُور تھا اور سامنے بنتا ہوا مرغی کا سالن دیکھ کر ممبر کا پیانا لبریز ہو رہا تھا۔ ہم دونوں بھوک کے مارے بے حال تھے۔“

”تین دن وال سبزی کے بعد سوچا آج تم لوگوں کو عیش کرواتے ہیں۔ اچھا چلو اب ایسا کرو، غناٹ نیچے خان صاحب کی تندور سے گرما گرم روٹیاں لے آؤ، سالن تیار ہے۔“ شاہد بھائی نے ہماری بے صبری دیکھ کر ہنستے ہوئے کہا اور جیب سے

پیسے نکال کر میری طرف بڑھا دیے۔ میں نے شرمندگی کے احساس سے وہ پیسے اپنی جیب میں ڈال لیے۔ شاہد بھائی کو بخوبی علم تھا کہ ہم نے یہاں 15 دنوں میں دن بھر گھوم پھر کر اپنی اپنی جیبیں خالی کر ڈالی تھیں۔ اس وقت میرا ذہن شاہد بھائی کے مشورے پر غور کرنے لگا تھا کیونکہ خالی جیبوں کے ساتھ یہاں مزید رہنا ممکن نہیں تھا۔ پھر دوسم اور میں ایک ادارے سے شارٹ ہینڈ اور ٹائپنگ سیکھنے لگے۔ روزانہ تین گھنٹے کی کلاس میں ہم دونوں پابندی سے جاتے۔ دوسم ناز و نعم سے پلا تھا اس نے بھی اس طرح کی پابندی نہیں کی تھی۔ اسے یہ حاضری کھلنے لگی تھی۔ وہ آفس کی ملازمت کو کچھ اور ہی ممتی پہنائے بیٹھا تھا۔ اس کا خیال تھا شاہد بھائی ایک اچھی سی آفسری والی نوکری بغیر کسی بھاگ دوڑ کے دلوادیں گے لیکن وہ یہ فراموش کر بیٹھا تھا کہ جڑیا کو بھی گھر بیٹھ کر دانہ نہیں ملتا اسے بھی پیٹ بھرنے کے لیے دن بھر محنت کرنی پڑتی ہے۔ شاہد بھائی ملازمت کے حصول کے لیے پہلے ہی معذرت کر چکے تھے۔ وہ راہ دکھانے کے لیے تیار تھے لیکن اپنے اپنے حصے کی محنت ہمیں خود ہی کرنا تھی۔ دوسم کو خوش پنڈرہ بیس دنوں میں بے زاری اور اکٹھا ہونے لگی تھی۔ اب وہ میرے ساتھ کبھی کلاس لینے چلا جاتا اور بھی چھٹی کر لیتا پھر ایک دن اس کی بے زاری عروج پر پہنچی تو اس نے واپسی کا فیصلہ کر لیا اور اپنے والد کو خط لکھ ڈالا کہ وہ واپس آ کر زمینیں سنبھالے گا۔ وہ نوکروں میں پلنے والا شہزادہ اس مشقت بھری زندگی کا عادی نہ تھا۔ میں جانتا تھا ایک نالیک دن بھی ہوتا تھا۔

زندگی میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے شہر پر محنت کی ضرورت ہوتی ہے۔ بے شمار رکاوٹوں مشکلات کے باوجود آگے بڑھنے کی سعی کرنا

کامیابی کا حصول ممکن بنا دیتا ہے اور میں جلد ہی اس راہ پر گامزن ہو گیا۔ میرا ڈپلومہ مکمل ہو چکا تھا۔ میں نے اپنے اس محنت کے سفر کو یقین کی کچی نیت کے ساتھ طے کیا تھا۔ زندگی تو عمل اور جدوجہد سے مشروط ہے انسان کی طلب میں جتنی شدت ہوتی ہے کامیابی کے امکان اتنی ہی بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ جب عطا کرنے والا عطا کرنے پر آماتا ہے تو بے حساب عطا کرتا ہے اور رب نے مجھے عطا کر دیا تھا۔ مجھے ایک بہت اچھی سرکاری نوکری مل گئی۔ اس روز خوشی سے میرے پیر زمین پر نہیں ٹک رہے تھے میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ اڑ کر جاؤں اور اس کامیابی کی خبر اپنے والدین کو دوں۔ آج ہم بھوکوں میں نہ ذریعہ موبائل ایک دوسرے کی خبر گیری کر لیتے ہیں لیکن اس وقت ٹیلی فون ہنگام ترین ذریعہ تھا۔ ایک شہر سے دوسرے شہر خط و تار کے ذریعے ہی اطلاعات دی جاتی تھیں اور یہ نظام بھی سست تھا، کئی کئی دن بعد خط پہنچتا تھا۔ بعض اوقات تاریخ بھی کئی دن بعد موصول ہوتا۔ میں نے اسی لمحے خط میں چند لائنیں گھسیٹیں اور پوسٹ کر دیا۔ میرے ہاتھ میں اپنا کنٹیکٹ لیٹر تھا اور میں پاکستان چوک پر کھڑا تھا۔ میں نے یہاں کے مشہور ہوٹل سے چائے پی۔ اب میرا رخ شاہد بھائی کے فلیٹ کی طرف تھا جو یہاں سے پانچ منٹ کے پیدل کے سفر پر تھا۔ میں نے اپنے اندر جھانکنا شروع کیا۔ سال بھر پہلے کراچی آنے والے عیسر چوہدری میں کتنی تبدیلیاں آ چکی تھیں۔ اب میں پہلے والا ڈرپوک اور بزدل عیسر نہیں تھا۔ اس ایک سال میں میرے اندر بلا کی خود اعتمادی آ گئی تھی۔ مجھے یہ شہر بے حد راس آیا تھا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ میرا اب یہی ٹھکانہ ہے۔ مجھے جلد از جلد والدین کو یہاں لانے کی فکر تھی۔ اس وقت میرے ذہن میں مختلف منصوبے بن رہے تھے۔ وقت کا پہلی اپنی رفتار سے چلتا رہا میری نوکری



کو تین سال گزر چکے تھے۔ میری محنت، لگن کو دیکھ کر دو سال بعد ہی میری پرموشن ہو گئی اور تنخواہ کے ساتھ مجھے کئی مراعات بھی حاصل ہو گئیں۔ اس دوران میرے والدین بھی کراچی آ چکے تھے جو میرے ہمراہ بے حد خوش اور مطمئن زندگی گزار رہے تھے۔ میری دونوں بہنوں کی شادیاں بھی یہیں ہوئی تھیں۔ شاید بھائی اب میرے بہنوئی بن چکے تھے۔ مجھے سرکاری طرف سے گھر کے ساتھ گاڑی بھی ملی تھی۔ میں ڈرائیونگ نہیں جانتا تھا، تاہم ایک دوست نے یہ مشکل بھی حل کر دی، وہ مجھے روز دوشتر کے بعد ڈرائیونگ سکھاتا، یوں ایک ماہ میں گاڑی چلانے میں مہارت حاصل ہو گئی۔ میری زندگی کا سمندر پرسکون تھا لیکن میں اس بات سے بے خبر تھا کہ آئندہ آنے والا پل اس سمندر میں کیسا طوفان برپا کرنے والا ہے۔

”یار تو نے بتایا نہیں کل تیری سالگرہ ہے؟“ وہ میرے گھر کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا مجھ سے شکایتا کہہ رہا تھا۔

”کس کو بتا رہے تھے یہ خبر پہنچا دی؟“ میں مسکرا کر بولا اور دل میں اس کی خبر گیری کی داد دینے لگا۔ وہ تھا بھی میرا ایسا دوست، میرے متعلق ہر بات کی خبر رکھتا تھا۔

حیران ہونے کے ساتھ گھبرا بھی گیا۔ اماں کا وہی دستور تھا، مجھے مغرب کے بعد کہیں جانے نہ دیتی تھیں۔ وہ جیب سے کراچی آئی تھیں، ان کی مجھ پر وہی پابندیاں تھیں۔ یہ میرے آفس کے دوست تھے جن سے میں ناہیں کر سکتا تھا اور یہ اس طرح ملنے والوں میں سے بھی نہیں تھے۔

میں نے گاڑی کی چابی اٹھائی۔ مغرب کی اذان ہو چکی تھی۔ میں نے اماں بی کے کمرے میں جھانکا، وہ نماز سے فارغ ہو کر ذرا دکار میں مشغول تھیں۔ میں کچھ کہے بغیر اماں جی کے کمرے کی دہلیز سے پلٹ آیا۔ میرا رخ باہر کے مین گیٹ کی طرف تھا۔ بلو جینز پر سیاہ شرٹ پہنے میرا دل عجیب وسوسوں کا شکار تھا۔ میں اپنے دوست کے ہمراہ گاڑی اسٹارٹ کر چکا تھا اور چونکدار کوسروری کام کا کہہ کر نکل آیا۔

”کھانا کیسا لگا؟“ واپسی پر دوست نے مجھ سے پوچھا۔

”لا جواب۔“

”اور ہمارا گفت؟“ اس نے پھر سوال کیا۔

”وہ بھی لا جواب۔“

”جانتے ہو اس رنگ کی شرٹ ہم نے تمہیں کیوں دی ہے؟“

”کیوں؟“ میں نے گاڑی اس کے گھر کی جانب موڑ دی۔

”کیونکہ ہم نے کبھی سیاہ رنگ کے کپڑے تمہیں پہنے نہیں دیکھا، ہمیں لگا شاید تمہیں برا لگے گا۔ ہو سکتا ہے تمہارا یہ ناپسندیدہ رنگ ہو، جب ہی آج تک اس رنگ کے کپڑے استعمال نہیں کرتے۔“

”ایسی کوئی بات نہیں، بس ایسے ہی رنگوں کے معاملے میں خاص مجوزی نہیں ہوں میں، بس جو مل جائے پہن لیتا ہوں۔“ میں اپنے اندر کے وسوسوں کو اپنے دل میں دبا چکا تھا اور سیاہ رنگ کی شرٹ میں

لبوس بیٹھا تھا۔ نہ جانے کیوں اماں نے اپنے ساتھ ساتھ مجھے بھی وہیوں کا شکار بنا دیا تھا؟ مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ میں نے آخر کیوں زندگی کے اتنے برس ایک وہم کے سائے میں گزار دیئے تھے؟

دوست کو ڈراپ کرنے کے بعد گھر آیا تو چونکدار نے اطلاع دی اماں اباعشاء کے بعد معمول کے مطابق سو چکے ہیں۔ میں نے شکر ادا کیا اور اپنے کمرے میں پہنچ کر کپڑے بدل لیے۔ سیاہ رنگ کی وہ شرٹ کھوٹی پر ٹانگ کر میں اسے گھورنے لگا، مجھے پھر سے خود پر غصہ آنے لگا۔ یہ سیاہ رنگ کا معمہ میرے اندر کی خود اعتمادی کو دیمک کی طرح چاٹ رہا تھا۔ میرے سینے پر جیسے برف کی سیل تھی جو میری کوششوں کے باوجود پٹنے سے قاصر تھی۔ میں نے خود سے ایک عزم کیا کہ اس سے چھٹکارہ پانے کی ہر ممکن کوشش کروں گا پھر مطمئن ہو کر میں سونے کے لیے لیٹ گیا اور آیت الکرسی کا ورد کرنے لگا جو میرے روز کے معمول کا حصہ تھا۔

صبح خلاف معمول میں دیر سے اٹھا۔ آفس دیر سے آنے کی اطلاع کر چکا تھا۔ شاور لے کر دن کے بجے میں ناشتہ کرنے بیٹھا کہ عقب سے اماں بی کی زوردار آواز گونجی۔

”عمیر!..... کیا پہن رکھا ہے؟ اتار اسے۔“

اماں بی میرے سیاہ رنگ کی شرٹ پر آنکھیں نکالے غصے سے مجھے گھور رہی تھیں۔ میں اُن کے اس رد عمل کے لیے تیار تھا۔ جانتا تھا کہ بچپن سے لے کر وہ مجھے اس رنگ کی کبھی بھی چیز کو پہننا تو دور کی بات، چھوٹے ہی نہیں دیتی تھیں۔ نہ جانے دادا ابانے ایسا کیا کچھ کہہ ڈالا تھا جسے اب تک دل سے نہ نکال پائی تھیں؟ اپنے ساتھ ساتھ مجھے بھی ہر لمحہ اندیشوں اور وسوسوں کا بچاری بنا دیا تھا لیکن اب میں اپنے اندر کے اس ڈر و خوف کا خاتمہ کر دینا چاہتا تھا۔ میں نے

سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق ہی یہ رنگ پہنا تھا تاکہ یہ واضح کر دوں کہ اب مجھے کسی کا خوف نہیں..... ”تم نے سنا نہیں، میں نے کیا کہا ہے؟ فوراً کپڑے بدل کر آؤ۔“

”اماں بی!.....! آخر کیا ہو گیا ہے آپ کو؟ میں کوئی دودھ پیتا بچہ تو نہیں، دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے اور آپ ایک وہم کو دل میں پالے بیٹھی ہیں؟ نہ میں کپڑے بدلوں گا اور نہ اب یہ ناشتہ کروں گا۔“ میں نے اپنے آگے رکھے ناشتے کو غصے سے پٹخ کر کہا۔ اماں مجھے ہکا بکا نظروں سے دیکھنے لگیں۔ میں نے آج تک اماں سے ترش آواز میں تو کیا، کبھی اونچی آواز سے بھی بات نہ کی تھی۔ میں اسی غصے کی حالت میں اٹھ کر باہر نکل گیا۔

”اللہ! میرے بچے کی حفاظت فرما!“ عقب سے مجھے اماں کی سہمی ہوئی آواز سنائی دی تھی۔

دن کے بارہ بج رہے تھے اس وقت گلی میں لوگوں کی آمد و رفت شروع ہو چکی تھی۔ میں نے گاڑی اگلی گلی میں تیزی سے موڑی۔ یہی گلی باہر مین سڑک تک جاتی تھی۔ میں نے گاڑی غلت میں بغیر بارن دیئے موڑی ہی تھی کہ اچانک کوئی وجود دلہرا تا ہوا میری گاڑی سے ٹکرا گیا۔ ایک جیج فضا میں بلند ہوئی۔ میں نے تیزی سے بریک پر پاؤں رکھ دیئے۔ ٹائروں کے چرچرانے کی آواز گونجی۔ میں برق رفتاری سے باہر نکلا۔ ایک بوڑھی عورت خون میں لت پت گاڑی کے آگے پڑی تھی۔ اس کے ساتھ کھڑی ایک چودہ پندرہ سال کی لڑکی بے طرح روئے جا رہی تھی۔ وہ بار بار ”اماں!.....! اماں!.....!“ پکار رہی تھی۔ لوگوں کا ہجوم بڑھنے لگا۔ لوگوں کی نفرت آمیز نظریں میری جانب اٹھنے لگیں۔ میں نے لڑکی کو تسلی دی اور اُس عورت کو اپنی گاڑی میں ڈال کر نزدیکی اسپتال لے گیا لیکن اُس عورت



## پُر اسرار ڈاک بنگلہ

آصف شفیق

رات دس گیارہ بجے کامل تھا۔ ہم لوگ بستروں پر لیٹے ہوئے تھے کہ اچانک ماحول کی خاموشی کو ایک نسوانی فنی کی آواز نے بھڑکھڑایا پہلے پہل تو مجھے وہم لگا مگر جب وہی تہہ دربارہ.....

دوسری باتیں



کو چومتی۔ میرے شوہر حیات نہیں۔ گھر سے یوں کبھی نکل جاتی تو یہی بچی اس کے پیچھے بھاگتی پھرتی اور سمجھا بجا کر گھر واپس لے آتی۔ آج بھی میری بہن یونہی نکل گئی تھی۔ میں نے اسے بھیجا کہ دیکھو! کہاں گئی ہے؟ مگر مجھے خبر نہیں تھی کہ یہ حادثہ میری بہن کے مقدر میں لکھا تھا۔ وہ اُس لڑکی کی طرف اشارہ کر کے اماں بی سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ اماں انہیں تسلیاں دینے لگیں۔

یہ تھی میری کہانی لیکن کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی! ابھی کچھ باقی ہے۔ زندگی کا کون سا لمحہ ہماری زندگی کو نیا رخ دے دے ہم نہیں جانتے۔ اللہ کی مصلحتیں وہی جانتا ہے۔ ہماری اماں نے چند دنوں بعد ہی اُس لڑکی کا رشتہ میرے لیے مانگ لیا۔ میری ہونے والی بیگم مجھ سے چودہ برس چھوٹی تھی۔ اماں کے اس فیصلے سے اب سب خوش تھے۔ کچھ روز بعد ہی ایک شام خاموشی سے نکاح ہو گیا اور یوں کرن بیوی بن کر میری زندگی میں داخل ہو گئی۔ شادی کے بعد کرن نے اپنی ماں کی حیات کے جو اوراق ہمارے سامنے لپٹے تو ہم سب حیران رہ گئے کہ کن مشکلات سے گزر کر انہوں نے ایک معصوم بچی کے ساتھ ہندوستان سے پاکستان کا سفر کیا تھا۔ یہ داستان پھر کبھی ابھی میں اجازت چاہوں گا کہ ہمارے بیٹے، بہوئیں پوتے پوتیاں سب ہی کیک کاٹنے کے لیے ہمارے منتظر ہیں اور ہاں سیاہ رنگ کے حوالے سے جوتا کید میرے دادا جان نے میری اماں کو کی تھی یا ہندو جوگی نے جو پیش گوئی کی تھی وہ سب تو ہم پرستی نہیں بلکہ ایک حقیقت تھی جس کا مجھے یقین آ گیا ہے کہ دنیا میں ایسے ایسے علوم ہیں جن سے مستقبل کے اشارے مل سکتے ہیں۔

نے راستے میں ہی دم توڑ دیا۔ لڑکی کا غم کے مارے برا حال تھا وہ بار بار بے ہوش ہو رہی تھی۔ میں نے بڑی مشکلوں سے اُس کے گھر کا پتا اُس سے معلوم کیا پھر اُس لڑکی اور میت کو لے کر اُس کے گھر پہنچا تو قیامت برپا ہو گئی۔ یہ اُس کی خالہ کا گھر تھا جو میرے گھر سے دس منٹ کی ڈرائیو پر تھا۔ گھر میں کوئی مرد نہیں تھا صرف یہ عورتیں ہی رہتی تھیں۔ میں میت کی تجیز و تدفین کے انتظامات کرنے لگا۔ اس دوران میں نے بھاگ کر اپنے گھر والوں کو بھی اطلاع دے دی تھی۔ اماں ساری بات سن کر دھک سے رہ گئیں..... اور فوراً وہاں چلی آئیں۔

”میں بہت شرمندہ ہوں میرے بیٹے کی وجہ سے یہ سب ہو گیا۔ آپ ہمیں معاف کر دیں۔“ اماں اُس لڑکی کی خالہ سے لپٹ کر روئے جا رہی تھیں۔ ”بہن.....! جو ہونا تھا ہو چکا۔ اللہ پاک کی یہی مرضی تھی۔ ہم نے آپ کو معاف کیا۔ دراصل میری بہن ذہنی مریضہ تھیں۔“ ”ذہنی مریضہ؟“ اماں بی نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”بہن.....! ہندوستان سے لٹ پٹ کر آنے والوں میں میری بہن بھی شامل تھی۔ اُس نے اپنے شوہر اور تین بیٹوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے لہو لہو ہوتے دیکھا تھا۔ سکھوں کی درندگی دیکھ کر بڑے بڑے ہوش مند اپنا ہوش کھو بیٹھے۔ ماں باپ کے سامنے اُن کی بیٹیوں کی عصمتوں کو روندنا گیا۔ میری بہن نے اپنی بیٹی کے منہ پر خوب ساری کالک مل دی اور چھٹی چھپائی پاکستان پہنچنے میں کامیاب ہو گئی۔ اس نے اپنے تین بیٹوں اور شوہر کو تو کھودیا لیکن بیٹی کی عصمت بچانے میں کامیاب ہو گئی اور خود ذہنی مریضہ بن گئی۔ اب تو یہ حالت ہو گئی تھی کہ دیوانگی کے عالم میں بلیوں میں نکل جاتی، اپنی زمین کے ایک ایک ذرہ



دن آہستہ آہستہ ڈھلتا جا رہا تھا، ہم تقریباً چھ سات گھنٹوں سے جیپ میں مسلسل سفر کر رہے تھے۔ میرے ساتھ نواز بیٹھا جیپ ڈرائیو کر رہا تھا جبکہ نوید پچھلی سیٹ پر تنہا بیٹھا کسی کتاب کے مطالعے میں مگن تھا۔ ابھی ہماری منزل تقریباً پانچ گھنٹوں کی مسافت پر تھی۔

”یار نواز! میرا خیال ہے یہ وہی گاؤں سامنے آ رہا ہے یہاں کہیں رات گزارتے ہیں صبح آگے چلیں گے۔ میں تو بہت تھک گیا ہوں۔“ میں نے سامنے والی بستی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جو ہم سے تھوڑے فاصلے پر رہ گئی تھی۔

”ہاں نواز! احمد صحیح کہہ رہا ہے۔ تم بھی تو تھک گئے ہو گے۔“ نوید نے جھٹ سے کتاب بند کر دی اور میری بات کی تائید کی۔

تھوڑی دیر قبل ہم ایک شہر سے گزر رہے تھے۔ میں نے وہاں قیام کا مشورہ دیا تھا تو نواز نے کہا تھا۔ ”ہم منزل پر پہنچ کر ہی آرام کریں گے۔“ لیکن اب شاید وہ خود بھی تھک چکا تھا۔ اس نے جیپ بڑے روڈ سے اتار کر بستی والے کچے راستے پر ڈال دی۔ ہر طرف مٹی ہی مٹی اڑنے لگی تو مجبوراً اسے جیپ بہت آہستہ چلا کر گاؤں تک پہنچنا پڑا۔

گاؤں میں لوگ ہمیں عجیب نظروں سے دیکھ رہے تھے شاید اس لیے کہ ہم یہاں اجنبی تھے اور چولستان میں سفر کر رہے تھے۔ ہم نے انہیں بتایا کہ ہم کافی لمبا سفر طے کر کے آ رہے ہیں۔ ابھی ہمیں بہت آگے جانا ہے۔ یہاں ہم رات گزارنا چاہتے ہیں۔ اس پر ایک لڑکے نے کہا۔ ”یہاں راجا کی حویلی میں جو ڈاک بنگلہ کھلاتا ہے تم معاوضہ ادا کر کے رات گزار سکتے ہو۔“ ہم تیار ہو گئے تو وہی لڑکا ہمیں اپنی رہبری میں ڈاک بنگلے تک لے آیا۔

حویلی نما ڈاک بنگلے کی بیرونی طرز تعمیر سے پتا چلتا تھا کہ وہ کسی زمانے میں انتہائی عالی شان عمارت ہوگی شاید سو سال پہلے یا اس سے بھی قدیم عمارت تھی۔

وہ لڑکا جو ہمارے ساتھ آیا تھا بنگلے کے بوڑھے ملازم بابا کا بیٹا تھا۔ بابا ساٹھ پینسٹھ سال کا بوڑھا آدمی تھا، چہرے پر بے تراش داڑھی موچھیں بڑی بڑی آنکھیں، مولیٰ سی ناک اور چہرے کی ڈھلکی ہوئی جلد نے اس بوڑھے کو عجیب سی ہیبت سے نواز رہا تھا۔ بابا کے کانپتے ہاتھ میں ایک بڑی سی لائٹن تھی۔ اس کا بیٹا اسے اندر سے بلا کر لایا تھا اور ہمارے بارے میں شاید اسے پتا چکا تھا۔ بابا نے لائٹن اوپر اٹھا کر ہم تینوں کا بغور مشاہدہ کرنے کے بعد اندر آنے کا اشارہ کیا اور آگے آگے چل پڑا۔

”بابا! یہ دو گاڑیاں یہاں کیسے آگئیں؟ لگتا ہے کافی عرصے سے استعمال میں نہیں آئیں؟“ نواز نے دور ایک طرف کھڑی دو گاڑیوں کی طرف اشارہ کیا جو گر دو غبار سے اٹی ہوئی تھیں۔

”جب بندہ دنیا سے جاتا ہے ناں بیٹا! تو کچھ بھی ساتھ نہیں لے جاتا سب کچھ دنیا میں چھوڑ جاتا ہے۔“ بابا بولا۔

بابا کا جواب ہمارے لیے تسلی بخش نہیں تھا۔ گاڑیوں کے ماڈل کوئی پندرہ بیس سال پرانے تھے۔ یہ تو ہو نہیں سکتا تھا کہ حویلی کے مالک مرتے وقت چھوڑ گئے ہوں کیونکہ بابا کے بیٹے نے جیپ میں آتے وقت ہمیں بتایا تھا کہ حویلی کے مالکوں کو مرے بہت عرصہ ہو گیا ہے اور گاؤں میں ان کے متعلق کوئی بھی نہیں جانتا۔

قدیم بنگلے کی عمارت کا دروازہ کھول کر ہم ایک بہت بڑے ہال نما کمرے میں داخل

ہوئے۔ ہال میں موجود قیمتی اور آرائشی سامان نے ہم تینوں کو حیران کر دیا۔ اس بڑے ہال میں سبھی اشیاء اور فرنیچر ایسی حالت میں تھا جیسے بنگلے میں ابھی تک کوئی خاندان آباد ہو۔ ہال میں ایک طرف لمبی سی راہداری کا دروازہ تھا۔ بابا ہمیں اسی راہداری میں لے آیا۔ راہداری میں تقریباً دس بارہ کمرے تھے لیکن سب کے دروازے پر پرانے زمانے کے بڑے بڑے زنگ آلود تالے لگے ہوئے تھے۔ بابا ہمیں جس کمرے میں لایا اس پر کوئی تالہ نہیں تھا۔ اس کمرے میں تین شاندار بستر پہلے سے لگے ہوئے تھے اور کمرے کی حالت بھی ہال کی طرح بہت اچھی تھی۔ بابا نے کمرے میں ایک بڑی سی لائٹن روشن کر دی اور بولا۔ ”بیٹا! میں تمہارے لیے کھانے کا انتظام کرتا ہوں تب تک تم لوگ منہ ہاتھ دھولو۔“ اتنا کہہ کر بابا پلٹ گیا لیکن کمرے کے دروازے پر پہنچ کر جلدی سے ہماری طرف یوں گھوما جیسے اسے کوئی اور بات یاد آگئی ہو۔ ”ہاں بیٹا! ایک بات غور سے سن لو یہاں جس مقصد سے تم آئے ہو اس پر برقرار رہنا اور کسی چیز یا کسی بات پر غور مت کرنا۔ ہر کسی کا اپنے کام کرنے کا ڈھنگ علیحدہ ہوتا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ کمرے سے نکل گیا۔ بابا کی یہ عجیب سی بات ہماری سمجھ میں نہ آ سکی۔

باتھ روم ہمارے کمرے سے ملحق تھا۔ ہمارے نہانے دھونے تک بابا ہمارے کمرے میں ہی کھانا لگا چکا تھا۔ کھانے سے فارغ ہو کر مجھ پر تو تھکان کی وجہ سے نیند کا غلبہ ہونے لگا لیکن نواز اور نوید دونوں بنگلے میں گھومنا پھرنا چاہتے تھے حالانکہ بابا نے منع بھی کیا تھا۔ ”مجبوراً مجھے بھی ان کا ساتھ دینا پڑا۔“

ہم راہداری میں آئے تو چاند کی روشنی نے

کسی حد تک راہداری کو بھی روشن کر دیا تھا۔ ہمارے کمرے کے علاوہ باقی تمام کمرے اسی طرح بند تھے۔ ہم ہال نما کمرے میں آگئے۔ بابا کی موجودگی کا کوئی نشان نہیں تھا۔ ہم تینوں سجاوٹی اشیاء کو غور سے دیکھنے لگے۔ دیواروں پر حنوط کیے ہوئے شیر ہرن اور بارہ سنگھوں اور دوسرے خوفناک جانوروں کی گردنیں اور شیر چیتوں کی کھالیں آویزاں تھیں۔ کمرے کی ایک دیوار پر تلواریں اور کلہاڑے بھی آویزاں تھے اور وسط میں بڑا سا گول صوفہ موجود تھا۔

”میرا خیال ہے کہ حویلی کا مالک سخت مزاج اور ظالم طبیعت کا انسان تھا۔“ نواز ان اشیاء کا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔

”ہاں! کمرے کی سجاوٹ اور یہاں موجود اشیاء سے تو ایسا ہی لگتا ہے۔“ نوید نے نواز کی تائید کی۔

میرے خیال میں ان کا اندازہ ٹھیک ہی تھا مگر میں نے کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا۔ اچانک نواز کی چیخ نے مجھے اور نوید کو چونکا دیا۔ ہم فوراً اس کی طرف بڑھ گئے لیکن وہ مطمئن نظر آیا البتہ وہ سامنے لگی ایک تصویر کو دیکھتے ہوئے لمبے لمبے سانس لے رہا تھا۔ تصویر ایک بوڑھے آدمی کی تھی جس کے چہرے پر داڑھی اور سر پر بڑی سی پگڑی تھی۔ شکل و صورت کافی ہیبت ناک تھی۔ کھڑکیوں سے چاند کی چھن چھن کر آنے والی مدہم روشنی نے نہ صرف ماحول کو بلکہ بوڑھے کی تصویر کو بھی خوف ناک بنا دیا تھا۔ میں نے نواز کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر اسے تھوڑا حوصلہ دیا۔

”یار! بڑی خوف ناک سی تصویر لگائی ہوئی ہے



یہاں۔“ نواز نے مجھ سے کہا۔

نوید بھی مسلسل تصویر کو تک رہا تھا۔ اچانک مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی نہایت آرام سے چلتا ہوا ہمارے پیچھے آ کر کھڑا ہوا ہے۔ میرے دل میں خوف کی ایک لہری دوڑ گئی، شاید یہی حال اور سوچ نواز اور نوید کی بھی تھی۔ ہم تینوں اکٹھے پیچھے گھومے تو ہمارے پیچھے بابا کھڑا تھا۔

”تم یہاں کیا کر رہے ہو بیٹا؟“ اس نے پوچھا۔ خلاف توقع بابا کا لہجہ حسب معمول نرم ہی تھا۔ ”کچھ نہیں بابا، بس یونہی ذرا گھوم پھر کر حویلی دیکھ رہے تھے۔“ نوید نے جواب دیا۔

”بیٹا، رات کافی ہو گئی ہے اب آرام کرو اور میں نے تمہیں نصیحت کی تھی کہ کسی چیز پر کسی بات پر غور مت کرنا۔ ہر کسی کا اپنا ڈھنگ ہوتا ہے اور جس مقصد سے یہاں آئے ہو صرف اسے یاد رکھو۔“ بابا پھر عجیب سی نصیحتیں کر کے لوٹ گیا۔ ہم تینوں واپس اپنے کمرے میں جا پہنچے۔ مجھ پر تو نیند کا غلبہ تھا، سو میں سو گیا لیکن نواز اور نوید میرے قریب لگے بستروں پر بیٹھے باتوں میں مصروف رہے۔

صبح کچھ دیر سے میری آنکھ کھلی اٹھا تو پتا چلا کہ نوید کی طبیعت کافی خراب ہے۔

”میرا خیال ہے کہ اب ٹھیک منزل پر پہنچ کر ہی نوید کا علاج کروائیں گے۔“ میں نے مشورہ کیا لیکن نواز نے صاف انکار کر دیا۔

”نہیں، اس کی طبیعت بہت خراب ہے اور سفر کافی باقی ہے۔ کہیں راستے میں اس کی طبیعت مزید خراب نہ ہو جائے۔ کیا ہو جائے گا اگر ہم ایک آدھ دن یہاں اور رہ لیں گے۔“

نواز کے بات کرنے کے دوران بابا کمرے میں آ چکا تھا۔ بولا۔ ”ہاں بیٹا، ایک آدھ دن یہاں رہ لو شاید تمہارے لیے مفید ثابت ہو۔“

ناشتے کے بعد دوپہر کا کھانا اور رات کا کھانا بھی کمرے میں ہی پہنچ گیا۔ بابا برابر ہماری خدمت کر رہا تھا۔ نوید کا سارا دن بستر پر اور نواز کا نوید کے پاس بیٹھے گزارا جبکہ میں چند کتابوں کا مطالعہ کرتا رہا کیونکہ میرے نزدیک یہ اچھی بات نہیں تھی کہ میرے دوست کی طبیعت خراب ہو اور میں انہیں باہر گھوموں پھر دوں۔

اس رات ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ دس گیارہ بجے کا وقت تھا۔ شام سے نوید کی طبیعت کافی اچھی ہو چکی تھی۔ ہم لوگ بستر پر لیٹے ہوئے تھے کہ اچانک ماحول کی خاموشی کو ایک نسوانی ہنسی نے چور چور کر دیا۔ پہلے پہل تو مجھے وہم ہی لگا مگر جب وہی قہقہہ دوبارہ فضا میں گونجا تو میں بستر پر اٹھ بیٹھا۔ نوید اور نواز بھی بستر پر اٹھ بیٹھے تھے پھر اچانک قہقہوں کی آواز رونے میں بدل گئی۔ وہی عورت اب رونے لگی تھی۔ کچھ دیر بعد آوازیں آنا بند ہو گئیں تو ہم تینوں نے کمرے کی کھڑکیوں سے باہر جھانک لیکن وہاں دور تک کوئی ذی روح نہیں تھا پھر اچانک سفید ساڑی میں لبوس ایک عورت سامنے درختوں کے جھنڈ میں دکھائی دی۔ فاصلے کے باعث اس کا چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ جب وہ آگے بڑھنے لگی تو اس کے چہرے کے خدو خال نمایاں ہو گئے۔ وہ چھپن چھپیں پچیس سال کی ایک خوب صورت عورت تھی، ہلا کی کشش تھی اس کے سر اے میں۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ درختوں کے جھنڈ میں گھوٹی۔ ہم مسلسل اسی طرف دیکھ رہے تھے کہ اچانک کمرے کے کھلے دروازے سے راہداری میں وہی ہنسی کی آواز گونجی۔ ہم فوراً پیچھے کمرے تو وہ عورت دروازے میں کھڑی ہنس رہی تھی لیکن ہمارے مڑنے پر فوراً بھاگ گئی۔ میرے تو اس وقت پاؤں جیسے زمین نے جکڑ لیے تھے۔ سردی کے باوجود میرا وجود پسینے میں

شرابور تھا۔ تینوں میں سے کسی میں بھی اتنی ہمت نہیں تھی کہ راہداری تک جائے پھر اچانک جھنڈ کی طرف سے رونے کی آواز نے دل دہلا دیا۔ ہم کھڑکی کی طرف گھوم گئے۔ اس وقت وہ عورت ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگائے اپنا سر دونوں ٹانگوں میں دیئے بلند آواز میں رورہی تھی پھر وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور جھنڈ میں غائب ہو گئی۔ کافی دیر تک جب وہ دوبارہ نمودار نہ ہوئی تو کہیں جا کر مجھے اپنے بدن میں خون کی گردش محسوس ہوئی۔ میں نے دونوں ہاتھ چہرے پر پھیرے جو پسینے سے شرابور تھا۔ یہی حال نواز اور نوید کا بھی تھا۔ ہم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور دوبارہ کھڑکی سے باہر جھنڈ پر نگاہ ڈالی۔ اسی دوران راہداری میں کسی کے قدموں کی چاپ ابھری تو جلدی سے ہم تینوں نے اپنا رخ دروازے کی طرف موڑ لیا اور پھر بابا کو اندر داخل ہوتا دیکھ کر میری اور ساتھیوں کی جان میں جان آئی۔

”کیا بات ہے بیٹا، یوں پریشان کیوں کھڑے ہو؟“ بابا نے تعجب سے پوچھا۔

”وہ..... وہ..... بابا، وہ عورت کون تھی؟“ نواز کے منہ سے یہ مشکل یہ الفاظ ادا ہوئے۔

”وہ مہارانی تھی، اس حویلی کے مہاراجا کی بیوی۔“ بابا نے بتایا۔

”لیکن بابا، مہاراجا، میرا مطلب ہے، حویلی کا مالک تو بہت عرصہ پہلے مر گیا تھا پھر اس کی بیوی ابھی تک زندہ کیسے ہے؟“ نواز نے تعجب سے پوچھا۔

”زندہ کون کہتا ہے بیٹا، مہارانی کو؟“ بابا نے عجیب سا جواب دیا۔

”وہ عورت تو چل پھر رہی تھی، ہنستی، روتی بھی تھی۔“ نوید جلدی سے بولا۔

”بیٹا، یہ لمبی کہانی ہے، کل صبح اٹھو گے تو ضرور سناؤں گا۔“ بابا اتنا کہہ کر پلٹ گیا۔

”لیکن صبح تو ہم واپس چلے جائیں گے۔“ میں نے کہا۔

”کوئی بات نہیں بیٹا، ایک روز اور یہاں گزار لینا۔“ بابا نے جواب دے کر مزید وہاں رکنا مناسب نہ سمجھا۔ ہم بھی اپنے اپنے بستر میں چلے گئے۔

رات دیر تک جاگنے کے باعث صبح دیر سے اٹھے۔ ہمارے نہانے دھونے تک ناشتا لگ چکا تھا۔ ناشتے کے بعد بابا ہمیں باہر باغ میں لے گیا۔ ہم تینوں بابا کی کہانی سننے کے لیے بے چین تھے۔ تھوڑی دیر بعد بابا نے اپنی کہانی شروع کر دی۔

”بیٹا، میرا دادا اس حویلی کے مالک مہاراجہ کا واحد نمک حلال اور وفادار ترین ملازم تھا۔ یہ کہانی اس نے میرے باپ کو اور میرے باپ نے مجھ تک پہنچائی۔ تم یہ بھی کہہ سکتے ہو کہ اس کہانی اور حویلی کی ملازمت کو ہم نے وراثت میں پایا ہے۔ اس حویلی کا مہاراجہ ایک سنگدل اور ظالم شخص تھا، چھوٹی چھوٹی غلطیوں پر انسانوں کو گاجر، مولیٰ کی طرح کٹوا دیتا تھا، بہت عیاش انسان تھا وہ گاؤں کی شاید ہی کوئی بہن بیٹی اس کے شر سے بچی ہوگی لیکن اسی دوران اسے ساتھ والے گاؤں کی ایک لڑکی بھاگئی اور اس نے اس لڑکی سے شادی کر لی لیکن اس دوران میں گاؤں میں عجیب واقعات شروع ہو گئے۔ گاؤں کے نوجوان اچانک ایک ایک کر کے غائب ہونے لگے۔ بعض لوگوں کا کہنا تھا کہ گاؤں پر آسیب آ گیا ہے، کچھ لوگ اسی ڈر سے گاؤں بھی چھوڑ گئے لیکن ایک دن تو ایسا واقعہ ہوا جو ناممکن سمجھا جاتا تھا۔“ کہتے کہتے وہ رک پھر لمبی سانس لے کر بولا۔ ”بیٹا، میرا دادا جب صبح مہاراجہ کے کمرے میں داخل ہوا تو مہاراجہ بستر پر اوندھے منہ گر ہوا تھا اور مر چکا تھا جبکہ مہارانی



نے اپنے دانت اس کی گردن میں گاڑ رکھے تھے اور اس کا خون پی رہی تھی۔ اصل میں مہارانی کوئی عام عورت نہیں تھی، وہ کالے علم کے کسی منتر کی تکمیل کے لیے انسانوں کا خون پیتی تھی تاکہ..... تاکہ وہ خود امر ہو سکے، ہمیشہ کے لیے زندہ رہ سکے۔ گاؤں میں غائب ہونے والے نوجوانوں کو بھی اسی نے اپنے حسن کے جال میں پھنسا کر مار دیا تھا اور اس کا آخری شکار مہاراجہ تھا لیکن اس سے غلطی ہوگئی مہاراجہ کے خاندان میں کسی بزرگ کا دیا ہوا تعویذ موجود تھا جس کی وجہ سے وہ ہر بلا اور آسیب کے شر سے محفوظ تھے مگر اس وقت وہ تعویذ مہاراجہ کے گلے میں نہیں تھا۔ مہارانی نے شاید مہاراجہ کے بدن سے وہ تعویذ اتر دیا تھا۔ اس نے مہاراجہ کو قتل تو کر دیا لیکن تعویذ پھر بھی کام کر گیا۔ مہارانی کی ساری محنت اس تعویذ کی وجہ سے ضائع ہوگئی۔ اس کے نتیجے میں اب وہ ہمیشہ ایک روح کی صورت یہاں بھٹکتی رہے گی۔ کل رات تم نے اس کی روح دیکھی تھی۔“ بابا نے اپنی عجیب و غریب کہانی ختم کی۔

”لیکن جب آپ کے دادا نے مہاراجہ کی لاش کے پاس اسے اس حالت میں بیٹھا دیکھا تو صاف پتا چلتا تھا کہ خون مہارانی نے کیا ہے تو مہارانی نے آپ کے دادا کو کچھ نہیں کہا؟“ نواز نے ایک نکتہ اٹھایا۔

”اس نے میرے دادا کو کوئی ضرر نہیں پہنچایا لیکن اتنا ضرور کہا کہ اب حویلی کی ملازمت تم اور تمہاری آنے والی نسلیں بھی کریں گی اور وہ کسی کو بھی حویلی کے واقعات نہ بتائے سوائے اسے جن کو وہ اپنا دیدار کروائے۔ تمہیں وہ اپنا دیدار کرا چکی ہے اس لیے میں نے تمہیں ساری بات بتادی۔“ بابا یہ کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا اور عمارت میں چلا گیا۔

”یار میرا خیال ہے اب ہمیں واپس چلنا

میں ہم اوپر پہنچ گئے۔ ہر طرف ہال نما کمرے کی طرح قیمتی اشیاء کے انبار لگے ہوئے تھے۔ اوپر صرف ایک کمر تھا جس پر تالا لگا ہوا تھا۔ بابا نے چابیوں کا ایک گچھا جیب سے نکالا اور تالا کھول دیا۔ بے حد شاندار کمرے میں ایک طرف بڑا سا بیڈ تھا، دوسری طرف شاندار کرسیاں اور مینجھی۔ بڑی بڑی الماریاں دیواروں کے ساتھ موجود تھیں۔ بابا دروازہ کھول کر نیچے واپس چلا گیا۔ ہم تینوں ہر چیز غور سے دیکھ رہے تھے۔ نواز اور نوید نے الماریاں کھولنا شروع کر دیں لیکن وہ صرف کپڑوں سے بھری ہوئی تھیں۔ ایک الماری میں تجوری کا دروازہ نظر آنے پر دونوں اس طرح خوش ہو گئے جیسے تجوری واقعی جواہرات اور سونے چاندی سے بھری ہوگی اور اس کا دروازہ بھی کھلا ہوگا۔ نواز نے نوید کی طرف دیکھا اور پھر ہاتھ تجوری کے ہینڈل پر رکھ کر زور لگایا تو خلاف توقع تجوری کا دروازہ کھڑک کی آواز سے کھل گیا۔ نواز نے فوراً مزہ کر نوید اور میری طرف دیکھا، خوشی سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ جونہی اس نے دروازہ کھولا نوید فوراً آگے بڑھا۔

”یا میرے خدا!“ بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔ تجوری واقعی سونے چاندی کے زیورات سے بھری ہوئی تھی۔ نوید اور نواز نے پاگوں کی طرح زیورات اٹھا کر یوں دیکھنا شروع کر دیا جیسے انہیں یقین ہی نہ ہو پھر نواز مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”ارے یار تو کیوں دور کھڑا ہے؟ دیکھ، ہم لالہ مال ہو گئے ہیں، قسمت کی دیوی ہم پر ہرمان ہوگئی ہے، لگتا ہے کہ مہارانی ہم سے بہت خوش ہوئی ہے۔ اس نے نہ صرف ہمیں اپنا دیدار کروایا بلکہ یہاں تک پہنچا دیا جہاں ہیرے جواہرات اور سونے چاندی کے زیورات سے بھری تجوری کھلی پڑی ہے، شاید مہارانی کو ہم پسند آ گئے

ہیں۔ مہارانی، مہارانی، تم کہاں ہو مہارانی؟“ جوش جذبات میں اس نے مہارانی کو پکارا۔

”ہم یہاں ہیں۔“ اچانک مہارانی کی دلکش آواز نے ہم تینوں کے ہوش اڑا دیئے۔ مہارانی کمرے کے دروازے میں کھڑی ہمیں دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ نواز جس جگہ تھا وہیں پتھر کا سا ہو گیا۔ اس کے ہاتھ سے زیورات نیچے گر چکے تھے۔ ”تم نے واقعی صحیح کہا، ہمیں تم پسند آ گئے ہو۔ بہت دیر ہوئی، کوئی آدم زاد ادھر نہیں بھٹکا تھا۔ اب تو ہم اپنے من کی پیاس بجھائیں گے.....“ مہارانی کی آواز میں بڑے خاندانوں کا سارا رعب اور دب دبہہ تھا پھر اچانک تیز ہوا چلنے لگی، مہارانی کے بال ہوا میں اڑتے ہوئے بہت خوفناک محسوس ہو رہے تھے۔ اس کے ہاتھوں سے عجیب سی آوازیں نکل رہی تھیں جو میرا خون خشک کرنے کے لیے کافی ثابت ہوئیں۔ آہستہ آہستہ مہارانی کے ہونٹوں سے دو دانت باہر تک نکل آئے اور وہ نوید کی طرف بڑھنے لگی تو بے اختیار نوید کی چیخ نکل گئی پھر اچانک مہارانی غائب ہوگئی۔ میں نے اور نواز نے باہر بھاگنا چاہا لیکن نوید بے ہوش ہو کر گر گیا تھا۔ نواز نے ایک دفعہ نوید کی طرف دیکھا اور پھر اس کو جیسے کچھ یاد آ گیا، اس نے اپنی جینٹ کی جب سے ایک ریوالور نکال کر مجھے پکڑا دیا۔ ”تم ادھر دھیان رکھنا، میں اسے ہوش میں لاتا ہوں۔“

وہ نوید کی طرف بڑھا۔ میں کبھی نوید کی طرف دیکھتا، کبھی دروازے کی طرف۔ میرے ہاتھ میں پستول تو تھا لیکن میرا پورا وجود کانپ رہا تھا۔ نواز کی تھوڑی سی کوشش سے نوید ہوش میں آ گیا۔ ”جلدی سے بھاگو نوید.....!“ نواز نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا لیکن پھر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے نوید میں کوئی تبدیلی آرہی ہو۔



## بے وقوف

ایک ٹرک ڈرائیور نے ایک رستوراں کے قریب ٹرک روکا اور کھانا کھانے کے لیے اندر چلا گیا۔ ایک خالی میز پر بیٹھنے کے بعد اس نے اپنے لیے کافی، کریم رول اور سمو سے طلب کیے۔ بیر نے مطلوبہ اشیاء اس کے سامنے لا کر رکھ دیں۔ اچانک تین سائیکل سوار وہاں آ گئے۔ ایک نے سمو سے کی پلیٹ اٹھائی اور سمو سے کھا گیا۔ دوسرے نے کافی پی اور تیسرے نے کریم رول کھالیا۔

ٹرک ڈرائیور نے ان سے ایک لفظ نہیں کہا اور کاؤنٹر پر جا کر تمام چیزوں کی قیمت ادا کر دی۔ پھر ٹرک اشارت کیا اور وہاں سے چلتا ہوا۔ سائیکل سواروں کے سر غنہ نے فلک شکاف قہقہہ لگا کر کہا۔ ”اس بزدل آدمی کو مر داگی تو چھو کر نہیں گزری۔“

”تم ٹھیک کہتے ہو!“ رستوراں کا مالک بولا۔ ”اسے صحیح طور پر ڈرائیونگ بھی نہیں آتی تھی۔ وہ بے وقوف تینوں سائیکلوں کو کچلتا ہوا گیا ہے۔“ فریخہ عدنان۔ بہاولپور

اچانک نوید نے اپنا جھکا ہوا سر اوپر اٹھایا، دیکھتے ہی دیکھتے اس کے چہرے پر بے تحاشہ ہال اگ آئے تھے اور منہ لبوڑا سا ہو گیا تھا۔ اس کا بدن پھولنا شروع ہوا اور پھولتا ہی چلا گیا یہاں تک کہ اس کی شرٹ پھٹ گئی۔ اس کا بدن اب انسانوں کا سانہیں رہا تھا، بے تحاشہ بالوں نے اسے کسی گوریلے کی مانند بنادیا تھا جس کا منہ کسی بھیڑیے جیسی مخلوق کا تھا۔ نوید اب عفریت یا بلا بن چکا تھا۔ اس نے انسانوں کی طرح کھڑے ہو کر ہماری طرف دیکھا اور غراٹا شروع کر دیا۔ میرے پیر جسے زمین نے جکڑ لیے تھے بدن پسینے سے شرابور تھا اور کچی طاری تھی۔ شاید یہی

حال نواز کا بھی تھا لیکن اسی دوران میری نہ جانے کون سی حس بیدار ہوئی کہ میں فوراً باہر دوڑ پڑا۔ نواز بھی میرے پیچھے تھا مگر وہ بلا ہمارے پیچھے نہ دوڑی۔ ہم میزھیوں سے نیچے آ گئے۔ سامنے ہال کا دروازہ کھلا ہوا تھا، ہم دونوں فوراً بھاگ نکلے اور بے تحاشہ دوڑتے ہوئے سامنے درختوں کے جھنڈ میں چاہنچے جہاں پچھلی رات مہارانی کی روح بھٹک رہی تھی۔

یہاں پہنچ کر ہم دونوں رک گئے، دونوں کا سانس پھول چکا تھا، میں لمبی لمبی سانسیں لے رہا تھا۔ پستول ابھی تک میرے ہاتھ میں ہی تھا۔ نواز میرے کندھے پر ہاتھ رکھے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اچانک سامنے سے مجھے غراہٹ کی آواز سنائی دی، وہ بلا ہمارے سامنے آ چکی تھی اور آہستہ آہستہ ہماری طرف بڑھ رہی تھی۔

”فائر..... احمد فائر کر..... مار دے اسے.....“ نواز چلایا لیکن مجھ سے فائر نہ ہوسکا تو اس نے پستول جھپٹ لیا اور اس بلا کی طرف پستول کا رخ کر کے گولی چلا دی، گولی سیدھی اس کے دائیں بازو میں لگی۔ وہ بلا کچھ دیر کے لیے رکی پھر آگے بڑھنے لگی۔ اس کا بازو خون سے لت پت ہو چکا تھا۔ نواز نے پھر باری باری اس کی دونوں ٹانگوں کو بھی گولی کا نشانہ بنادیا۔ وہ بلا گر گئی لیکن گرتے ہی نوید کی شکل میں تبدیل ہو گئی۔ نوید کے داہنے بازو اور دونوں ٹانگوں میں سے خون نکل رہا تھا، وہ بے بسی کی حالت میں ہماری طرف دیکھ کر کراہ رہا تھا۔ ہم سے رہا نہ گیا، فوراً اس کی طرف بڑھے۔ نواز نے اس کا ایک ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دبانا شروع کر دیا لیکن نوید پھر اچانک بلا بن گیا۔ نواز کا ہاتھ اس نے مضبوطی سے پکڑ لیا۔ نواز نے ہاتھ چھڑانے کی بہت کوشش کی لیکن بے سود..... اس

دوران اس بلا نے دوسرے ہاتھ سے نواز کی گردن کو پکڑ لیا اور اپنے منہ کے قریب لے آئی اور اپنے دانت نواز کی گردن میں گاڑنے کی کوشش کرنے لگی۔

میں نے قریب پڑی نکلوی اٹھائی اور پورے زور سے بلا کے سر پر دے ماری۔ بلا نے اسے چھوڑ دیا۔ نواز نے بھی پھرتی دکھائی اور فوراً دور ہٹ گیا۔ اس کا چہرہ زرد ہو گیا تھا، گردن پر بھی دو جگہوں سے خون نکل رہا تھا۔ ”چلو واپس بھاگ نکلیں، یہاں ہم بچ نہیں سکتے۔“ نواز نے مجھے واپس بھاگ جانے کو کہا۔

”لیکن نوید.....! میں نے جواب دیا۔“ ”وہ اب نوید نہیں رہا..... چلو بھاگ چلیں.....“ نواز نے میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچا تو مجبوراً میں اس کے ساتھ ہولیا۔

نواز ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس نے جیب اشارت کی، میں ساتھ بیٹھا ہوا تھا لیکن اچانک گاڑی میں پچھلی سیٹوں سے مہارانی کا قہقہہ گونجا۔ میں نے اور نواز نے بیک وقت گھوم کر دیکھا، پیچھے مہارانی بیٹھی ہوئی بے اختیار ہنسے جا رہی تھی۔ ہم دونوں نے فوراً چھلانگ لگا دی اور دوبارہ جھنڈ کی طرف دوڑے۔ جس جگہ ہم بلا کو پھرتا چھوڑ کر گئے تھے وہ مجھ سے کافی آگے بھاگا جا رہا تھا لیکن پھر اچانک وہ کسی چیز سے ٹکرا کر نیچے گر گیا۔ میں بھی وہیں رک گیا۔ نواز کے نیچے وہ بلا تھی اور اس نے نواز کے پاؤں کو پکڑا ہوا تھا۔ پہلے تو نواز نے نیچے کی کوشش کی مگر ناکام رہا تو اس نے جیب سے چاقو نکال کر بلا پر پے درپے وار شروع کر دیے۔ کچھ دیر بعد وہ بلا بے تحاشہ حرکت ہو گئی۔ اب وہ دوبارہ نوید کی شکل میں

نواز نے اب میری طرف اور میں نے اس کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ میرا خیال تھا کہ ابھی وہ بلا بن کر میری طرف آئے گا اور شاید اسی خیال سے ہی نواز میری طرف دیکھ رہا تھا۔

پھر اچانک نواز کے ارد گرد کے درختوں میں جیسے حرکت سی پیدا ہوئی اور ان کی ٹہنیاں نواز کی طرف بڑھنے لگیں۔ میں نے چیخا چاہا لیکن آواز جیسے حلق میں پھنس گئی۔ نواز کو اس وقت محسوس ہوا جب وہ ٹہنیاں اسے جکڑ چکی تھیں۔ تھوڑی دیر میں وہ اس قابل بھی نہ رہا کہ بل جل سکے البتہ اس کی ”بچاؤ“ بچاؤ“ کی آواز اس فضا میں گونج رہی تھیں۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کرتا، نواز سے کچھ فاصلے پر مجھے مہارانی کی روح نظر آئی جو میری طرف دیکھ رہی تھی۔

”افسوس آدم زاد تو نے لاچ نہیں کیا اس لیے ان پر سے تو مہاراجہ کے تعویذ کا اثر ختم ہو گیا لیکن تم پر باقی ہے تو پہلا شخص ہے جو یہاں سے زندہ جا رہا ہے۔ جا، بھاگ جا، بھاگ جا۔“ یہ کہتے ہی مہارانی کا قہقہہ بلند ہوا اور مجھ سے جتنی جلدی ہوسکا، میں دوڑ پڑا۔ مجھے راستوں کا علم نہیں تھا لیکن میں خدا کا شکر گزار ہوں جس نے مجھے جلد ہی قریبی گاؤں میں پہنچا دیا۔ گاؤں میں لوگوں نے میری حالت دیکھ کر اصلیت جاننے کی کوشش کی لیکن میں چپ ہی رہا اور راز کو راز ہی رہنے دیا، یقیناً میرے دوستوں کو ان کے لاچ کی سزا ملی تھی اور جیسے ہماری جیب وہاں رہ گئی تھی، شاید ایسے ہی دوسری گاڑیاں بھی ہم جیسے بد نصیبوں کی تھیں جو کبھی وہاں آئے اور مہارانی کی خوبی پیاس کا شکار ہو گئے.....



## ڈگر چل پری کی

تقریبی

عام آدمی طلاق دیتا ہے تو اس کی زندگی میں زلزلہ آ جاتا ہے۔ شہزادے کا طلاق دینا معمولی بات نہیں۔ اس کے بعد بھی زلزلہ نہ آتا تو حکایت کی ضرورت ہوتی۔ یہاں کے لوگ بھی دنیائے الہی کی شادی کرتے ہیں۔

## تقریبی کے قلم سے ڈنمارک کے شہزادے کی زندگی

ایک صاحب جمیل یوسف نے ڈنمارک کا سفر نامہ لکھا تو انتساب محمد اقبال اختر کے نام کیا۔ وہ سفر نامہ الماری میں تلاش کرنے لگے۔ افسوس وہ نہ مل سکا۔ ننھی جل پری کو شہزادہ نہیں ملا تھا، ہمیں سفر نامہ کیا ملتا.....

سفر نامے کی تلاش میں شعر سننے کی بات آئی گئی ہوگئی۔

اقبال اختر کے بارے میں مشہور ہے وہ ایمان دار آدمی ہیں۔ کئی ایسے قصے بھی مشہور ہیں کہ اگر وہ چاہتے، مالا مال ہو جاتے لیکن وہ گنوا دیئے۔ اپنے اصولوں اور دیانت داری کی وجہ سے ان دنوں بھی دھتوان ہیں۔ ہزاروں شعروں کے مالک جو سنا ہے ان کے اپنے ہیں۔

اقبال اختر سے مل کر خوشی ہوئی۔ امید ہے وہ تنقید میں بھی ایمان داری سے کام لیں گے خاص طور سے ہماری تحریروں پر ہولا ہاتھ رکھیں گے۔

ساحل کے ساتھ بزم ادب کی تقریب ساحل ریٹورنٹ میں

”کاش ہوتا.....“ وہ بولے۔ ”میں وہ نہیں صرف ریٹورنٹ سے میگزین کا نام ملتا ہے۔“ ہم معذرت کرنے لگے۔ انہوں نے موقع غنیمت جانا فوراً کہا۔

”اس وقت آ جاؤں؟“ ہم شرمندہ تھے۔ کیا جواب دیتے۔ ایک گھنٹے بعد کا وقت طے ہوا۔ وہ دو گھنٹے میں پہنچ گئے۔ واقعی یہ خواجہ ادریس نہیں تھے۔ ان کی شکل بھی دوسری تھی۔

”ساحل“ میگزین کے کئی شمارے لائے۔ کوپن ہیگن سے اردو کا رسالہ اور وہ بھی مسلسل۔ اس پرستم یہ کہ مفت تقسیم ہوتا ہے۔ گزشتہ پچاس سال سے پاکستان میں لوگ رسالے کتابیں خریدنے سے پرہیز کرتے ہیں۔ ڈنمارک میں یہ عیاشی کیسے کر سکتے ہیں۔ ہم ابھی اسی پر حیران ہو رہے تھے کہ انہوں نے ایک اخبار دکھایا۔ ”ساحل نیوز“ اس دن وہ طے کر کے آئے تھے کہ حسبِ مقدور جھٹکے دیں گے۔

”ساحل“ کے درمیانی صفحات رنگین تھے۔ اس میں اشتہار بھی تھے لیکن ہم اپنے لوگوں کے خراج سے واقف ہیں۔ اول تو اشتہار نہیں دیتے اور اگر یہ غلطی کر دیں تو اسے پھر نہیں دہراتے۔ ادائیگی اس طرح کرتے ہیں کہ آدمی بکریوں کے لیے گھاس فروخت کر لے دودھ بیچنے لگے اخبار رسالہ نکالنے سے توبہ کر لے۔ اکثر لوگ اشتہار کی رقم دیتے ہی نہیں تاکہ آئندہ انہیں زحمت نہ دی جائے۔

آصف رضا کا رسالہ پاکستان میں چھاپا جاتا ہے۔ ہوائی سروس سے کوپن ہیگن لایا جاتا اور نی جیمیل

لنڈن تقسیم کیا جاتا ہے۔ میگزین میں مضامین، انٹرویو اور شاعری شامل تھی۔ پڑھنے والے کے لیے سب مصالحے موجود تھے۔ لوگ پسند بھی کرتے ہیں لیکن مفت ہاتھ آئے تو۔

”ساحل نیوز“ میں خبریں، کالم، تبصرہ شامل تھے۔ ہمیں پسند آیا۔ آصف رضا سوال لکھ کر لائے تھے۔ ایسا نہ ہوتا تب بھی ہم جواب دیتے۔

انٹرویو کی گھنٹے ہوا۔ وہ کیسٹ پر ریکارڈ کرتے رہے۔ کوئی بات رہ نہ جائے۔ ان کے سوالوں سے اندازہ ہوتا تھا، سمجھدار انسان ہیں۔ ادب، صحافت، شاعری سب ہی سے دلچسپی ہے۔

آصف رضا سے کئی تقریبات میں ملاقات ہوئی۔ اصرار کر کے وہ کالم بھی لے گئے۔ ہمارے سامنے اخبار میں شائع بھی کیے۔ ہماری سرگرمیوں کی رپورٹ نمایاں شائع کیں۔ دوسرے تیسرے دن فون کر کے خیریت پوچھتے۔ پردیس میں کوئی اتنی اپنائیت کرے تو اچھا لگتا ہے۔ ایک بار مضمون مانگا۔ عنوان تھا۔ ”اردو کی تازہ بستیاں“ ہم نے کہا۔ ”کسی دن آجائیے۔ ہم بول دیں گے“ آپ لکھ لیجیے گا۔ دوسرے دن گیارہ بجے رات کو آنے کا وعدہ کیا۔ جب تک کوپن ہیگن میں رہے رات کے گیارہ بجے انتظار کرتے رہے۔ وہ شاید بھول گئے یا اردو کی تازہ بستیاں باقی ہو گئیں۔

آصف رضا نے ہماری خبریں، تصویریں کالم چھاپے اور تصویروں کی ایک سی ڈی بنا کر دی کہ سر دراتوں میں جب کوپن ہیگن کی تصویریں دیکھ کر یاد کریں تو وہ بھی نہ بھولے جائیں۔ سمجھدار انسان ہیں۔ ایسے لوگ ہمیں پسند ہیں۔

## غزل

محبت حادثاتی طور پر ہے  
مری یہ رائے ذاتی طور پر ہے  
دلوں سے اخلا کی کارروائی  
سنا ہے انضباطی طور پر ہے  
ترا پہچان کر انجان بننا  
یقیناً احتیاطی طور پر ہے  
کبھی ثابت کبھی سیار ہونا  
یہ دنیا بے ثباتی طور پر ہے  
پھٹتے جارہے ہیں لوگ خود سے  
یہ سب کچھ انحطاطی طور پر ہے  
بہت کچھ اتفاقاً ہو رہا تھا  
بہت کچھ واقعاتی طور پر ہے  
یہاں پر اجتماعی کچھ نہیں ہے  
یہاں جو کچھ ہے ذاتی طور پر ہے

نجم الحسن نجمی

جہلم کے آئینے میں

ہم اس حقیقت سے ناواقف تھے کہ گہرے  
سمندروں میں ایک ملک ایسا ہے جہاں محبت کرنے  
والے لوگ رہتے ہیں۔ ہمارے لیے آنکھیں فرش  
راہ کر دیں گے..... ایک دن بازار سے گزرتے  
ہوئے ایک دفتر کے سامنے ٹھہرے۔ یہ ج  
فاؤنڈیشن ہے۔ مقبول بھٹی چلاتے ہیں ہر سال  
لوگوں کو حج کرانے لے جاتے ہیں ان کے قیام  
طعام اور دوسری سہولتوں کا خیال رکھتے ہیں۔  
مقبول بھٹی بڑی محبت سے ملے یہ جہلم کے  
رہنے والے ہیں۔ اس شہر سے سیکڑوں بارگزرنا ہوا۔  
راولپنڈی جاتے وقت اس کے ریلوے اسٹیشن بسوں  
کے اوڑے پر تازہ پھلی ملتی ہے۔ گرم گرم تلی ہوئی۔ تور  
کے کپڑوں کے ساتھ جو اس کا مزہ ہے۔ وہ تورم  
بریانی میں کہاں۔ ہماری یادوں میں جہلم اس لیے  
بھی رہتا ہے کہ اس کے ایک گاؤں دینا میں اردو کے  
ممتاز شاعر گلزار پیدا ہوئے جو باصلاحیت ہدایت کار  
کے علاوہ بے مثال انسان بھی ہیں۔ ہم اپنا تازہ سفر  
نامہ اکثر احباب کو تحفے میں دیتے ہیں ان میں سے  
بعض یوں چپ سادھ لیتے ہیں جیسے ہم نے انہیں  
افیون سے بنی ہیروئن بھیج دی ہے اور منہ سے ہوا  
نکالی تو دست اندازی پولیس ہوگا۔ گلزار ان چند  
لوگوں میں شامل ہیں جو سید اور رائے بھیجتے ہیں۔  
مقبول بھٹی نے ازراہ کرم اپنی تعریف ”آئینہ جہلم“  
بھی عنایت فرمائی تاکہ ہم اس علاقے کے  
باصلاحیت اور بے باک لوگوں سے واقف ہو سکیں۔ اس  
منی کی خوشبو سونگھ سکیں۔ ہوا کی مہک محسوس کر سکیں۔  
اس سے پہلے جہلم پر ہماری نظر سے اتنی مکمل کتاب  
نہیں گزری۔

ہم نے ”آئینہ جہلم“ سے متاثر ہو کر اپنے افسانہ  
نگار دوست سلطان جمیل نسیم کو مشورہ دیا ہے کہ وہ

حیدر آباد سندھ کے لیے ایک کتاب تحریر کریں تاکہ  
وہ زمانہ احباب اور ماحول ایک جگہ جمع ہو کر  
خوبصورت البم بن جائے۔ انہوں نے دیر کی تو ہم لکھ  
دیں گے۔

مقبول بھٹی نے ہمیں ایک اور تحفہ دیا جو بے  
مثال تھا۔ ایک بوتل میں آب زم زم اور دوسری میں  
بیر علی کا پانی، عربی میں کنوئیں کو بیر کہتے ہیں۔ یہ  
حضرت علیؓ کے کنوئیں کا پانی ہے۔

آب زم زم پینا سعادت اور اعزاز ہے۔  
ایک بار ہمارے دوست اور اردو کے ممتاز شاعر  
منظر ایوبی نے اپنی بیٹی کی شادی کی۔ اہتمام یہ تھا کہ  
لڑکے والے لڑکی کے گھر ایک مہندی کا پودا لگائیں  
اور اہل کے بدلے ایسا ہی لڑکی والے کریں۔ نکاح  
میں کھجوریں اور آب زم زم تھا۔ جان بوجھ کر ہم اس  
تقریب میں شریک نہیں ہوئے کیوں کہ یہ چاہتے  
تھے کہ اپنے حصے کا آب زم زم مکہ مکرمہ میں جا کر  
نوش کریں۔ یہاں بی لیا تو پھر وہاں کیسے جائیں گے  
لیکن کوپن ٹیکن میں مقبول بھٹی نے اس خلوص سے دیا  
کہ جب بھی پیارپ سے بھٹی کے اہل خانہ کی صحت  
خوش حالی زندگی مانگی اور سکون اس بات کا ہے کہ وہ  
ستارا اور عطا کرتا ہے اور جب وہ دیتا ہے تو بے حساب  
اس لیے ہم اس کا نام اس کا کلام گن کر نہیں پڑھتے۔  
شارخ خالق اور مخلوق دونوں کی طرف سے نہ ہو تو اچھا  
ہے۔

مقبول بھٹی کئی محفلوں میں ملے۔ ہم نے ہمیشہ  
پر خلوص پایا۔ کاش ہم کوپن ٹیکن میں رہتے تو ان کے  
توسط سے آب زم زم ملتا رہتا..... کیا خبر اللہ اس پانی  
کے صدقے اپنی رحمت انعام اکرام کے سلسلے میں  
اور اضافہ کر دیتا۔

بھٹی کے دفتر سے نکلے تو ہماری خوش قسمتی اسلم  
نہرل گئے۔ یہ صحافی ہیں۔ روزنامہ جنگ لندن کے

نمائندے پاکستان سے ٹوٹ کر محبت کرتے ہیں۔  
ایک تقریر میں ہم نے پاکستان کو ماں باپ قرار دیا۔  
یہ ہمیں پسند کرنے لگے۔ جنگ میں نمایاں خبر شائع  
کرائی۔ ریڈیو سے انٹرویو نشر ہوا تو فون کر کے  
تقریف کرنے لگے۔ ان کی خواہش تھی ایک شام  
چائے ساتھ بیٹیں۔ تفصیلی ملاقات ہو کچھ ہم سے  
سکین۔ سنائیں..... ہم وعدے کرتے رہے۔ کل  
شاید انہی کے طفیل میسر آجائے۔ وہ ضد کرنے  
لگے۔ ”کولڈ ڈرک پی لیں۔“ ہم نے معذرت کی۔  
بٹ کے ساتھ کھانے پر جانا تھا اور یوں وہ شام  
ڈوب گئی۔

ظہور کا گھر بیارا

کوپن ٹیکن میں ایسے بہت سے موقع آئے  
جب ظہور کا ساتھ ہوا۔ اس سفر کا لطف ہی کچھ عجیب  
ہوتا۔ ظہور کو گانے کا شوق ہے آواز اچھی ہے گاڑی  
اسٹارٹ ہوتی، ہم فرمائش کرتے۔ ظہور کو کچھ رنج پسند  
ہے۔ یہ ہماری بھی کمزوری ہے۔ اس کے گانے سے  
لطف آتا۔ جب وہ پنجابی کی کافی سناتو یوں لگتا۔ ہم  
گیہوں کے کھیتوں سے گزر رہے ہیں۔ گاؤں کے  
کنوئیں کی منڈیر پر کھڑے اوک سے پانی پی رہے  
ہیں۔ دیہات کے بازار میں ہیں۔ میدانوں میں  
میلے لگے ہیں۔ ہم سنہری چمڑی باندھے اسے ڈھونڈ  
رہے ہیں جو ابھی تھا اور کسی جھولے کی آڑ میں چھپ  
گیا۔ کسی دکان میں چلا گیا ہے میلے میں گم ہو گیا۔

گاڑی چلتی رہی۔ ظہور کی آواز بلند ہوتی رہتی۔  
باہر بارش، کبھی سبز درختوں اور پھولوں کے درمیان  
سے گزرتے رہتے۔ زندگی میں کیا ہے۔ رنگ خوشبو  
روشنی اور آوازیں۔ یہ نہ ہوں تو بس تاریخ کے  
اُجڑے محل ویران قلعے اور خود روگھاس سے ڈھکے  
کھنڈر۔ ظہور کی شخصیت کمال کی ہے۔ جب یہ 19  
سال کے تھے۔ لاہور کے اسٹیشن پہنچے اور جس طرف



منہ اٹھا، چل پڑے۔ ادھر ادھر کے ملکوں میں چھپتے چھپاتے جبرئی آگئے۔ جہاں برف میں ڈوبی ہوئیں۔ ویران دن اور راتیں۔ مشکل کے سیکڑوں پہاڑ راہ میں کھڑے تھے۔ ماؤنٹ ایورسٹ کی بلند چوٹی صدیوں سے سر اٹھائے انسانوں کو لاکھاتی رہتی تھی۔ ایک دن وہ جرات مند بہادر جوان تن سگھ اور ایڈمن بلیری اٹھے اور اس چوٹی پر اپنی فتح کا جھنڈا لہرا دیا۔ اسی طرح جیسے گہرے نیلے سمندوں کے سینے پر انسان نے سفر شروع کیا تھا، ظہور کا شمار بھی انہی لوگوں میں ہوتا ہے۔ پریشانی مشکلات برف کی طرح پکھل گئیں۔ ظہور لندن پہنچے اور پھر وہاں سنہری بالوں اور موسم کے دل والی لڑکی ملی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو پسند کیا۔ لڑکی کی ماں نے ظہور کو دیکھا اور شادی ہوگئی۔ یہ پیاری سی لڑکی ڈنمارک کی تھی۔ ظہور کو پینٹنگن پہنچنے تو اس کے گاؤں فیونن چلے گئے۔ کھیت باغ پانی اور پھولوں سے بھر اگھر۔ وہاں ایک استور تھا۔ یہ وہاں کام کرنے لگے۔ وقت گزارنے کے لیے۔ استور کا مالک دو پہر کو اپنے کھانے میں انہیں بھی شریک کر لیتا لیکن زندگی اگر صرف دورویں پر بسر ہوتی تو نہ ریل گاڑیاں بھانگیں نہ ہوائی جہاز ہواؤں میں تیرتے، کون تاج محل بناتا اور قلعے کیوں تعمیر ہوتے۔

ظہور اور ان کی بیوی نے کوپن ہیگن آنے کا فیصلہ کیا۔ اپنے ارادوں کو بازو کی طاقت سے پورا کرنے کے لیے۔ دنیا دو ہاتھ سے حاصل کی جاتی ہے، یہ چار تھے اس لیے خوشیاں اور راحتیں جمع کیں۔ اپارٹمنٹ لیا۔ گاؤں کی گوری کو کھلا ماحول تازہ فضا کی تمنا تھی اس لیے ایک خوبصورت گھر خرید لیا۔ ایک شام ضد کر کے ظہور اپنے گھر لے گئے۔ دو طرف سبز پتوں کی باڑ لگی ہے۔ دروازے سے سیڑھیوں تک سفید پتھر نیچے ہیں جو مین سیڑھیاں

اندر جاتی ہیں۔ وہ ظہور نے خود بنائی ہیں۔ اندر سیدھے ہاتھ ڈرائنگ روم، الٹی طرف ڈرائنگ روم سامنے ہاتھ روم اس کے برابر باورچی خانہ، ظہور کی بیوی آئی۔ دہلی پتلی اسارت لڑکی ڈنمارک کے لوگ خوبصورت ہوتے ہیں۔ خوش اخلاق، فلسفہ ہیں۔ ہمیں دیکھ کر وہ خوش ہوئی۔ منع کرنے کے بعد بھی باورچی خانے سے کھانا لے آئی۔ ظہور نے اپنے ہاتھ سے دال پکا کر تھی، مچھلی تھی اور سلاد بیوی نے بنائی تھی۔ ظہور کے دو پیارے بچے ہیں۔ بڑی لڑکی اور چھوٹا بیٹا۔ ان سے ملاقات ہوئی۔ ڈنمارک کے بچے ہیں، وہی رنگ وہی چہرہ، کون کہہ سکتا ہے ان کے دادا لاہوری ہیں۔ ایک بات پر تعجب ہوا ظہور کے علاوہ اس گھر میں اردو کوئی نہیں بولتا۔ ہم نے ظہور کی بیوی سے پوچھا۔ ”اردو سمجھ لیتی ہو.....“ اس نے سر ہلا دیا۔ اتنی اردو کافی ہے۔ اس بات کی خوشی ہوئی کہ پاکستان کے جن جن لوگوں نے ڈینش لڑکیوں سے شادی کی ہے ان کے رنگ میں ڈوب گئے ہیں۔ اردو نہیں سکھائی ڈینش سیکھ لی۔ بچے تو ہمیں زندگی گزاریں گے۔ وہ کیوں اردو بولیں۔

کھانا اچھا، خاص طور سے دال۔ مچھلی ہماری پسندیدہ ڈش ہے۔ ظہور کی بیوی چلی گئی۔ ہم ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر رنگ لگے پیتے اور کا جو کھانے لگے۔ جب بھی خشک میوہ کھائے ڈاکٹروں کی اس ہدایت کو بھول کر کہ اس سے خون میں چربی پیدا ہوتی ہے۔ ایک بار ایک کلو گرام کا اپنے سامنے تیل نکلوا یا۔ یہ ایک ہزار گرام تھے۔ اس سے مشکل سے اصلی تیل 400 گرام نکلا۔ دنیا میں کوئی شخص ایک ہزار کلو گرام بامدام نہیں کھا سکتا۔ زیادہ سے زیادہ دس میں نوش کرے گا۔ اب اس میں جو تیل ہوگا اس کا اندازہ کوئی بھی لگا سکتا ہے۔ یوں بھی اللہ تعالیٰ نے بامدام

اخروٹ کا وعدہ تو کیا نہیں۔ ہاں حور کے لیے ضرور کہا ہے اسی لیے تو ہم دنیا کی حوروں سے کئی کراتے ہیں کہ اوپر جا کر سمجھ لیں گے۔ یہاں تو کھانے دانوں پر زور ہے۔ ظہور کی بیوی کافی لے آئی اور اجازت لے کر چلی گئی۔ ظہور نے اپنا لان دکھایا۔ اس میں ایک طرف انگور کی سیلیں۔ عثماني انگوروں سے بھری تھیں۔ کھا کر دیکھتے تو بے انتہا میٹھے۔ ہاتھ تک شیرے سے چپک گئے۔ سب کا ایک درخت پھلوں سے لدا تھا، اسے دیکھ کر اندازہ ہوا اہل خانہ کو ان پھلوں کا شاید علم نہیں۔ ظہور کی بیگم بازار جاتی تو دوسری چیزوں کے علاوہ پھل بھی لے آتی ہیں۔ گھر کے انگور، سب خوبصورتی کے لیے ہیں۔ لان میں باربی کیو کا انتظام تھا۔ پیچیں بھی رکھی تھیں۔

گھر کے دو طرف سرسبز پتوں کی باڑ تھی۔ اسے ظہور ہر ہفتے تراشتے ہیں۔ سردیوں میں گھر کے سامنے سے برف صاف کرتے ہیں۔ گھر میں کچھ نہ کچھ تبدیلی کرتے رہتے ہیں۔ ڈنمارک کی ہوائی سردی میں ملازم ہیں۔ ہر موسم میں سائیکل پر دفتر جاتے ہیں۔ بیوی لائبریری میں ملازم ہے۔ جب تک ہم ڈنمارک میں رہے اکثر ان کے ساتھ سفر کا موقع ملا۔

ہم لوگ گھر سے باہر نکل رہے تھے تو اسد آگئے۔ یہ ظہور کے دوست ہیں بلکہ اک عمر کے ساتھی۔ ان دونوں کے مراسم ایسے ہیں جس میں گلے شکوے نہیں ہوتے۔ اسد کی شکل گلوکار ابراہیم الحق سے ملتی ہے ویسے انہیں گلوکاری کا شوق نہیں۔

اسد اور ظہور احمد دونوں ایک ساتھ لندن میں تھے۔ وہیں شادی کا فیصلہ کیا۔ حیرت انگیز بات یہ ہے دونوں کی بیویوں کے نام بھی ایک ہیں اور بچے بھی دو دو ہیں۔ اسلام آباد میں اسد اقبال دیکھن سٹی

کے سفیر کے دفتر میں ملازم تھے۔ جب وہ اپنے ملک واپس جانے لگا تو ان کے کام سے خوش ہو کر بولا..... ”میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں“

اسد اقبال نے بہت سوچا اور جواب دیا۔ ”امریکا بھجوا دیں۔“

سفیر بولا۔ ”یہ میزے بس میں نہیں، برطانیہ کا ویزا لگوا سکتا ہوں۔“

اسد اقبال کو امریکا یا برطانیہ سے کیا فرق ہوتا۔ انہوں نے تو یوں ہی ایک ملک کا نام لے لیا تھا۔ فوراً پاسپورٹ بنوا گیا۔ ٹکٹ کی رقم کا بندوبست بھی کیا۔ جس پرواز سے سفیر جا رہا تھا، اس میں کوئی سیٹ خالی نہیں تھی۔ اسد کا نام ویننگ لسٹ میں تھا۔ سفیر ایئر پورٹ پہنچا، یہ بھی گئے۔ کاؤنٹر پر جو شخص بورڈنگ کارڈ دے رہا تھا اس سے سفارش بھی کرائی لیکن اس دن مسافر زیادہ تھے۔ کوئی امید نہیں تھی اس لیے مایوس ہو کر خدا کو یاد کرنے لگے.....

سفیر نے بورڈنگ کارڈ لیا اور ایک رعایت یہ دی کہ خود ویننگ لاؤنچ میں بیٹھ گیا۔ اگر اسد کو بورڈنگ کارڈ مل جائے تو ساتھ لے جائے ورنہ قسمت.....

مسافر جہاز کی طرف جاتے رہے پھر اچانک کاؤنٹر پر جھگڑا ہونے لگا..... ایک صاحب آم کی پٹی لندن لے جانا چاہتے تھے، لیکن وزن زیادہ تھا، کاؤنٹر والا اضافی رقم مانگ رہا تھا اور یہ صاحب جھگڑا کر رہے تھے۔ معاملہ کسی طرح سمجھ نہیں رہا تھا۔ آس پاس کے لوگ بھی جمع ہو گئے۔ کاؤنٹر والے نے ابھی ان صاحب کو بورڈنگ کارڈ نہیں دیا تھا۔ جہاز کی روانگی میں بہت کم وقت رہ گیا۔ کاؤنٹر والے نے پریشان بے چین اسد کو اشارہ کیا۔ یہ لپک کر گئے۔ اس نے کہا۔ ”اپنا ٹکٹ دو.....“







نے خوشی کے اظہار اور سالگرہ کی خوشی میں وہ کیا جو بے آپے ملکوں میں ہوتا ہے۔

نصر ملک نے اس واقعے کی اطلاع دی تو 91 منتخب حسنائیں اپنا لباس لے کر گلی کوچوں میں روپوش ہو گئیں۔ اس تاخیر کی وجہ ہماری بھلائی کے سوا کچھ نہ تھا۔ ایک تو ہم اس قسم کی بے ہودگی دیکھنے کے عادی نہیں۔ دوران سفر زیادہ احتیاط کرتے ہیں۔

ویسے بھی عزت کے علاوہ صحت عزیز ہے۔ پردیس میں دل کی دھڑکن بڑھ جائے تو کون سیجا ہوگا۔

کو پیننگ میں ہماری موجودگی میں جو واقعات ہوئے اس کی ذمہ داری نصر ملک کی ہے۔ اُمید ہے وہ یہ اپنے سر لے چکے ہوں گے۔ ہم جہاں جاتے ہیں وہاں کی معاشی اور اخلاقی قدریں سدھارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کردار درست کرنے کے اشارے کرتے ہیں۔ آنکھوں سے گھورتے ہیں۔ اگر وہ بدلتا نہ چاہیں تو کیا ہو سکتا ہے۔

کو پیننگ والے برہا برس سے اپنی روایات پر قائم ہیں۔ اس میں کچھ حصہ نصر ملک کا بھی ہے۔ وہ ریڈیو پر لوگوں کو کیا پٹی پڑھاتے ہیں کہ جیسے ہیں ویسے ہی رہتے ہیں۔

اس تحریر کے ذریعے ہم اپنے آپ کو بری الذمہ قرار دیتے ہیں۔

مسجد حق برحق

گاڑی ایک بڑی بلڈنگ کے گیٹ میں داخل ہو کر سیدھے ہاتھ پر رک گئی۔ دوسری جانب دومنزلہ عمارت دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ گاڑی سے اتر کر بیٹھنے والے دروازہ کھولا۔ اندر داخل ہوئے۔ یہاں بڑی بڑی مینشیں لگی تھیں۔ برابر میں ہال تھا۔ وہ بھی مینشوں سے بھرا تھا۔ اس کے بعد ایک اور کمرہ۔

بیٹھ سمجھا رہے تھے۔ یہ ان کی نئی واشنگ میشری

مکمل خود کار کپڑے دھونے سکھانے اور استری کے بعد پیننگ کی سہولت کے ساتھ یہ کو پیننگ کا ایک بڑا پلانٹ ہوگا۔ ایک سال سے زیر تعمیر ہے۔ ابھی بہت کام باقی ہے۔ ہم مینشوں کو دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔

کسی پاکستانی اور مسلمان کے لیے اس کا مالک ہونا اعزاز ہے۔ ہم نے بیٹھ کو مبارکباد دی۔ اللہ اس میں برکت دے۔

واشنگ پلانٹ سے نکل کر سامنے عمارت میں داخل ہوئے۔ چند سیڑھیاں نیچے جاتی ہیں۔ یہاں اسٹور ہے۔ دنیا بھر کی اشیاء فروخت ہوتی ہیں۔ سب حلال اور جائز۔ یہاں تک کہ پیڑ بھی حلال دستیاب ہے۔ ڈنمارک دودھ مکھن پنیر کے لیے مشہور ہے۔ انواع و اقسام ذائقے اور لذت کے لیے۔

ہم کو پیننگ سے واپس آنے لگے تو جی چاہا سوغات میں ڈنمارک کا پیڑ بھی ساتھ لے جائیں۔

بیٹھ سے ذکر کر دیا۔ انہوں نے روائی سے ایک دن پہلے اسی اسٹور سے حلال پیڑ لا کر دیا۔

اور لطف کی بات ہے کہ وہ ذائقے اور لذت میں اعلیٰ تھا۔ ہم افسوس کرنے لگے اگر اس کے معیار کا علم ہوتا۔

دوران قیام یہی استعمال کرتے۔ احباب کے کہنے سے پچھوند لگا، کیڑے پڑا چکھنے سے باز رہتے۔ اپنی تسلی کے لیے دل کو ڈھارس دی۔ بیٹھ نے جو پیڑ لا کر دیا ہے وہ اسپورٹ کوالٹی ہے۔ ملک سے باہر جانے والے مسافروں کو دیا جاتا ہے۔

مقامی حضرات اس نعمت سے محروم ہیں۔

ہمارا مشورہ ہے کو پیننگ جانا ہو تو بیٹھ سے کہہ کر یہ پیڑ ضرور حاصل کریں۔ اسٹور میں ہندوستان

پاکستان کی ہر سوغات ملتی ہے۔ راولپنڈی کے پاپے لاہور کی باقر خانیاں، کراچی کے شیر مال اور تازہ

سبزیاں یہاں تک کہ لیلیٰ کی انگلیوں کی طرح تلی

کلڑیاں۔ ہمارے علاقے میں سبزی والا آتا۔ کلڑیاں کو لیلیٰ کی انگلیوں کی آواز لگاتا، ہم مجنوں کے ذوق پر افسوس کرتے کہ ایسی لڑکی پسند کی جس کی کوئی انگلی دوسری سے موٹائی میں نہیں ملتی ہوگی۔

جو لوگ نماز پڑھنے آتے ہیں۔

پورے ہفتے کی شاپنگ کر لیتے ہیں۔ سلام دعا ہو جاتی ہے۔ یہ ایک طرح ملاقات کا بہانہ بھی ہے۔

لوگ اپنی پسند کی چیزوں کا آرڈر دے جاتے ہیں۔ اسی فلور پر ٹریول ایجنسی کا دفتر ہے۔ جی چاہے تو اسٹور سے تازہ سبزیاں خریدنے کے بجائے خود

پاکستان جا کر کھالیں یا گھر لے آئیں۔

ٹریول ایجنسی کے برابر ریسٹورنٹ ہے۔ ایک بڑا باورچی خانہ ہے جس میں سالگرہ شادی اور

دوسری تقریبات کے لیے مزے دار کھانا پکایا جاتا ہے۔ مزے دار اس لیے کہ ایک دن اس باورچی خانے کا گاجر کا حلوہ کھانے کا موقع ملا۔ لاہور کے

بیٹھ سویت ہاؤس اور زورال سویت مارٹ کا مزہ آیا۔

اچھی بات یہ ہے کہ کھانے پر واجبی منافع لیا جاتا ہے اس لیے بازار سے بہت سستا اور اپنا جانا پہچانا ذائقہ۔

اوپر کی منزل میں دو بڑے ہال۔ سیدھے ہاتھ کا ہال مسجد ہے جہاں نماز پڑھائی جاتی ہے۔ اس میں

سات سو سے زیادہ نمازی ایک وقت اپنے آپ کے منور مجتہد کر سکتے ہیں۔ اس میں اتنے خوبصورت اور موٹے قالین بچھے ہیں کہ سجدہ کرتے وقت

احساس ہوتا ہے سر نرم برف پر رکھ دیا۔ بادلوں پر سوار ہو گئے۔ ان کے رنگ بھی دیدہ زیب ہیں۔ ہمیں

چٹائی پر نماز پڑھنے میں دقت ہوتی ہے۔ نیو یارک میں کی بار اخبار کے کاغذ بچھا کر نماز پڑھی تو گھٹنے اور

پاؤں دونوں کو تکلیف ہوئی۔ موٹے قالین پر نماز کرنے کا اپنا لطف ہے۔ مسجد کے ہال کے برابر

کمرے بنے ہیں جہاں عورتوں اور بچوں کو تعلیم دی جاتی ہے۔ درس قرآن پاک حفظ قرآن مجید اور اردو پڑھائی جاتی ہے۔ اسکول روزانہ کھلتا ہے۔ صبح

دوپہر شام۔ جس وقت جس کو سہولت ہو۔ ہم پہنچے تو 80 طالب علم درس قرآن میں مصروف تھے اور یہ

منصوبہ بنایا جا رہا ہے کہ مسجد کے احاطے میں ایک ہوٹل قائم کیا جائے تاکہ دوسرے علاقے اور ملکوں

سے طالب علم بھی آ سکیں۔ اس مدرسے میں اتنی کم فیس لی جاتی ہے کہ یقین نہیں آیا۔ بچوں کو گاڑی کے

ذریعے گھروں سے بلایا اور واپس بھیجا جاتا ہے۔ اس مسجد سے قرآن حفظ کرنے والے بچوں کی تعداد

بڑھتی جا رہی ہے۔

مسجد کے نزدیک ایک ”معذوروں کا گھر“ ہے وہ لوگ اکثر پولیس سے طالب علموں کی شکایت کرتے رہتے ہیں۔

نہ مسجد یہاں سے بٹے گی اور نہ معذوروں کا گھر اس لیے جھگڑا جاری رہے گا۔ مسجد کے سامنے ایک

بڑا ہال ہے جس میں ہر سال ختم نبوت کانفرنس ہوتی ہے۔ ایک ہزار آدمی شریک ہوتے ہیں۔ مسلمانوں

کے مذہبی اجتماع کے لیے یہ شاندار جگہ ہے۔

یہ مسجد حق کہلاتی ہے اور اسے ڈی بیٹ کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ انہوں نے لاہور میں اپنی

جائیداد کو فروز روپے میں فروخت کی اور اس بلڈنگ اور جگہ کے لیے ضروری ادائیگی کی۔ اب قطبیں جاتی

ہیں اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ چندہ ان لوگوں سے لیا جاتا ہے جو رزق حلال کما تے ہیں۔ یہ 4 ہزار

میٹر جگہ پر بنی مسجد حق ہے اور اسے ڈی بیٹ کا نیک کام۔ یہ ڈنمارک کی پہلی مسجد ہے جو مسجد کے نام پر

رجسٹر ہوئی ہے ورنہ دوسری مساجد اسلامک سینٹر ہیں۔ مسجد حق کے بارے میں بیٹھ کے جو منصوبے

ہیں ہم ان کے لیے دعا گو ہیں۔ اللہ تعالیٰ فلاح و



بہبود کے کاموں میں خود ہاتھ بٹاتا ہے اور انسان اسی سے مانگتا ہے۔

ٹی وے کی اپنا لطف

سڑک پار کر کے ظہور احمد اور اسد اقبال کے ساتھ ٹاؤن ہال کی طرف بڑھے یہ بلند عمارت برسوں سے موسموں کا احتساب برداشت کر رہی ہے۔ کئی بار اس میں آگ لگی اور دوبارہ تعمیر ہوئی اس لیے درو دیوار میں نیاز مانہ بھی شامل ہوتا گیا۔ ڈینش اور اطالوی طرز تعمیر کا یہ اعلیٰ نمونہ ہے۔ جس طرح نئی گاڑی زیر میٹر ہوتی ہے ٹاؤن ہال زیر میٹر ہے۔ کوپن ہیگن کی مسافت فاصلے دوریاں یہاں سے ناپی جاتی ہیں۔

ٹاؤن ہال کو میونسپلٹی سمجھ لیں۔ اس کا انتظام سٹی حکومت چلاتی ہے۔ اس میں 55 کونسلر منتخب ہوتے ہیں۔ سربراہ میئر کہلاتا ہے۔ اس کونسل کے پاس بلدیہ اور ضلع میں تعمیراتی رفاہی کام کا اختیار ہے۔ بچوں کی دیکھ بھال کے منصوبے بنانا ان پر عمل کرنا۔ اسکول کالج بہتر بنانا۔ بوڑھے افراد کے اداروں کی بہبود، شہر کی صفائی، سڑکوں پارکوں کی تعمیر، غرض سارے شہر کا انتظام سٹی کونسل کے پاس ہوتا ہے۔

چوہدری ولایت علی خان بارہ سال سے کونسلر ہیں۔ اس سے پہلے ایک خاتون لیٹی الیٹی منتخب ہوئی تھیں۔ ملک کی اصل طاقت پارلیمنٹ کے پاس ہوتی ہے۔ ملک میں 17 سیاسی پارٹیاں ہیں۔ اس سے زیادہ بھی ہوتیں تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ ڈینش لوگوں کا ملک ہے جو چاہیں جیسا چاہیں کریں۔

ٹاؤن ہال کی پانچ سڑھیوں کے بعد کوری ڈور ہے۔ اُلے ہاتھ پر دھرتے، کاؤنٹر جو محض یہاں بیٹھا تھا اسے صرف ڈینش آئی تھی تاکہ سیاہوں کے اُلے سیدھے سوالوں کا جواب نہ دے سکے ورنہ سارا وقت

اسی میں صرف ہو جائے۔ فلاح و بہبود کے کام کیسے کرے گا..... ایک طرف بہت سے پمفلٹ رکھے تھے۔ اکثر مقامی زبان میں۔ ایک انگریزی میں تھا جس میں درج تھا۔ اس ہفتے شہر میں کیا ہو رہا ہے۔ کہاں ناچ، کس جگہ کھانا اور کون گارہا ہے۔ تفریح کے لیے ٹرین، بس اور دریائی کشتیوں کے اوقات کار تحریر تھے۔ ہماری آمد استقبال اور روز و شب کا کوئی ذکر نہ تھا لہذا پمفلٹ کو اسی جگہ سجایا، کسی اور کے کام آئے گا۔

کوپن ہیگن میں وہ سب کچھ ہے جو سیاہوں کو اپنی طرف متوجہ کر سکتا ہے۔

اس دروازے کے داخلی حصے پر ایک ورلڈ کلاک لگا ہے۔ یہ جیمین اولین کہلاتا ہے۔ دنیا کے ہر ملک کا وقت دکھاتا ہے۔ ہم نے افغانستان اور عراق کا وقت دیکھنا چاہا۔ وہاں برا وقت ہوا تھا اس لیے آگے بڑھ آئے اچھے وقت کی تلاش میں

کاری ڈور کا دروازہ کھول کر اندر گئے۔ یہاں بہت بڑا ہال ہے جس کا فرش لکڑی کا بنا ہے۔ یہ وہی جگہ ہے جہاں ڈنمارک آنے والے مسلمانوں نے پہلا سجدہ کیا تھا۔

یہ ہال مختلف تقریبات کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ سیاح دیکھ کر متاثر ہوتے ہیں۔ ہم بھی مرعوب ہوئے۔

ٹاؤن ہال کے برابر سٹی اسکوائر ہے۔ یہاں ہر موسم میں کچھ نہ کچھ ہوتا رہتا ہے۔ ناچ، کھانا، کھانا چھوٹی دکانیں جہاں گھر لے جانے کے لیے کوپن ہیگن کی نشانیاں ہیں۔ یہ سیاہوں کا پکا ڈی سڑک ہے اور یاتریوں کا روم۔

اس میں وہ مشہور زلمینہ گلی ہے جسے ڈانگ اسٹریٹ کہتے ہیں جو 2 کلومیٹر لمبی اور 40 فٹ چوڑی ہے۔ یہ معلومات اس لیے دی ہیں کہ اگر آدی چوڑا

ہو کر چلنا چاہیے تو حد معلوم ہونی چاہیے۔ اس جگہ ہر قسم کی سواری ممنوع ہے، یہاں تک کہ سائیکل بھی۔ یہ سب کی بات ہے۔ ڈینش کا تصور سائیکل کے بغیر اسوارہ ہے۔ ہم نے اس پابندی کو پسند نہیں کیا۔ خاموش اس لیے رہے کہ مسافر ہیں، کل چلے جائیں گے۔ ہماری بلا سے وہ دو پاؤں پر چلیں یا گھٹنوں کے بل۔

ٹاؤن ہال کے سامنے مشہور تفریحی پارک ٹی وی ہے۔ ڈیڑھ سو سال پہلے ڈنمارک کے بادشاہ جارج نے بنوایا تھا تاکہ عوام خوش رہ سکیں۔ بادشاہ کتنے اچھے ہوتے ہیں، عوام کو خوش رکھنے کے لیے محل، قلعے پارک باغ اور نہریں بنواتے ہیں۔ وقت کے ساتھ اس پارک میں بھی تبدیلی ہوئی۔ داخلے کا دروازہ ایک تھیٹر اور جمیل پرانی ہیں باقی سب نیا۔

ظہور احمد نے ٹکٹ خریدے حالانکہ ہم آگے بڑھے تھے لیکن ڈنمارک کے لوگ اچھے ہیں۔ مہمان نوازی میں مثال نہیں رکھتے اس لیے کراؤن ظہور کے خرچ ہوئے۔ ٹکٹ 60 کراؤن کا ہے۔ تفریحی سہولتوں کے حساب سے زیادہ نہیں۔

ٹی وی ڈنمارک کا سماجی ثقافتی میلہ ہے جہاں رقص، موسیقی، تھیٹر اور قسم قسم کے کھانوں کی بہتات ہے۔ عورتوں، بچوں اور بڑوں سب کی دلچسپی کا سامان موجود ہے۔ پھولوں سے بھرے راستے، جگہ جگہ پانی اڑاتے نوارے، موسیقی کا شور زندگی ہر طرف پوری توانائی سے پھیلی نظر آتی ہے۔

دراز قد، خوبصورت وردیاں پہنے کم عمر نوجوان بیڑے بجاتے ایک سمت سے آئے اور دوسری طرف چلے گئے۔ بچے تالیاں بجانے لگے۔ سیاح دیکھنے لگ گئے۔

اس پارک میں چائینز عمارتیں اصل طرز تعمیر

کے ساتھ یوں نظر آتی ہیں جیسے چین پہنچ گئے ہوں ایک خوبصورت چائینز ریستورنٹ میں گئے تو بیٹھنے کی جگہ نہ تھی۔ یہاں میزیں ہتھوں پہلے ایڈوائس بک کرائی جاتی ہیں۔ ہم نے ظہور سے کہا۔

”ہمارے کوپن ہیگن کے اگلے دورے کے لیے ابھی سے بکنگ کراؤ۔“ ظہور آگے بڑھا تو اسد اقبال نے روکا۔

”لائن میں چھ ماہ لگ جائیں گے، نوں سے بک کرالیں گے۔“ ایک تھیٹر اپن ایئر تھا۔ لوگ کرسیوں پر بیٹھے بعض کھڑے اسٹیج پر کرداروں کو مکالمے بولتے اور ان کی ادائیگی پر تالیاں بجا رہے تھے۔ ایک سمت سرکس کا خیمہ لگا تھا۔ اس طرف بچے زیادہ تھے۔ اس کے آگے اسٹیج پر نوجوان لڑکے لڑکیاں ناچ رہے تھے۔ ایک گٹار بجا رہا تھا۔ ٹی وی کے بارے میں مشہور ہے۔ یہاں رقص، موسیقی، تفریح اور رومانس ہے۔ یہ سچ ہے۔ ہم گواہ ہیں چشم دید۔

ٹی وی میں رات 12 بجے آتش بازی ہوتی ہے۔ آسمان پر شوش رنگوں کے پھول کھلائے جاتے ہیں۔ یہ تفریح کا لطف، چمکتے سورج کی وجہ سے ہے۔ ذرا ہوانے اپنے کاندھے پر سفید برف سواری تو یہ محفل ویران ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹر اقبال۔ بادب باوق سبز گھاس کے لان پر سفید گارڈن چیز ز رکھی تھیں۔ درمیان میں میز پر انواع و اقسام کے پھل، کولڈ ڈرنک، ٹکٹ اور صاحب خانہ خورشید زیدی بیٹھے تھے۔

ڈاکٹر محمد اقبال ان کے گھر لے گئے تھے۔ (اس سفر نامے کا آخری حصہ آئندہ ملاحظہ کریں۔)

☆☆☆



## دلی سے دلدار بننے تک

عمر خطاب خان

بچپن میں وہ اپنی ماں اور چھوٹی بہن سے دکھ شیر کرتا تھا اس نے  
کبھی اپنی ماں سے کچھ نہیں چھپایا وہ ہر بات انہیں بتا دیا کرتا تھا۔ ماں  
کی موت کا صدمہ اس کی زندگی کا سب سے گہرا زخم تھا.....

## دلی دوڑ کے سہرا دادا کی دردناک زندگی



یہ کہانی بولی دوڑ کے ایک ابھرتے ہوئے  
Legend کی داستان حیات ہے۔ اس کے  
کرداروں میں شاہ رخ کے لاکھوں مداح بھی ہیں۔  
شاہ رخ کے والد میر تاج محمد اور والدہ لطیفہ فاطمہ  
بھی ہیں جن کی تربیت سے ہی اس نے اپنی زندگی  
کی راہیں متعین کیں۔ وہ لوگ بھی اس کتھا سے  
جڑے ہوئے ہیں جو شاہ رخ کے بچپن سے لے کر  
جوانی تک مختلف ادوار میں اس کی زندگی میں آتے  
جاتے رہے۔ اُن مہمان کرداروں میں جیا پوئی  
تروکن سنگھ، انکل ارون اور کچھ دوسرے لوگ نمایاں  
ہیں لیکن کچھ ایسے بھی ہیں جو اس کی ذات سے ہمیشہ  
کے لیے جڑے ہیں اور وہ کردار گوری آریان اور  
سوبا ناہیں۔ ذرا اٹھہریئے خود اپنی کہانی میں شاہ رخ کا  
کیا کردار ہے یہ جاننے کے لیے ہمیں اُس دور میں  
جاننا ہو گا جب شاہ رخ اور اُس کی ٹیلی دہلی میں گمنامی  
کی زندگی بسر کر رہے تھے۔

شاہ رخ کے والد بہت خوبصورت نوجوان  
تھے۔ اُن کی آنکھیں بڑی غضب ناک تھیں۔ نیورا  
جندہ نگر میں اُن کی رہائش تھی۔ وہ انگریزوں کے  
خلاف تحریک کے سرگرم رکن رہے تھے لیکن ہندو اور  
مسلمانوں کے بؤارے کے خلاف تھے۔ وہ لوگ  
پشاور کے رہنے والے تھے۔ جب تقسیم ہوئی تو انڈیا  
چلے آئے اور نیورا جندہ میں ہی اُن کی شادی  
ہوئی۔ میر تاج محمد اُن کا نام تھا۔ بے حد سنجیدہ شخصیت  
کے مالک تھے۔ رعب و دبدبے سے بھی پشیمان لگتے  
تھے۔ اُن کی ٹیلی آنکھوں میں لوگ ڈوب جاتے  
تھے۔ شاہ رخ کی ماں بہت بردبار اور حوصلہ مند  
خاتون تھیں۔ مگر گریہ سستی خوب جانتی تھیں۔ دونوں  
مایاں بیوی میں بہت پیار تھا وہ ایک دوسرے پر  
جان نچھاور کرنے والے تھے۔  
شاہ رخ کے والد بہت زیادہ محب وطن تھے۔

سیاست سے بڑا گہرا تعلق تھا۔ اُن کے گھر میں سیاسی  
رہنماؤں کی بڑی بڑی تصویروں سے گمان ہوتا تھا  
جیسے اس گھر میں کوئی لیڈر رہتا ہے لیکن وہ خود  
سیاست میں آنے کے حق میں نہیں تھے۔ علاقے  
میں اُن کا اچھا خاصا سماجی حلقہ تھا اور وہ لوگوں کے  
کام آ کر خوشی محسوس کرتے تھے۔ ان کا کردار اچھا  
خاصا پھیلا ہوا تھا اور کئی جگہ اُن کا رویا لگا تھا لیکن  
اپنے بیوی بچوں اور گھر کو بھر پور وقت دیتے تھے۔ وہ  
کھرے کاروباری مشہور تھے۔ شاہ رخ اُس وقت  
پیدا نہیں ہوا تھا۔ شادی کے کئی سال بعد تک بھی  
میر تاج کے یہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی اور انہیں  
اس بات کا بڑا رنج تھا۔ وہ بچوں سے بہت پیار  
کرتے تھے اور اسی لیے انہوں نے ایک ہندو بچی کو  
گود لے رکھا تھا جو اُن کے گھر میں پٹی بڑھی۔

تقدیر کے کھیل بھی نرالے ہیں کہ میر تاج کے گھر  
شادی کے سات سال بعد شاہ رخ پیدا ہوا اور دو سال  
بعد اُن کے یہاں ایک بچی کی پیدائش ہوئی جس کا  
نام شہناز رکھا گیا۔ دونوں بہن بھائی بلا کے شرارتی  
اور ذہین تھے۔ دونوں کی معصوم شرارتوں سے پورا محلہ  
پریشان رہتا تھا لیکن وہ سب کے لاڈلے بھی  
تھے۔ میر تاج کے گھر کی چمٹ کے نیچے تینوں بچے  
پلے بڑھے اور کوئی نہیں جان سکا کہ شاہ رخ کی ایک  
ہندو لے پالک۔ بہن بھی تھی۔ شاہ رخ اپنی اس بہن کو  
بے حد احترام دیتا تھا اور اسے دیدی کہہ کر  
رکارتا۔ بعض اوقات تو وہ اپنی منہ بولی بہن کے لیے  
سکی شہناز کو بھی ناراض کر دیتا تھا۔ میر تاج کے گھر میں  
اس بچی پر کوئی مذہبی پابندی نہیں تھی۔ وہ کئی سال تک  
محلے کی عورتوں کے ساتھ مندر جاتی رہی لیکن ساتھ ہی  
گھر میں روزے نماز کی بھی پابندی تھی اور ہر وقت سر  
پر دوشیا اوڑھے رہتی تھی۔ میر تاج اور اُن کی بیگم نے  
بچوں پر کبھی کوئی زبردستی نہیں کی۔ گھر کے ماحول اور



محترم قارئین! ”مسئلہ یہ ہے“ کا سلسلہ خلقِ خدا کی بھلائی اور روحانی معاملات میں اُن کی رہنمائی کے جذبے کے تحت ماہنامہ ”بچی کہانیاں“ کے اڈیٹنگ شمارے سے شامل اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ بلائف اور دُعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نہ صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی روحانی طاقت کے حیران کر دینے والے معجزے دیکھے۔ جیسے جیسے لوگوں کو ان وظائف سے فائدہ ہوتا رہا، اُسی تناسب سے ہر ماہ موصول ہونے والے خطوط کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا پھر صورتِ حال یہ ہو گئی ہے کہ اگر ماہنامہ ”بچی کہانیاں“ میں خطوط کے جوابات دینے پر اکتفا کیا جاتا تو قارئین کو اپنے جوابات کے لیے کئی کئی ماہ انتظار کرنا پڑتا کیوں کہ پرچے میں صفحات کی تعداد بہر حال محدود ہے۔ ان ہی حقائق کو دیکھتے ہوئے فوری نوعیت کے مسائل کے جوابات بدراہ راست ارسال کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا لیکن اتنے زیادہ خطوط کو سنبھالنا، اُن کا ریکارڈ مرتب کرنا اور انہیں سپروڈاک کرنا خاصا دُقت طلب کام ہے جو مجھ ایسے آدمی کے لیے کسی طور ممکن نہیں۔ ان صفحات کی ترتیب و تدوین اور بدراہ راست جوابات کے لیے میرا معاوضہ پاکستان کی سلامتی، قومی یکجہتی کی دُعا اور مسلمان مسلمات (خواہ وہ زندہ ہوں یا مُردہ) کے لیے دُعا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دُعا کے خیر سے بڑا معاوضہ اور قیمتی تحفہ کوئی کسی کو کیا دے سکتا ہے؟ قارئین کے خطوط کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیش نظر ادارے کو باقاعدہ اسٹاف رکھنا پڑا ہے جو خطوط کا ریکارڈ مرتب کرنے اور انہیں سپروڈاک کرنے کا ذمہ دار ہے۔ اگر آپ اپنے مسئلے کا فوری جواب چاہتے ہیں تو ازراہ کرم جوابی لفافے کے ساتھ =/300 روپے کا منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ ماہنامہ ”بچی کہانیاں“ کے نام ارسال کر دیں۔ یہ رقم اُن افراد کی تنخواہ کی مد میں آپ کی امداد ہوگی جو اس شعبے سے متعلق ہیں۔ منی آرڈر کی رسید اور ڈرافٹ بھیجنے کے علاوہ خط میں منی آرڈر کی رسید اور بینک ڈرافٹ نمبر ضرور تحریر کریں۔ صاحب استطاعت حضرات ٹوکن منی =/300 روپے کو آخری حد نہ سمجھیں وہ حسب استطاعت اس رقم میں اضافہ کر سکتے ہیں۔ یہ رقم اُن خواتین کے کام آئے گی جو ملک کے دور دراز گوشوں میں رہتی ہیں اور جن کے لیے منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ بھیجنا نامکن نہیں ہے۔ خطوط بھیجنے سے پہلے درج ذیل باتوں کا خیال رکھیں۔

- (1)..... مسئلے کے ساتھ اپنا اور اپنی والدہ کا نام ضرور تحریر کریں۔ اصل نام کی اشاعت مقصود نہ ہو تو خط فرضی نام سے شائع کیا جائے گا۔ فرضی ناموں سے جھوٹے خطوط نہ بھیجیں ورنہ فائدے کی بجائے نقصان کا احتمال ہے۔
- (2)..... منی آرڈر بینک ڈرافٹ ماہنامہ ”بچی کہانیاں“ کے نام ارسال کریں۔
- (3)..... اپنا مسئلہ صاف اور واضح الفاظ میں کاغذ کے ایک طرف تحریر کریں۔

ماہنامہ ”بچی کہانیاں“ 110 ”آدم آرکیڈ“ شہید ملت روڈ۔ کراچی۔

پٹھان دوست تھے۔ پشاور میں انگریزوں کے خلاف مزاحمتی تحریک میں اُن دوستوں نے خاصا اہم کردار ادا کیا۔ ترکوں کو سگھ مجاہد تھا جو دیگر ہندو مسلمانوں کی طرح انگریزوں کے خلاف ”ہندوستان جھوڑو تحریک“ (Hindu Movement) کا سرگرم رکن تھا۔ اُن لوگوں نے گولیاں چلائیں بھی اور کھائیں بھی۔ یونس خان دیگر ساتھیوں کے مقابلے میں بہادر اور عتر تھا، اس نے تحریکِ آزادی میں انگریزوں کو ناکوں چنے چبوا دیے۔ میر تاج محمد (شاہ رخ کے والد) اور چچا غلام محمد گاما بھی اس تحریک میں شامل تھے۔ یونس تو جنوبی ایشیاء کے سبھی لوگوں میں آزادی کی تحریک بیدار تھی لیکن یہ لوگ مسلح مجاہد تھے جو انگریزوں کو مطلوب تھے۔ صوبہ سرحد میں خان عبدالغفار خان کی قیادت میں یہ تحریک چل رہی تھی جنہیں ”سرحدی گاندھی“ کا خطاب دیا گیا تھا۔ 1942ء میں جب یہ تحریک زوروں پر تھی تو یونس خان اور ان کے ساتھی نہرو گاندھی اور خان غفار کے مسلسل رابطے میں تھے۔ جنوبی ایشیاء کے لوگوں کی قربانیوں کے نتیجے میں جب انگریزوں نے یہاں سے چلے جانے کا اعلان کیا تو سب اپنی کامیابی پر بہت خوش تھے لیکن تقسیم کے فیصلے نے اُن لوگوں کو دھمی کر دیا تھا۔ شاہ رخ کے والد انگل اور یونس خان نے اس فیصلے پر افسردگی کا اظہار کیا اور تقسیم کے بعد 1947ء میں سب انڈیا چلے گئے۔ شاہ رخ کے انگل غلام محمد گاما کو جیل میں ڈال دیا گیا۔ میر تاج محمد اور یونس خان دو قومی نظریے کے حق میں نہیں تھے۔ وہ عبدالغفار خان کے سیاسی اور نظریاتی حامی تھے لہذا وہ انڈیا چلے گئے۔ میر تاج محمد نے انڈیا میں نیورا جند رہ گئے۔ رہائش اختیار کی اور ایک حیدر آبادی لڑکی سے شادی کر لی جس سے اُن کی دو اولادیں شاہ رخ خان اور شہناز پیدا ہوئیں۔ شاہ رخ کے والد بہ حد وجہ اور چارمگ تھے۔ جب وہ پبلک میٹنگز سے خطاب کرتے

ترتیب کا اثر تھا کہ شاہ رخ نے بھی انسانیت کو اپنا شعار سمجھا۔ اس نے گوری سے شادی کر کے ثابت کر دیا کہ مذہب کی دیوار دو پیار کرنے والے دلوں میں تفریق نہیں ڈال سکتی۔ کچھ عرصے بعد شاہ رخ اور اُس کی ٹیلی نیورا جندہ سے شفٹ ہو گئی۔

شاہ رخ کی ماں بڑی ذہین خاتون تھیں۔ اپنے شوہر کے انتقال کے بعد انہوں نے نا صرف اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلوائی بلکہ شوہر کے جتنے جمائے کاروباری ذمے داریوں کو بھی اپنے کاندھوں پر اٹھا لیا۔ شوہر کے انتقال کے وقت بچے بہت چھوٹے تھے۔ میر تاج نے کچھ کاروباری انویسٹ منٹ کر رکھی تھی جس سے گھر کا چولہا جل رہا تھا لیکن شاہ رخ کی ماں نے اس سے آگے بڑھ کر آئل کا بزنس بھی شروع کر دیا۔ پڑھی لکھی عورت تھیں، شوہر سے کچھ تجربہ ور تھے میں ملتا تھا، جلد ہی اُن کا کاروبار سنبھل گیا۔ سماجی کاموں کا بھی شوق تھا لہذا اپنے شوہر کے نقش قدم پر چلتے ہوئے لوگوں کے کام آنا اُن کا شیوہ بن گیا۔ اپنی دھیر ساری ذمے داریوں کا بوجھ اپنے کاندھوں پر اٹھانے کے بعد وہ اپنی صحت کی طرف سے غافل رہنے لگیں، اس وجہ سے انہیں بیماری نے آلیا اور وہ بستر مرگ پر جا پڑیں۔ شہناز اور شاہ رخ اتنے بڑے نہیں ہوئے تھے کہ اپنا بوجھ اٹھا سکتے لیکن شاہ رخ نے کم عمری میں والدہ کی وفات کے صدمے کو بہادری سے سہا اور حالات کا مقابلہ کیا۔

شاہ رخ کی زندگی سے جو ایک اہم کردار ترکوں سگھ بھی ہے جو شاہ رخ فیملی کے بہت قریب رہا ہے۔ ترکوں سگھ جبکہ آزادی کا ایک مجاہد تھا جو شاہ رخ کے والد کے ساتھ اس جدوجہد میں شامل رہا۔ وہ اپنی یادداشتوں میں ذکر کرتا ہے کہ ترکوں سگھ میر تاج محمد یونس خان اور غلام محمد گاما چاروں N.W.F.P. (موجودہ صوبہ خیبر پختون خواہ) سے تعلق رکھنے والے





## ماہ رمضان المبارک

عزیزو.....!

رمضان المبارک کی آمد قرآن کریم کے نزول کی یاد دلاتی ہے جس سے تاریخ عالم متبدل ہوئی یوں کشور انسانیت اپنی تعمیر و ترقی کی معراج کو پہنچی۔ روزہ اسلام کا تیسرا اہم رکن ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ جو انسان اپنی بھوک اور پیاس پر قابو پاسکتا ہے وہ اپنے ہر عمل پر قابو پاسکتا ہے۔ رمضان المبارک عبادت کا ماہ ہے۔ وہ لوگ خوش نصیب ہیں جو صحت و سلامتی کے ساتھ اس ماہ کو پائیں گے۔ اس بابرکت ماہ میں اپنے تمام بچوں اور بچیوں کو اپنی دعاؤں میں یاد رکھوں گا خصوصاً انہیں جو شہر کراچی کے باہر سے خطوط لکھا کرتے ہیں اور ملک کے حالات کے سبب بالکل رابطہ میں نہیں ہیں۔ اللہ سب کو اپنی امان میں رکھے اور ہمارے وطن کو سلامت رکھے کیونکہ اسی میں ہم سب کی بقا و سلامتی ہے۔

رمضان المبارک میں جس قدر عبادت کی جائے اتنا ہی ثواب ہے۔ سورۃ البقرۃ، سورۃ یٰسین، سورۃ رحمن، سورۃ مزمل، سورۃ واقعہ اور الحمد شریف کا پڑھنا اور بہت پڑھنا نہایت مبارک ہے۔ اس ماہ مقدس کی بالخصوص طاق راتوں (۲۱، ۲۳، ۲۵ اور ۲۷ ویں شب) کو نفلی عبادت کرنا بہت افضل ہے کہ ان ہی راتوں میں سے ایک رات ”شب قدر“ ہے جو انتہائی خوش بخت لوگوں کا مقدر ہوتی ہے۔ یوں بھی رمضان المبارک کا آخری عشرہ ”مغفرت“ کا عشرہ ہے۔ اس عشرے اور بالخصوص اس کی طاق راتوں میں انتہائی خضوع و خشوع سے گزرنا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ سے اپنی اور تمام امت مسلمہ کی مغفرت کی دعا کرنی چاہیے۔ وہ غفور الرحیم بخشے والا مہربان ہے۔

اللہ ہم سب کو ایمان کی حالت میں دنیا سے اٹھائے۔ (آمین ثم آمین!)

○ محمد علی ایڈو۔ روہڑی۔

○ محترم باباجی! السلام علیکم! آپ نے بہت سے لوگوں کے مسائل حل کیے ہیں۔ میرا مسئلہ بھی حل کر دیجیے۔ میرے دو سوال ہیں جن کے جواب چاہئیں۔ مسئلہ نمبر 1۔ میں عرصہ سات سال سے سخت ترین مالی مشکلات کا شکار ہوں جس وقت سے میری نوکری یوٹیلٹی اسٹور پر شروع ہوئی ہے مجھے ہر دفعہ نقصان ہوتا ہے۔ ہر سال مجھے چالیس ہزار یا پچاس ہزار کا نقصان ہو جاتا ہے۔ باباجی! میں ملازمت عنقریب چھوڑنے والا ہوں۔ میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش ہے کہ میں ایف آئی اے پولیس میں نوکری کروں۔ باباجی! اب آپ مجھے کوئی بہت ہی موثر و مفید تحریر کیجیے کہ جس سے میں جلد از جلد ایف آئی اے پولیس میں نوکری کروں۔ میری یہ خواہش پوری ہو اور مجھے نوکری مل جائے۔ میرا دوسرا مسئلہ یادداشت اور ذہن کی بہتری کے لیے اور ترقی کے لیے آسان سا وظیفہ دیں جو میں آسانی سے کر سکوں۔ باباجی! مجھے آسان سا وظیفہ دیں جو میں عشاء کی نماز کے بعد کروں اور 20 دن یا 25 دن کا وظیفہ دیں۔ اللہ کے واسطے جواب سے ضرور نوازیں۔ میں آپ کو ساری عمر دعا دیتا ہوں گا۔ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ باباجی! میں بڑی امید سے خط لکھا ہے کہ میرے مسائل حل ہوں اور میری زندگی بن جائے۔ باباجی! مجھے سرشار نوکری مل جائے۔

☆ بیٹے علی! رزق میں برکت کے لیے بعد نماز صبح اور سورۃ واقعہ ترجمے کے ساتھ پڑھا کرو۔ حسب استطاعت صدقہ خیرات ضرور کرو۔ اللہ خیر کرے۔ مدت ایک ماہ ہے۔

○ عامر کراچی۔

☆ بیٹے عامر! تمہارا خط مجھ تک پہنچایا گیا، خط

پڑھ کر ایک بات تو واضح ہو گئی کہ تمہاری فیکٹری پر تنفلی عملیات کروائے گئے ہیں جو چیزیں بھی وہاں سے نکلی ہیں انہیں سمندر برد کر دو۔ چونکہ ارٹھری طور پر تبدیل کرلو۔ اس کے علاوہ ان ملازمین کی لسٹ ضرور تیار کر دو جو پہلے سے اس فیکٹری میں ملازمت کر رہے تھے اور اب تمہارے ساتھ بھی ہیں۔ مجھے نام ارسال کرو۔ جلد از جلد دو عدد تعویذ منگو کر فیکٹری میں رکھ دو۔ تفصیل کے لیے ”پچی کہانیاں“ کے دفتر فون کرو۔ میں فیکٹری کا حصار بھی باندھ دوں گا۔

○ ث۔ ج۔ لاہور۔

☆ بیٹی ث۔ ج! شوہر سے اس مسئلے پر بات کرنا چھوڑ دو۔ جس بات پر جھگڑا ہوا ہے اسے ترک کر دینا چاہیے حالانکہ تم جو جانتی ہو وہ جائز ہے۔ شوہر سے کہو کہ وہ تمہیں یہاں گھر الگ لے کر دے۔ تم اپنے والدین کے گھر رہنا نہیں چاہتیں مگر یہ بات بھی نرمی اور موقع محل دیکھ کر کرنا۔ نماز کی پابندی رکھو اور درود شریف بہت پڑھو۔ نماز فجر کے بعد ایک بار سورۃ رحمن ترجمہ کے ساتھ پڑھو۔ انشاء اللہ ضرور کرم ہوگا۔ مدت ایک ماہ ہے۔

○ ک۔ کاشف۔ بٹ گرام۔

○ محترم باباجی! السلام علیکم! خدا آپ کو خوش رکھے۔ باباجی! پچی کہانیاں بہت شوق سے پڑھتا ہوں لیکن آپ کا کالم دل کی گہرائیوں سے پڑھتا ہوں کیونکہ آپ کا جواب دینے کا انداز مجھے بہت پسند ہے۔ آپ اتنے سہل و ناطق خلق خدا کو دیتے ہیں کہ خدا کی مخلوق بھی سہولت کے ساتھ کر لیتی ہے۔ میں اپنے مسائل لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ امید ہے آپ مجھے مایوس نہیں کریں گے۔ باباجی! میرا پہلا مسئلہ یہ ہے کہ میں بہت شرمیلا ہوں، مجھ میں اعتماد نہیں ہے، لوگوں سے بچ کر



بات نہیں کر سکتا زبان گنگ ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے مجھے بعد میں اپنے آپ پر بہت غصہ آتا ہے لیکن پھر کچھ نہیں کر سکتا۔ لوگ مجھے مغرور سمجھتے ہیں حالانکہ ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ باباجی میں چاہتا ہوں کہ میں بھی دوسروں کی طرح سب سے کھل کر ہنس کر بات کر سکوں لیکن میری کمزوری میری خواہش پر غالب آ جاتی ہے۔ باباجی میرا دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ اسکول میں لڑکے لڑکیاں اور گاؤں میں بھی لوگ میرا مذاق اڑاتے ہیں مجھے کم تر سمجھتے ہیں مجھے عورتوں کے ناموں سے پکارتے ہیں مثلاً باجی گل گل ہو باجی وغیرہ جس کی وجہ سے مجھے بہت غصہ آتا ہے۔ کبھی کبھی تو میں اکیلے میں روتا بھی ہوں۔ خدا سے اپنے گناہوں کی معافی بھی مانگتا ہوں لیکن شاید اللہ تعالیٰ مجھے ایسی ہی سزا دینا چاہتا ہے کہ میں لوگوں میں کم تر رہوں لوگ مجھے برے ناموں سے پکارتے ہیں میرا ہر وقت مذاق اڑائیں یا یہ اللہ کے محبت کرنے کا دوسرا روپ ہے؟ باباجی میرا تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ میری زبان میں ہکلاہٹ ہے یعنی باتیں صحیح طرح نہیں کر سکتا زبان گنگ ہوتی محسوس ہوتی ہے ہکلاہٹ کے لیے میں نے پانی اور چینی بھی دم کر کے استعمال کیے لیکن ان سے افادہ نہیں ہوا۔ طرح طرح کے درد و وظائف بھی پڑے لیکن ان کا بھی خاطر خواہ افادہ نہیں ہوا۔ لوگ میری ہکلاہٹ پہ ہنستے ہیں اور مجھے غصہ بھی آتا ہے۔ ایک تو میرے اندر اعتماد نہیں اور جب بات بھی کرنے لگتا ہوں تو لوگ ہنسنے لگتے ہیں۔ آپ خود سوچے باباجی یہ صحیح ہے؟ باباجی چوتھا مسئلہ یہ ہے کہ میں نماز کا پابند نہیں ہوں۔ کبھی بھی نماز پڑھتا ہوں۔ آپ میرے لیے دعا کیجیے کہ میرا دل نماز میں لگ جائے۔ باباجی میری شکل بھی اتنی بری نہیں ہے جاذبِ نظر ہوں لوگ میرے سامنے کہتے ہیں تم خوب صورت ہو لیکن وہ میری

باتوں پہ ہنستے ہیں مجھے برے ناموں سے پکارتے ہیں لیکن کیوں؟ باباجی میری یہ بھی بری عادت ہے کہ میں کسی بد صورت کو دیکھ لوں تو اس سے مذاق کرنے لگتا ہوں۔ آپ میرے لیے دعا کریں کہ ان مسائل سے میری جان چھوٹ جائے۔ اب آپ مجھے آسان سا وظیفہ یا تعویذ دیں تاکہ میرے مسائل جلدی سے حل ہو جائیں۔ میں بہت پریشان ہوں۔ خدا را میری مدد کریں۔ میری عمر 16 سال ہے۔ ممکن ہو تو ان مسائل کو رسالے میں جگہ دیں۔ اگر نہ ہو سکے تو کوئی بات نہیں لیکن جواب ضرور دیں۔ آپ کی بہت مہربانی ہوگی۔ اچھا اب اجازت دیں اگر کوئی بات انجیلی یا بری لگی ہو تو بتا دیجیے گا کیونکہ ہم آپ اور آپ کے کالم کے بغیر کچھ نہیں۔

☆ بیٹے کا شرف! تم نے اپنے مسائل کی وجہ خود ہی لکھ ڈالی ہے۔ جب تم کسی معمولی صورت کے انسان کو دیکھتے ہو تو مذاق کرتے ہو تمہاری اسی عادت کی وجہ سے اللہ تبارک و تعالیٰ تم سے ناراض ہیں اور لوگ تمہارا مذاق بنا رہے ہیں۔ شکل اللہ کی بنائی ہوئی چیز ہے۔ جو کسی کی شکل کا مذاق اڑاتا ہے دراصل وہ اللہ کی نافرمانی کر رہا ہوتا ہے۔ تم اپنی یہ ایک بری عادت ترک کر دو۔ تمہارے سارے معاملات درست ہو جائیں گے۔ نماز کی پابندی رکھو۔ دُرود شریف بہت پڑھو۔ دن میں دو بار آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر 7-7 بار الحمد شریف پڑھا کرو اور اس دوران اپنی آنکھیں اپنے چہرے پر مرکوز رکھو۔ کوشش کرو کہ ہر وقت با وضو رہو۔ رمضان المبارک میں مانگی گئی ہر جائز دعا قبول ہوتی ہے۔ اللہ سے گزر کر دعائیں مانگو۔ بعد نماز عشاء ایک بار سورۃ نجم تم جے کے ساتھ ضرور پڑھو۔

○ عبدالعزیز جی آ۔ چکوال۔

○ قابل احترام باباجی! السلام علیکم! ۱۳ مارچ کو بیٹی حنا عزیز کی شادی اپنے بھانجے سے کی جو کراچی میں رہتے ہیں۔ بچی بیمار ہوئی تو ظالم ساس جعلی اور لیسرے عاملوں سے تعویذ گنڈے لاکر بچی کا اپنے طور پر علاج کرنے لگی۔ جاہل عورت کسی ڈاکٹر اسپیشلسٹ کے پاس بچی کو نہ لے گئی بلکہ محلے میں ہی ایک عطائی ڈاکٹر سے علاج کرائی رہی۔ بچی سے بخاری حالت میں گھر کے کام کرائی اور ڈانٹ ڈپٹ بھی کرتی رہی۔ ۳ ماہ میں میری پھول جیسی بیٹی زندہ لاش بن گئی۔ لڑکا (داماد) اچھا ہے بیوی کا بہت خیال رکھتا ہے مگر ماں باپ سے دبتا ہے۔ یہ تعویذ بچی کے گلے میں تھا جو میں نے کھول کر دیکھا تو لگا یہ قرآنی آیات کریمہ تو نہیں پھر یہ کون سی زبان ہے؟ بچی کو میں لے آیا ہوں۔ لاہور ہسپتال میں داخل کرائی ہے۔ پلیز باباجی! ضرور بتائیے یہ ہے کیا؟ ادھر تلہ گنگ میں ایک روحانی بابا نے بتایا کہ یہ کالا جادو ہے۔

☆ عزیزم عزیز! اللہ تمہیں اپنی اولاد کی خوشیاں دکھائے۔ بچی کو اچھے ڈاکٹر کو دکھاؤ اور لگ کے علاج کراؤ۔ دوا اور دُعا دونوں بہت ضروری ہیں۔ بہالت کی وجہ سے لوگوں کو عالم اور عامل کا فرق ہی نہیں پتا۔ بس جہاں سے ملے تعویذ لے لو یہ روایہ غلط ہے۔ میں بچی کے لیے دُعا کروں۔ تم حسب استطاعت صدقہ ضرور نکالو۔ ماہ رمضان ہے کہ میں ہی برکتیں ہیں سب خیر ہوگی۔ صبح و شام بچی سے کہو آیت الکرسی پڑھ کر اپنے اوپر دم کرے اور بہ کثرت سورۃ الناس اور سورۃ قلقل پڑھے۔ مجھے 15 دن بعد مطلع کرو۔

○ صدف۔ لاہور۔

○ باباجی! السلام علیکم! پہلی بار آپ کو خط لکھ رہی

ہوں لیکن میں بہت مجبور اور بے بس ہوں۔ میں بھی اپنی کہانی آپ تک پہنچانا چاہتی ہوں۔ باباجی! میرا نام صدف ہے اور میں لاہور کی رہنے والی ہوں۔ میری بے وقوفیوں کی وجہ سے مجھ پہ بہت قرض چڑھ گیا ہے میں پڑھی لکھی ہوں۔ میں نے M.B.A. کیا ہے لیکن باباجی! میں سچ کہہ رہی ہوں میرے دماغ کو اس وقت پتا نہیں کیا ہوا میں نے گارمنٹ کا کام شروع کیا تھا جس سے مجھے بہت نقصان ہوا اور میں مقروض ہو گئی۔ کچھ لوگوں نے بھی بے وقوف بنایا بہت لوگوں کے پاس گئی لیکن سب نے صرف پیسے لیے اور کام نہ ہوا۔ بہت عاملوں کے پاس بھی گئی۔ کوئی چھ ہزار مانگ رہا ہے کوئی آٹھ ہزار تو کوئی چندرہ ہزار۔ پیسے کا نقصان ہی نقصان ہوا۔ اب میں چاہتی ہوں کہ پلیز آپ کے رسالے کے توسط سے میری مدد کی جائے میں بہت پریشان ہوں۔ پلیز باباجی! رسالے کے توسط سے بہت سے ایسے لوگ جو کہانیوں میں لکھتے ہیں کہ ہم لوگوں کی مدد کرنا چاہتے ہیں آج ہمارے پاس سب کچھ ہے۔ قرض کی بنا پر مجھے سسرال والوں نے نکال دیا ہے۔ میرے دو بچے ہیں وہ بھی ان کے پاس ہیں۔ بات طلاق تک پہنچ گئی ہے۔ اگر میری کچھ مدد ہو جائے تو میرا گھر بچ جائے گا۔ میں آپ کی بہت شکر گزار ہوں گی۔

☆ صدف بیٹی! یہ سب تمہارا کیا دھرا ہے بغیر سوچے سمجھے کوئی بھی کام نہیں کرنا چاہیے۔ تم صحیح وقتہ نماز کی پابندی کرو اور چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے حسبن اللہ ونعم الوکیل کا ورد کیا کرو۔ اللہ تعالیٰ کرم فرمائے گا۔ آج کل رمضان المبارک ہے دُعاؤں کے مستجاب ہونے کا مہینا۔ تم بھی ہر فجر کی نماز کے بعد اللہ تعالیٰ سے گزر کر ارمغانی مانگو۔ دُعا مانگتے وقت اگر



آنکھوں میں آنسو بھی آجائیں تو بہت بہتر ہے کہ اللہ جل شانہ کو گریہ بہت پسند ہے۔ میں نے تمہارا مسئلہ بھی شائع کر دیا ہے۔ اگر کوئی صاحب حیثیت شخص ”سچی کہانیاں“ سے رابطہ کرے گا تو تمہیں اطلاع دے دی جائے گی۔

✽ نورین خان لاہور۔

۵ باباجی! السلام علیکم! میں کئی سال سے ”سچی کہانیاں“ کی قاری ہوں۔ باباجی! آپ نے بے شمار افراد کے مسائل حل کیے ہیں، میں بھی آج کل ایک مسئلے سے دوچار ہوں۔ مجھے امید ہے کہ آپ مجھے مایوس نہیں کریں گے۔ باباجی! میری عمر پچیس سال ہے۔ میں نے گریجویشن کرنے کے بعد ایک پرائیویٹ ادارے میں ملازمت کر لی تھی۔ ادارے میں صرف دو خواتین ہیں، ایک میں اور دوسری ایک پختہ عمر کی عورت ہیں۔ میں خاصی خوب صورت اور پرکشش ہوں۔ اس میں اپنی تعریف کا پہلو ہرگز نہیں ہے بلکہ واقعی ایسا ہے۔ ادارے کے کئی افراد مجھ میں دلچسپی لے رہے ہیں۔ تین افراد تو بہت زیادہ سیریس ہیں، ان میں ایک کو میں بھی پسند کرتی تھی۔ اچھا خوش پوش اور خوب روڑ کا تھا۔ وہ گلبرگ کے ایک بنگلے میں رہتا تھا۔ ایک بھائی کینیڈا میں تھا اور بہن شادی کے بعد لندن شفٹ ہو گئی تھی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس نے سب کچھ مجھ سے جھوٹ کہا تھا۔ اس کا کوئی بھائی کینیڈا میں تھا نہ بہن لندن میں مقیم تھی۔ میرا دل اس کے جھوٹ پر اس کی طرف سے کھٹا ہو گیا اور مجھے اس لڑکے سے نفرت سی ہو گئی۔ باقی دو لڑکے تو میرے معیار کے تھے ہی نہیں۔ اسی دوران میں میرے آفس کے ایم ڈی مجھ میں دلچسپی لینے لگے۔ وہ سیدھے سچے اور کھرے انسان ہیں۔ انہوں نے مجھے بتا دیا ہے کہ وہ شادی شدہ اور تین بچوں کے باپ ہیں۔ ان کا سب سے بڑا بیٹا اس وقت اولول

کر رہا ہے۔ انہوں نے مجھے شادی کے لیے پربوز کیا ہے۔ ویسے تو میں انہیں بہت اچھی طرح سمجھ گئی ہوں۔ وہ میرے ساتھ بہت مخلص ہیں لیکن ان کی بیوی اور سسرال سے ڈر لگتا ہے۔ وہ لوگ خاصے بارسوخ ہیں اور اس شادی میں رکاوٹیں ڈال رہے ہیں۔ باباجی! میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ میں کیا کروں؟ دوسری طرف وہ لڑکا بھی ہاتھ دھو کر میرے پیچھے بڑ گیا ہے جس نے خود کو ریکس زادہ ظاہر کیا تھا۔ مجھے کوئی ایسا وظیفہ بتائیں کہ میرے تمام مسائل حل ہو جائیں۔ زندگی بھر آپ کی ممنون رہوں گی۔ ✽ نورین بیٹی! تمہاری اس روش سے مجھے بہت صدمہ ہوا تمہارا مسئلہ صرف اور صرف پیسا ہے۔ تم نے لاچ میں آ کر اس نوجوان سے محبت کی پیٹلیں بڑھا کیں پھر اس کی طرف سے مایوس ہو کر تم نے اپنی کمپنی کے ادھیڑ عمر ایم ڈی کو آگے بڑھنے کا موقع دیا۔ یہ رویہ انتہائی افسوس ناک ہے۔ تم اپنی خود غرضی اور لاچ میں یہ بھی بھول گئیں کہ تمہارے اس اقدام سے ایک دوسری عورت کا گھر اجڑ جائے گا۔ مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ مسئلہ تمہارا نہیں ہے بلکہ تم تو خود دوسروں کے لیے مسئلہ ہو۔ مجھے تمہاری اس ڈھٹائی پر بھی حیرت ہے کہ تم غلط کام کر رہی ہو اور اس کی تیکھل کے لیے مجھ سے وظیفہ بھی مانگ رہی ہو۔ انسان کو اتنا بھی لالچی اور خود غرض نہیں ہونا چاہیے۔ نورین بیٹی! اللہ سے ڈرو اور اس سے اپنے گناہوں کی معافی مانگو۔ اب بھی کچھ نہیں بگڑا ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ تمہیں نیک ہدایت دے۔ بیٹی! تم سچ وقت نماز کی پابندی کرو اور اٹھتے بیٹھتے استغفار کیا کرو۔ بعد نماز مغرب ایک سچ سورۃ قریش کی پڑھ لیا کرو۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے گناہوں کو معاف فرمائے والا اور انہیں نیک ہدایت دینے والا ہے۔ رمضان المبارک کے

مقدس مہینے میں یہ عمل کرو۔ انشاء اللہ تمہیں دینی انتشار سے نجات مل جائے گی۔ ✽ شہزاد احمد، گوجرانوالہ۔

✽ شہزاد بیٹے! تمہارے خط کی اشاعت تمہارے حق میں بہتر نہیں ہے۔ یہ مسئلہ صرف تمہارا ہی نہیں بلکہ فی زمانہ بے شمار نوجوانوں کا ہے۔ غیر ملکی میڈیا کی یلغار بالخصوص انٹرنیٹ نے نوجوانوں کو دینی طور پر پریشانی بنا دیا ہے۔ ان خرافات سے بچنے کا واحد طریقہ سچ وقت نماز کی پابندی ہے۔ اگر تم واقعی ان فضول کاموں سے بچنا چاہتے ہو تو انتہائی خصوص و خشوع سے نماز کا اہتمام کرو۔ رمضان المبارک میں نماز کی پابندی یوں بھی مشکل نہیں ہوگی۔ اس کے ساتھ ہی تم صحت مند لڑکچر کا مطالعہ کرو۔ ہر وقت باوجود رہنے کی کوشش کرو اور اٹھتے بیٹھتے سچائی یا قیوم پر حتمت استغیث کا ورد کیا کرو۔ یقیناً جانو تمہیں کسی بھی قسم کی کوئی بیماری نہیں ہے۔ یہ سب تمہارے ذہن کا فقر ہے۔ تمہیں کسی حکیم یا ڈاکٹر کی ضرورت نہیں ہے۔ نوجوانوں کو تباہ کرنے میں جتنا ہاتھ دیش جیٹلو اور انٹرنیٹ کا ہے اس سے کہیں زیادہ ان جعلی حکیموں اور سنسیاسی بادواؤں کا ہے جو الٹی سیدھی دوائیں اور جڑی بوٹیاں دے کر نوجوانوں کو دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہے ہیں۔ تم چالیس دن میری ہدایات پر عمل کرو اس کے بعد مجھے خط لکھ کر اپنی کیفیت سے آگاہ کرو۔ انشاء اللہ تعالیٰ تمہاری تمام مشکلات حل ہو جائیں گی۔ ✽ شمیمہ رحمت علی اوکاڑہ۔

۵ باباجی! السلام علیکم! میں گزشتہ کئی برس سے ”سچی کہانیاں“ پابندی سے پڑھ رہی ہوں اور ”مسئلہ یہ ہے“ بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ باباجی! تین سال قبل بھی اللہ کے کرم اور آپ کی دعاؤں اور تجویز کردہ وظیفے سے میرا ایک مسئلہ حل ہوا

ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت و سلامتی کے ساتھ ہمیشہ خوش رکھے۔ (آمین!) میں اب پھر انتہائی سنگین مسئلے سے دوچار ہوں۔ میرے شوہر لاہور کی ایک بہت بڑی فرم میں ملازمت کر رہے تھے اور گھر میں ہر طرح کی خوش حالی تھی۔ تین ماہ پہلے اچانک میرے شوہر کی ملازمت ختم ہو گئی۔ آفس کے جی ایم سے ان کا جھگڑا ہو گیا تھا۔ میرا ایک بیٹا فرسٹ ایئر انجینئرنگ میں پڑھ رہا تھا۔ گزشتہ مہینے اسے اچانک بہت شدید بخار ہوا، اس کے بعد وہ مفلوج ہو کر رہ گیا ہے۔ مجھے خود بھی اچانک بیٹھے بیٹھے چکر آتے ہیں اور میری حالت بری ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد میں تقریباً ایک ڈیڑھ گھنٹے تک ہلنے چلنے سے معذور رہتی ہوں۔ میں سچ وقت نماز کی پابند ہوں۔ ہر نماز کے بعد مختلف اور ادا اور وظائف کا ورد کرتی ہوں۔ رات کو عشاء کے بعد پابندی سے سورۃ یسین اور سورۃ کہف کا چالیس بار ورد کرتی ہوں۔ صبح فجر کے بعد سے لے کر سورج نکلنے تک میں چالیس بار سورۃ اخلاص کا ورد کرتی ہوں۔ ان سب باتوں کے باوجود میرے ساتھ یہ ہو رہا ہے۔ اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ کسی نے میرے گھر پر کچھ کر دیا ہے۔ اپنی ایک جاننے والی کے ساتھ میں ایک مشہور عامل کے پاس بھی گئی لیکن پیسے کے زیاں کے سوا کچھ بھی نہیں ہوا۔ باباجی! میں شدید مشکلات میں گھری ہوئی ہوں شوہر کی بے روزگاری اور بیٹے کی بیماری نے مجھے توڑ کر رکھ دیا ہے۔ باباجی! آپ کو اللہ کا واسطہ میرے لیے کچھ کریں۔ اللہ کے بعد آپ ہی میرا آخری سہارا ہیں۔ مجھے کوئی وظیفہ بتائیں یا تعویذ دیں کہ ان مشکلات اور پریشانیوں سے چھٹکارہ نصیب ہو۔ ساری زندگی آپ کی ممنون رہوں گی۔ ✽ شمیمہ بیٹی! تمہارا خط پڑھ کر بہت افسوس



سچی کہانیاں  
MINI MAG

آپ کی ڈائری

نقدِ مہر

خیال آرائی

پسند اپنی اپنی

آپ کی خبر

بازگشت

○ تحریمِ رضا ریاض۔

○ باباجی، مجھے آپ کو خط لکھنے کے لیے میری امی نے کہا۔ وہ آپ کو لاہور سے خط لکھتی ہیں۔ میرا مسئلہ بڑا عجیب ہے، میں پورا سال صحت مندر بہتی ہوں مگر رمضان کے مہینے میں ہر قسم کے دوائس مجھ پر حملہ کرتے ہیں۔ پہلے روزے سے نزلہ بخار پھر کھانسی پھر پیٹ خراب، بس پورا مہینہ یہ سلسلہ چلتا ہے۔ عید کے دن میں بالکل فریٹھ اٹھتی ہوں، لگتا ہی نہیں کہ کبھی کچھ ہوا بھی تھا۔ سب سے بڑی تکلیف تو یہ کہ میں اس بابرکت مہینہ کو عام لوگوں کی طرح خوش آمدید نہیں کہہ پاتی پھر ان بیماریوں کی وجہ سے کچھ کھا نہیں سکتی۔ بہت کمزوری رہتی ہے لہذا چڑچڑاہٹ بہت بڑھ جاتا ہے۔ شادی سے پہلے تو بہن بھائی مذاق کرتے تھے۔ امی ابو بہت خیال رکھتے تھے مگر شادی کے بعد صورت حال مختلف ہے اب مجھے باتیں سننی پڑتی ہیں۔ آپ سے درخواست کرتی ہوں میرے اس مسئلے کا مستقل حل بتائیے۔ میں آپ کی احسان مندر ہوں گی۔

☆ بیٹی تحریم، اللہ تمہیں اپنے گھر میں خوش اور آباد رکھے۔ مناسب ہوگا، تم اپنی والدہ لے کر ہو کہ وہ رمضان سے پہلے تمہارا مکمل چیک اپ کروائیں۔ کوشش کرو کہ گھر میں تازہ ہوا کا گزر رہے، خاص طور سے باورچی خانے کی کھڑکیاں کھلی رکھو۔ یہ نیت کر لو کہ اس رمضان ایک روزے دار کا روزہ کھلو آؤ گی۔ بیٹی، تم دیکھنا کہ اس سال انشاء اللہ تم پورے اہتمام سے روزے رکھ سکو گی۔ ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا کہ صدقہ خیرات سے ہاتھ مت روکنا۔ اللہ تمہارا حامی و ناصر ہو۔

ہوا۔ بیٹی دنیا دکھ اور پریشانیوں کا گھر ہے یہاں ہر شخص پریشان ہے، کوئی کم پریشان ہے اور کوئی زیادہ۔ دکھ مجھے اس بات کا بھی ہے کہ تم نے جانتے بوجھتے ان پیشہ ور عالموں پر رُم لٹائی؟ تم یہ یا تمہارے گھر سے کسی نے کچھ نہیں کر دیا ہے بلکہ تم نے خود ہی یہ پریشانیاں مول لی ہیں۔ اور دو وظائف کی کثرت بھی پریشانیوں کا باعث ہوتی ہے۔ پہلے تو یہ بتاؤ کہ تم اتنی کثرت سے وظائف کس کی اجازت سے پڑھ رہی ہو اور کیوں پڑھ رہی ہو؟ بیٹی میں متعدد مرتبہ پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ وظائف کی کثرت سے بھی نقصان پہنچتا ہے پھر بہت سے وظائف ایسے بھی ہوتے ہیں جنہیں پڑھنے سے پہلے اجازت ضروری ہوتی ہے۔ میں ”سچی کہانیاں“ میں جو وظائف تجویز کرتا ہوں ان سے سب استفادہ کر سکتے ہیں لیکن ان میں بھی ایک وقت میں صرف ایک ہی وظیفہ کرنا ہوتا ہے۔ میں تمہارے توسط سے ”سچی کہانیاں“ کے تمام قارئین کو بھی یہ بتا رہا ہوں کہ ایک وقت میں صرف ایک ہی وظیفہ کیا جائے۔ تم سب سے پہلے تو یہ کرو کہ تمام اور دو وظائف کو ختم کر دو ایک ہفتے تک صرف سچ وقت نماز اول وقت میں ادا کرو اور بعد نماز فجر قرآن پاک کی تلاوت کر لیا کرو۔ ایک ہفتے بعد فجر کی سنتوں کے بعد اور فرض سے پہلے ایک مرتبہ سورۃ رحمن کی تلاوت کر لیا کرو اور بعد نماز مغرب ایک مرتبہ سورۃ واقعہ پڑھ لیا کرو۔ اٹھتے بیٹھتے ہر وقت حبنا اللہ نعم الوکیل کا ورد کرتی رہو۔ کسی بھی عامل یا سیانے کے پاس جانے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔ اکٹالیس دن تک یہ عمل کرو۔ اس دوران میں حسب استطاعت صدقہ بھی دیتی رہو کہ صدقہ بلاؤں کو نکالتا ہے۔ بیٹے کی بیماری کے سلسلے میں مجھے تفصیلی خط لکھ کر وظیفہ اور تعویذ منگواؤ۔



مامون طاہر رانا کا مرتب کردہ انتخاب

## ”نظم کا سفر“

### مجموعی تجزیہ

عکاشہ سحر

شاعری احساسات کی ترجمان ہے احساسات داخلی ہوں یا خارجی یہ دونوں کی آمیزندہ ہے۔ اس ماہ ”کتاب تبصرے“ کے لیے ایک انتخاب موصول ہوا ہے جس کے مرتب ملتان سے تعلق رکھنے والے مامون طاہر رانا ہیں۔ اس سے پہلے غزلیات پر مشتمل اُن کا انتخاب ”ہم زندہ رہیں گے“ بھی اشاعت پذیر ہو چکا ہے جبکہ اس بار مامون طاہر نظم کا انتخاب لے کر آئے ہیں۔

نظم کے اس سفر میں بہت سے شعراء شامل ہیں۔ میراجی، ن م راشد، اختر الایمان، فیض احمد فیض، ساحر لدھیانوی، احمد ندیم قاسمی، احمد فراز، میر نیازی، گلزار، بیدل، حیدری، افتخار عارف، اقبال، ارشد اور ایسے بہت سے شعراء شامل ہیں جنہیں نظم کے میدان میں نمایاں مقام حاصل ہے۔ اس مجموعہ کلام میں سینئرز کے ساتھ ساتھ نوجوان شعراء کا کلام بھی شامل اشاعت کیا گیا ہے اور ملتان سے تعلق رکھنے والے بہت سے شعراء اس انتخاب میں شامل ہیں۔ بلاشبہ یہ ایک محنت طلب کام ہے جسے مامون طاہر نے پوری ذمہ داری سے نبھایا ہے۔

شاعری کو جو چیز نثر سے ممتاز کرتی ہے وہ اُس کے مخصوص فنی محاسن ہیں۔ ان شعری محاسن میں سب

سے اہم وصف تمثال کاری ہے۔ شاعر جب کسی تجربے سے دوچار ہوتا ہے تو احساس کی اس کیفیت واردات و مشاہدات کی اس سطح اور خیالات و افکار کے اس پہلو کو جو اس کی شعری تخلیقات کا سبب ہوتا ہے الفاظ کے ذریعے قریطاس پر بکھیرتا ہے۔

احمد ندیم قاسمی کی نظم ”جدائی کی پہلی رات“ میں دکھ کی کیفیت کو محسوس کیجیے!

نہ جانے آج کی شب اس قدر طویل ہے کیوں!  
جہاں سے چاند چلائے وہیں یہ رک سا گیا  
کسی خیال میں یوں کھو گیا کہ جھک سا گیا  
ستارے جم سے گئے سر کی خلاؤں میں  
یہ کس نے وقت کے پر نوچ کر کھیر دیئے  
یہ کس نے رخ ہی لپکتے پلوں کے پھیر دیئے  
نکٹ سکی اگر اک رات بھی جدائی کی  
تو کون چھانے گا نہ بیاں خدائی کی  
نہ جانے آج کی شب اس قدر طویل ہے کیوں!

اختر الایمان کا نام نظم کے حوالے سے کسی حوالے یا تعارف کا محتاج نہیں۔ اُن کی نظم ”اظہار“.....

”نظم کے سفر“ میں شامل ہے۔  
تو بھی تقدیر نہیں درد بھی پابند نہیں  
تیرے رخساروں سے وابستہ مرا عہد وفا  
رات کے آخری آنسو کی طرح ڈوب گیا  
خواب انگیز نگاہیں وہ لب درو فریب  
اک افسانہ ہے جو کچھ یاد رہا کچھ نہ رہا  
میرے دامن میں نہ کلیاں ہیں نہ کانٹے نہ غبار  
شام کے سائے میں در ماندہ بحر بیٹھ گئی

کارواں لوٹ گیا، مل نہ سکی منزل شوق

.....

ارمان یوسف کا شار نوجوان شعراء میں ہوتا ہے۔ لندن میں مقیم ارمان یوسف کی نظم ایک الگ رنگ لیے ہوئے ہے۔ ”ابھی تم خواب مت پیو“ کی چند لائنیں ملاحظہ فرمائیے!

ابھی تم خواب مت پیو  
انہیں آزار دہنے دو  
مجھے بس اتنا کہنے دو  
چمن کے سرخ پھولوں میں  
تمہارا خون شامل  
مہکتے پھول، کلیاں بھی  
وطن کی ساری کلیاں بھی  
محبت کی کہانی بھی  
یہ دریا کی روانی بھی  
تمہارے دم قدم سے ہے

.....  
ملتان سے تعلق رکھنے والے نظم کے بہت خوبصورت شاعر اسلم انصاری کی نظم ”مرے عزیز و.....! تمام دکھ ہے“ (گوتم کا آخری وعظ) موضوع اور لفظیات کے حوالے سے ایک منفرد اور اعلیٰ نظم ہے!

مرے عزیز و.....!  
مجھے محبت سے نکلنے والو  
مجھے عقیدت سے سننے والو  
مرے شکستہ حروف سے اپنے من کی دنیا بسانے والو  
مرے الم آفریں تکلم سے انبساط تمام کی  
لازوال شمعیں جلانے والو  
بدن کو تحلیل کرنے والی ریاضتوں پر عبور پانے  
ہوئے سکھوں تجھے ہوئے بے مثال لوگو!

حیات کی رمز آفریں کو سمجھنے والو..... عزیز بچو! میں سمجھ رہا ہوں

مرے عزیز و.....! میں جل چکا ہوں  
مرے شعور حیات کا شعلہ جہاں تاب بجھنے والا ہے  
میرے کرموں کی آخری موج میری سانسوں میں گھل چکی ہے  
میں اپنے ہونے کی آخری سرحد پہ آ گیا ہوں  
تو سن رہے ہو؟ مرے عزیز و.....! میں جا رہا ہوں

میں اپنے ہونے کا داغ آخر کو دھو چلا ہوں  
کہ جتنا رونا تھا، رو چلا ہوں  
مجھے نہ اب انت کی خبر ہے نہ اب کسی چیز پر نظر ہے  
شعور کیا ہے؟ اک التزام وجود ہے اور وجود کا التزام دکھ ہے

جدائی تو خیر آپ دکھ ہے ملاپ دکھ ہے  
کہ ملنے والے جدائی کی رات میں ملے ہیں یہ رات دکھ ہے  
یہ زندہ رہنے کا باقی رہنے کا شوق یہ اہتمام دکھ ہے  
سکوت دکھ ہے کہ اس کے کرب عظیم کو کون سہہ سکا ہے

کلام دکھ ہے کہ کون دنیا میں کہہ سکا ہے جو ماورائے کلام دکھ ہے  
یہ ہونا دکھ ہے نہ ہونا دکھ ہے ثابت دکھ ہے دوام دکھ ہے

مرے عزیز و.....! تمام دکھ ہے  
صدائقوں کی آمیزش سے لبریز یہ نظم ریاضت گہرا مطالعہ مشاہدہ اور آگہی کی منزل کے بعد وجود میں آئی ہے۔ یہ نمائندہ نظم ادب کے اقدار کو تحفظ

فراہم کرتی نظر آتی ہے۔

نظم اُن شاعروں کے طفیل زندہ ہے جو نظم کوئی ٹریٹ منٹ دے کر اُس کی تازگی، رعنائی اور توانائی میں اضافہ کرتے رہتے ہیں۔ افتخار عارف نظم کے حوالے سے ایک معتبر نام ہے۔ اُن کی نظم ”مکالمہ“ ایک گنگنائی ہوئی لطیف نظم ہے۔ ہر مصرعہ ہر لفظ ہمارے دل و ذہن سے مکالمہ کرتا ہے!

ہوا کے پردے میں کون ہے جو چراغ کی کو سے کھیلتا ہے

کوئی تو ہوگا جو خلعت انتساب پہنا کے وقت کی رو سے کھیلتا ہے

کوئی تو ہوگا حجاب کو رمز نور کہتا ہے اور پر تو سے کھیلتا ہے

کوئی تو ہوگا کوئی نہیں ہے یہ خوش یقییوں کے خوش گمانوں کے واسطے ہیں

جو ہر سوالی سے بیعت اعتبار کر لیتے ہیں اُس کو اندر سے مار دیتے ہیں

تو کون ہے وہ جو لوحِ آب رواں پہ سورج کو ثبت کرتا ہے

اور بادل اچھالتا ہے جو بادلوں کو سمندروں پر کشید کرتا ہے اور بطنِ صدف میں خورشید ڈھالتا ہے

وہ سنگ میں آگ، آگ میں رنگ میں روشنی کے امکان رکھنے والا

وہ خاک میں صورت، صورت میں حروفِ حرف میں زندگی کے سامان رکھنے والا

نہیں کوئی ہے کہیں کوئی ہے کوئی تو ہوگا!!

.....

خواتین شعراء نے بھی نظم کے حوالے سے نمایاں کام کیا ہے۔ معصومہ شیرازی بنیادی طور پر ملتان سے تعلق رکھتی ہیں لیکن آج کل کراچی میں مقیم ہیں۔ بہت خوبصورت نظم کہتی ہیں۔ نظم کے حوالے سے اُن کی فکر نے مجھے بہت متاثر کیا ہے۔ اُن کی نظم ”اداسی میں.....“ اداسی کا گہرا رنگ دیکھیے.....!

اداسی کا کوئی موسم، کوئی فرقہ، کوئی مذہب نہیں ہوتا یہ ہر آنگن میں کھتی ہے

اتر تہی شام کی ویران گلیوں میں دمام رقص کرتی ہے

نکلتی سرمئی سبھوں میں لمبے سانس بھرتی ہے اداسی کا مقدر کا سب اعلیٰ

خود اپنے ہاتھ سے خیر کرتا ہے اداسی کشف اور الہام کی عرشی کمانوں میں

جزا ہوا وہ تیر ہے جس کو نشانہ یاد رہتا ہے

کہانی بھول جاتی ہے.....

مامون طاہر نئی نسل کے تخلیقی گروہ سے تعلق رکھتا ہے مگر اُس کے اندر فنی صلاحیت اور تخلیقی جوہر اپنے ہم عمر شعراء سے زیادہ ہے۔ نظم کے حوالے سے اُن کا ایک الگ مزاج ہے۔ نظم کے سفر میں شامل مامون کی تین نظمیں شامل ہیں۔ اُن کی نظم ”امانت“ میں سادگی دیکھیے!

تمہیں مبارک ہو آج میں نے وہ موتیوں کی مہکتی کلیاں

گلاب سارے تمہاری چوٹ پہ رکھ دیئے ہیں

انہیں اٹھالو

انہیں سنبھالو

یہ اب تمہاری امانتیں ہیں

تمہی نے مجھ کو عطا کیے تھے

یہ بھول سارے

محبوب کی نشانیوں کو سنبھالے رکھنا

مری محبت کو بھول جانا

مگر تم اپنا خیال رکھنا

.....

بھارت سے تعلق رکھنے والے گلزار کے نام اور کام سے کون واقف نہیں۔ اُن کی نظم ”نظم کی بات“ مامون طاہر کے اس انتخاب میں شامل ہے۔

ایک خیال کو کاغذ پر دفنایا تو ایک نظم نے آنکھیں کھول کے دیکھا

ڈھیروں لفظوں کے نیچے وہ دبی ہوئی تھی سہمی سی اک مدہم سی آواز کی بھاپ

اڑی کانوں تک کیوں اتنے لفظوں میں مجھ کو چھپتے ہو

بائیں گس دی ہیں مصرعوں کی تشبیہوں کے پردے میں ہر جنبش

تمہ کر دتے ہو! اتنی اینٹیں لگتی ہیں کیا ایک خیال کے مدفن میں

.....

غم ایک ناگزیر حقیقت ہے، اِس سے راہ فرار اختیار کرنا نامکن ہے۔ کرامت بخاری کی نظم ”ہمارا کیا ہے“ اسی تلخ حقیقت کا احساس دلاتی ہے!

ہمارا کیا ہے ہماری عادت سی ہو چکی ہے

شفق کی بے خواب واویلوں میں بھٹکتے رہنا

گئی بہاروں کو یاد کرنا

فریب خوردہ سماعتوں کے فسوں میں رہنا  
افتق میں تحلیل ہوتے رنگوں کو رنگوں میں تلاش کرنا  
تمام اُجڑے ہوئے دیاروں میں خاک ہوتے

ہوئے مزاروں پہ جانگنا  
اور اپنے گزرے ہوئے دنوں کا حساب کر کے

کتاب کر کے ملول ہونا  
ملول کرنا

ہمارا کیا ہے ہماری عادت سی ہو چکی ہے

حروف و قمر طاس سے الجھنا، الجھتے رہنا  
خیال کی بے پناہ وسعت میں گرد ہوتی ہوئی

مسافت کی چاپ سننا  
کہیں کہیں یہ قیام کرنا، کلام کرنا

خلا کی نیلی ردائے جو کچھ تم ہوا ہے اُسے سمجھنا  
سمجھ کے دنیا میں عام کرنا

اور آنے والی تمام نسلوں کے نام کرنا  
ہمارا کیا ہے!

.....

جب دل میں غم کا آتش فشاں پھٹتا ہے تو آنکھوں سے آنسوؤں کا لاوا بہنے لگتا ہے اور انسان کا

وجود جل کر راکھ ہو جاتا ہے۔ اکثر اوقات ہماری نظر غموں کے اسباب و عوامل کی طرف نہیں جاتی۔ ہم

ان محرکات کی بنیادیں ڈھونڈنے کی کوشش نہیں کرتے جو ہمارے معاشرتی انہدام کا باعث بنتے

ہیں..... احمد سجاد بابر نوجوان شعراء میں ایک خوبصورت اضافہ ہیں..... اُن کی نظم ”دکھ کے

سائے“ کی چند لائیں۔

کس اوڑھ چلیں اِس جیون میں  
کہ دکھ کا رستہ رُک جائے

وہ دھرتی کیسی دھرتی ہو



کہ منہ سدا ہی سکھ پائے  
وہ امیر جس کی چھایا سے  
دھرتی ماتا مہک اٹھے  
وہ نیند کے جس کے سپنوں سے  
بے کل بالک چمک اٹھے  
کس اور چلیں اس جیون میں  
کہ دکھ کا رستہ رک جائے

کوئی کتنا بھی سچا ہو  
مگر اقرار مت کرنا  
اُسے کہنا یہ دنیا ہے  
یہاں پہ پیار مت کرنا

.....

غلام طاہر رانا جلی کیشنز کے زیر اہتمام شائع  
ہونے والے نظم کے اس انتخاب میں بہت سے  
شعراء کی نظمیں شامل اشاعت ہیں۔ محدود  
صفحات کے باعث ان کے کلام پر بات کرنا  
ناممکن ہے۔ مختصر آواز کہوں گی کہ مامون طاہر رانا  
ایک اچھا انتخاب لے کر آئے ہیں جس کی بھرپور  
پذیرائی ہوگی۔ چند ایک شعراء کو چھوڑ کر جن کے  
کلام میں کوئی نیا پن نہیں باقی کے شعراء کا کلام  
متاثر کن ہے۔ نجم الاصفہاں مرحوم کی نظم ”المداری  
کا قبرستان“ ایک منفرد خیال کی خوبصورت نظم ہے  
ملاحظہ فرمائیے!

لکڑی کے تختوں پہ کتا ہیں

اس ترتیب سے جچی ہیں

یوں آپس میں جڑی ہوئی ہیں

جیسے قبرستان میں قبریں

جلدوں والی ساری کتابیں پکی قبریں

غیر جلد پکی قبریں

کچھ بہت پرانی، کچھ بے حد بوسیدہ، شکستہ

یہ مرقد ہیں ان لوگوں کے

موت کے بعد بھی جو زندہ ہیں

آخر میں محترمہ خالدہ شفیق صاحبہ کا بہت شکر یہ

جن کے توسط سے یہ خوبصورت انتخاب مجھ تک

پہنچا۔ مامون طاہر رانا کے روشن مستقبل کے لیے

بہت سی دعائیں!

☆☆☆

عائشہ عارف

## آپ کی ڈائری کے لیے

ان منتخب شہ پاروں کو آپ اپنی ڈائری میں جاسکتے ہیں

### انتخاب

#### سہارا

مرد کا مرد کو اور عورت کا عورت کو سہارا دینا بڑا ناگوار  
گزرتا ہے۔ جن لوگوں نے زندگی میں آپ کو سہارا دیا ہو  
یا پھر آپ پر احسان کیا ہو وہی آپ کو سب سے زیادہ  
برے لگتے ہیں اور آپ ان کی جان کے دشمن بن جاتے  
ہیں۔ سہارا لینے کے لیے آپ کو تشلیہ کرنا پڑتا ہے کہ آپ  
گمراہ ہیں اور آپ کو کسی کی مدد کی ضرورت ہے۔ سہارا  
دینے والا جب پہلی مرتبہ آگے بڑھ کر آپ کا ہاتھ تھامتا  
ہے تو آپ کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ ایک قوی یہکل مضبوط  
تو منہ پہلوان غم ٹھونک کر اکھاڑے میں اترتا ہے اور اس  
نے آپ کے ساتھ چبھ ملا یا ہے۔ جب وہ آپ کو سہارا  
دے کر پہلا قدم اٹھاتا ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے  
اس نے آپ کو اڑنگے پر چڑھایا اور دوسرے قدم پر پچھتی  
دے دی۔ اس سے بچنے اور شکست کھانے کے بعد آپ  
کے پاس زندہ رہنے کے لیے ایک ہی آرزو رہ جاتی ہے  
کہ کب وہ دن آئے جب میں اس کو چوڑھی پہ چڑھا کر  
اس کی طرح پچھتی دوں اور اپنی ہزیمت کا بدلہ اتار دوں۔  
سالہا سال گزرنے کے بعد جب سہارا دینے والا آپ  
کے ہاتھوں پٹتا ہے تو حیران رہ جاتا ہے کہ میرے ساتھ  
یہ سلوک؟ لیکن یہی سہارا جب انسان کو مخالف جنس سے  
ملتا ہے تو اس کی ساری عمر سہارا دینے والے ہاتھ کو چومتے  
اور اس کی گلائی سے گال رگڑتے گزرتی ہے اور اسے ہر  
گھڑی یہی خوف لگا رہتا ہے کہ یہ ہاتھ مجھے چھوڑ نہ دے  
مجھ سے دور نہ ہو جائے۔

اشفاق احمد کی تعریف ”سفر در سفر“ سے اقتباس

عمران ہارون چھوٹائی، کراچی۔

### محبت

محبت سفید لباس میں عمر و عیار ہے ہمیشہ دور انہوں پہ  
لاکھڑا کر دیتی ہے۔ اس کی راہ پر ہر جگہ راستہ دکھانے کو  
صلیب کا نشان گڑا ہوتا ہے۔ محبتی جھیلوں میں کبھی فیصلہ  
کن سزا نہیں ہوتی ہمیشہ عمر قید ہوتی ہے۔ محبت کا مزاج  
ہوا کی طرح ہے کہیں ٹکنا نہیں۔ محبت میں بیک وقت  
جوڑنے اور توڑنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ محبت ہر دن  
کے ساتھ اعادہ چاہتی ہے جب تک روز اس تصویر میں  
رنگ نہ ہو بھر، تصویر فیکٹر کرنے لگتی ہے۔ روز سورج نہ  
چڑھے تو دن نہیں ہوتا۔ جس روز محبت کا آفتاب طلوع نہ  
ہو رات رہتی ہے۔

بانو قدسیہ کی تعریف ”راجہ گدھ“ سے اقتباس  
رضونہ کوثر لاہور۔

#### پہلے نباتات، پھر حیوانات

لیعقوب اسحاق کندی خلیفہ مامون الرشید کا مقرب  
حکیم اور نجوی تھا۔ ایک دفعہ وہ مامون کے دربار میں  
حاضر ہوا اور ایک ایسی نشست پر جا بیٹھا جو عالم دین کی  
نشست سے اونچی تھی۔ یہ دیکھ کر وہ عالم ناراض ہوا اور  
کہا۔ ”تجھے یہ کیسے جرأت ہوئی کہ تو علماء کی نشستوں سے  
اونچا بیٹھے؟“

لیعقوب کندی نے ترکی یہ ترکی جواب دیا۔ ”اس  
لیے کہ جو کچھ تم جانتے ہو وہ میں بھی جانتا ہوں لیکن جو کچھ  
میں جانتا ہوں تم ہرگز نہیں جانتے۔“

عالم دین بہت ناراض ہوا اور چیلنج کرتے ہوئے  
کہا۔ ”میں کاغذ کے ایک پرزے پر کچھ لکھتا ہوں۔ اگر تو  
نے بتا دیا کہ میں نے کیا لکھا ہے تو میں تیرا قاتل ہو جاؤں

چنانچہ دونوں کے درمیان شرطیں طے ہوئیں، شرطیں یہ تھیں کہ اگر عالم دین ہار گیا تو وہ یعقوب کندی کو اپنی چادر دے گا اور اگر یعقوب کندی ہار گیا تو وہ عالم کو اپنا خنجر اور زین دے گا۔ چنانچہ عالم دین نے قلم دان منگایا اور کاغذ پر کچھ لکھ کر اسے خلیفہ کے قاتلین کے پیچھے رکھ دیا اور بولا۔ ”بنا میں نے کیا لکھا ہے؟“

یعقوب کندی نے کاغذ منگایا اور اس پر زانچہ بنا کر حساب لگایا پھر بولا۔ ”اس کاغذ پر ایک ایسی شے کا نام ہے جو پہلے بنانا تھا میں بھی بعد میں حیاں ہو گئی۔“ اور جب مامون الرشید کے حکم سے کاغذ کا پرزہ کھولا گیا تو اس پر لکھا تھا۔ ”عصائے موسیٰ“ اس پر ہر کوئی حیران تھا کیونکہ عصائے موسیٰ پہلے لکڑی تھا پھر ججزے سے اڑا ہوا بن گیا۔ دربار میں دیئے تو ہر کوئی انتہائی حیران تھا لیکن جو سب سے زیادہ حیران تھا وہ مامون الرشید تھا۔ نظامی عروضی کی تصنیف ”چہار مقالہ“ سے اقتباس۔ عزیز جی آ۔ چکوال۔

### فارمولے

آپ تو بے حد پریکٹیکل انسان ہیں، پہلے میٹرک کیا چونکہ میٹرک کر چکے ہیں اس لیے بی اے کرنا پڑا اور پھر ایم اے۔ ایم اے کر چکے اس لیے ملازمت کرنا پڑی چونکہ ملازم ہو گئے تھے اس لیے شادی کرنا پڑی۔ شادی سے پہلے کسی حینہ سے محبت کرنے کا خیال آیا پھر سوچا کہ محبت میں بار بار بیان دینا پڑتا ہے کہ پہلی دفعہ کھال ہوا ہوں اور زندگی بھر کی اور پر عاشق نہیں ہوں گا اور جو کہیں محبوب سے شادی ہو جائے تو عمر بھر لگا کر محبت جتنا پڑنی ہے، جھولی قسمیں کھانی پڑنی ہیں۔ 87ء میں پچیس برس کے تھے۔ کاغذ پھیل لے کر حساب لگایا کہ اگلے تین برس میں دولڑکوں اور لڑکے کے باپ بن گئے۔ 2007ء تک (جب آپ پچیس برس کے ہو کر ملازمت سے ریٹائر ہوئے گئے) لڑکی کی شادی ہو چکی ہوگی اور دونوں لڑکے تعلیم سے فارغ ہوں گے۔ 90ء تک کوئی اولاد نہ ہوئی تو آپ کو دوبارہ حساب لگا کر دوبارہ شادی کرنی پڑنی۔ 87ء میں یہ پوزیشن تھی۔

دوسری بیوی..... چار بچے

پہلی بیوی سے..... چھ بچے

میزان..... دس لڑکیاں  
بڑے چوکے اور چست انسان ہیں خیالات سے زیادہ عمل پر یقین رکھتے ہیں۔ ہر وقت مائل بہ عمل رہتے ہیں۔ جب تک خود نہ دیکھ لیں کسی چیز کا یقین نہیں کرتے چونکہ خداوند کو نہیں دیکھ سکتے اس لیے کبھی کبھی دہریے بن جاتے ہیں مگر پھر حساب لگا کر ایمان لے آتے ہیں۔ ہر کام فارمولوں کے مطابق کرتے ہیں۔  
شفیق الرحمان کی تصنیف ”موشگافیاں“ سے اقتباس۔  
نعیم آکاش، حیدر آباد۔

### افشانی ہفت روزہ

### حدیث کہاو تیں

☆ ہر عورت گھر کی مالکن اس وقت ہوتی ہے جب اسے یہ احساس نہ ہو کہ وہ پرانے گھر میں ہے۔ (پاکستانی کہادت)  
☆ طنز کی روٹی بوی سخت ہوتی ہے اسے کھانے کے لیے لوہے کے دانے چاہئیں۔ (ایرانی کہادت)  
☆ دنیا کے کسی سمندر میں اتنا پانی نہیں جتنا کہ عورت کی آنکھوں میں ہے۔ (نیپالی کہادت)  
☆ محبت جذبات کا وہ سمندر ہے جسے چاروں طرف سے اخراجات نے گھیر رکھا ہے۔ (بھارتی کہادت)  
☆ مہندی لگے ہاتھ اکثر مردوں کو بگڑنے سے روکنے کا سبب بنتے ہیں۔ (بنگلہ دیشی کہادت)  
☆ عورت جتنی حفاظت اپنے زیور کی ناگین بن کر کرتی ہے اتنی اگر اپنے شوہر کی بھی کرے تو کبھی بھی گھریلو جھگڑے نہ ہوں۔ (امریکی کہادت)  
☆ اچھا میزبان وہ ہے جس کے ہاں مہمان کو یہ محسوس نہ ہو کہ وہ خود اپنے گھر میں موجود ہے۔ (رومی کہادت)  
☆ دنیا کی کوئی بھی بد صورت عورت دوسری عورت کو خود سے حسین نہیں سمجھتی۔ (فرانسیسی کہادت)  
☆ اندھا اگر عقل مند ہوگا تو وہ ریوڑیاں بانٹنے کی حماقت نہیں کرے گا۔ (امریکی کہادت)  
☆ چالو سی کا ترکا لگانے میں جسے مہارت حاصل

ہوگی، وہ کبھی بھی ناکامی کا منہ نہیں دیکھے گا۔ (افریقی کہادت)  
☆ عورت، عورت کے بارے میں جتنا جاننے کی فکر میں ڈوبی بلکہ غرق رہتی ہے اتنا تو مرد بھی عورت کے بارے میں پریشان نہیں رہتا۔ (ایتھینی کہادت)  
☆ مرسلہ۔ ارم راد پلندی۔

### مسکراہٹ

☆ خوش گوار زندگی گزارنے اور زندگی کی رنگینیوں سے لطف اندوز ہونے کے لیے مسکراہٹ ایک اہم کردار ادا کرتی ہے۔  
☆ مسکراہٹ انسان کی شخصیت کا ایک اہم جزو ہے۔  
☆ مسکراہٹ خدا کا عطیہ ہے اور حسن اخلاق ایک اچھی خوبی ہے۔  
☆ دوستوں کو اپنا گرویدہ بنانے کے لیے مسکراہٹ کو اپنائے۔

☆ اگر آپ کسی کے دکھ درد نہ بانٹ سکتے ہوں تو مسکراتے ہوئے پہلی کے دیوول کہہ دیں یہ کسی کے لیے سکون کا باعث بن سکتے ہیں۔  
☆ مرسلہ۔ کول عمران خان۔ کراچی۔

### افسوس باتیں

☆ محبت ہمیشہ ایک نظر کی ہوتی ہے، ہو سکتا ہے آپ برسوں کی کو جاننے ہوں مگر محبت کا ادراک ایک لمحے میں ہوتا ہے۔  
☆ محبت کے سودے میں عورت ہمیشہ گھائے میں رہتی ہے، مٹ جاتی ہے، فنا ہو جاتی ہے۔ اس راستے پر بڑی دور تک نکل جاتی ہے فائدہ تو مرد کا ہوتا ہے جہاں سے چلتا ہے وہیں واپس آ جاتا ہے۔  
☆ محبت کا اظہار ضروری ہوتا ہے رشتوں کو مضبوط کرنے، بنانے کے لیے انہیں مضبوط کرنے کے لیے چاہے وہ اظہار لفظوں سے ہو یا عمل سے محبت اظہار نہ بنے تو محبوب کی امانت بن جاتی ہے۔  
☆ اگر تمہاری کھوئی ہوئی چیز تمہارے دوست کو مل گئی ہو تو اسے کھویا ہوا محسوس نہ کرو۔  
☆ دوسروں کا بھلا کرتے وقت یہ یقین رکھو کہ تم اپنا

بھلا کر رہے ہو۔

☆ اگر کسی کو کچھ دینا چاہتے ہو تو مسکراہٹ دو۔  
☆ موت کے درد کا اگر ایک قطرہ دنیا کے تمام پہاڑوں پر رکھ دیا جائے تو وہ پگھل جائیں گے۔  
☆ موت کو یاد رکھنا نفس کی تمام بیماریوں کا علاج ہے۔  
☆ محبت اگر بے وفا بن جائے تو آنسو مقدر بن جاتے ہیں۔  
☆ زندگی میں کسی کو اتنا مت چاہو کہ تم اس کی جدائی برداشت نہ کر سکو۔  
☆ انسان زندہ ہونے کے باوجود زندگی کو نہیں سمجھتے وہ مرے بغیر موت کو کیسے سمجھ سکتے ہیں۔  
☆ ہم کہتے ہیں کہ ہمیں خالص و پاکیزہ محبت چاہیے۔ کیا ہم نے کبھی یہ سوچا ہے کہ ہم سے بھی کسی کو خالص محبت کی چاہ ہو سکتی ہے؟  
☆ مرسلہ۔ ثانیہ بھٹی۔ سیالکوٹ۔

### یاد رکھنے والی باتیں

☆ اگر تم نے دل میں نیکی کا ارادہ کیا ہو اور تمہیں موت آ جائے تو خدا پھر بھی تمہیں اُس نیکی کا اجر دے گا۔  
☆ جو منزل جتنی زیادہ محنت و مشکلات کے بعد ملتی ہے وہ اتنی ہی زیادہ بر سکون ہوتی ہے۔  
☆ لوگ رات کو سوتے وقت گھر کے دروازوں کو تالے لگا دیتے ہیں لیکن ان احمقوں کو کون سمجھائے کہ چور دروازہ کھٹکھٹا کر نہیں آتے۔  
☆ مرسلہ۔ معظم الہی۔ لاہور۔

### محبت مضامین کی روسے

☆ اسلامیات۔ ہر ایک سے محبت بے غرض عبادت ہے۔  
☆ اردو۔ محبت بے وفاؤں کا کھیل ہے۔  
☆ حساب۔ خوشی + غم کا نام = محبت۔  
☆ فزکس۔ دونوں کے درمیان قوت کشش پیدا کرتی ہے۔  
☆ کیمسٹری۔ محبت دلوں کی بوئنگ کا نام ہے۔  
☆ جیولوجی۔ محبت شرگ کی مانند ہے جس کا تعلق براہ راست دل سے ہے۔



ہائی۔ محبت ایک ایسا خود رو پودا ہے جو دن بہ دن  
بڑھتا چلا جاتا ہے، کبھی نہیں مرجھتا۔

انگلش۔ Love is ever lasting.

مرسلہ۔ شریل اقدس۔ چیک آباد۔

### خوشبو بھری باتیں

☆ ہماری مسکراہٹ کا تعلق قسمت سے ہے جب  
قسمت مسکرائی ہے تو ہم مسکراتے ہیں۔

☆ زندگی اس جزیرے کی مانند ہے جہاں خوابوں  
اور عذابوں کے بہت سے درخت ہوتے ہیں لیکن دھوپ  
لگے تو یہ سارے اور بھوک لگے تو پھل نہیں دیتے۔

☆ عقل مند اپنے آپ کو پست کر کے بلندی  
حاصل کرتا ہے اور نادان اپنے آپ کو بڑھا کر ذلت  
اٹھاتا ہے۔

☆ آپ اگر دیکھنا چاہیں تو زندگی میں سرزد ہونے  
والی ہر غلطی آپ کو کوئی نہ کوئی سبق دیتی ہے۔

☆ اپنے عمل کی یاد کو ایک برا لفظ ہمیشہ کے لیے تباہ  
کر سکتا ہے۔

☆ غلطی کی تعریف یہ ہے کہ وہ آپ کے ساتھ خود  
سے زیادہ مہربان ہو۔

☆ زندگی کے جواز تلاش نہیں کیے جاتے، صرف  
زندہ رہا جاتا ہے۔ زندگی گزارتے چلے جاؤ جواز از خود  
مل جائے گا۔

مرسلہ۔ نفیسہ فضل۔ کراچی۔

### سنہرے موتی

☆ زندگی کا مقصد مسرت نہیں بلکہ تکمیل انسانیت  
ہے۔

☆ خوبصورتی دوسروں کے چہروں پر نہیں اپنی  
آنکھوں میں ہوتی ہے۔

☆ جس گھر میں کوئی بزرگ نہ ہو وہاں سے ادب و  
اجترام ختم ہو جاتا ہے۔

☆ بہترین دوست وہ ہے جو نیکی کی طرف بلائے۔  
بدترین دوست وہ ہے جو برائی کی طرف بلائے۔

☆ اگر تم جاننا چاہتے ہو کہ تمہارا رب تم سے کتنی  
محبت کرتا ہے تو اس کے قریب آ کر دیکھو تمہیں خود  
اندازہ ہو جائے گا۔

☆ موتی کچڑ میں گرنے پر بھی دیا ہی چمک  
رہتا ہے اس لیے اچھی بات کہنے والا چاہے برا آدمی  
کیوں نہ ہو اسے غور سے سنو۔

☆ جھوٹ بول کر جیت جانے سے بہتر ہے کہ جھج  
بول کر ہار جاؤ۔

مرسلہ۔ سدرہ انور علی۔ جھنگ۔

### ڈرا جسٹکل آفتیے

☆ کھٹی میٹھی گولیاں

س۔ کپیوٹر کو دیکھ کر کون سا شعور ذہن میں آتا ہے؟  
ج۔ جن پتھروں کو ہم نے عطا کی تھیں دھڑکنیں  
ان کو زباں ملی تو ہم ہی یہ برس پڑے

س۔ آج کل بہرہ کسے کہتے ہیں؟  
ج۔ جو صرف مطلب کی بات سنے۔

س۔ اگر کوئی کہے کہ آسمان سے تارے توڑ کر لا دو  
تو؟  
ج۔ سمجھ لینا چاہیے کہ وہ آپ سے جان چھڑا  
رہا ہے۔

س۔ سب سے خوب صورت اور دل پسند تصویر؟  
ج۔ قائد اعظم محمد علی جناح کی وہ بھی نوٹ والی کیا  
سمجھے؟

س۔ شاپنگ بیگ کس نے ایجاد کیا؟  
ج۔ جس کے گھر دودھ لانے کے لیے برتن نہیں تھا۔

مرسلہ۔ ریاض بٹ۔ حسن ابدال۔

### ذہانت

☆ ایک فرم کے مینیجر صاحب ایک دن بہت خوش خوش  
اپنے مکان میں داخل ہوئے اور انہوں نے اپنی بیگم سے

کہا۔ ”پیاری جانتی ہو مجھے ایک بات سوجھی ہے جس  
سے فرم کو ہر ماہ ڈھائی تین لاکھ روپے کی بچت ہوگی۔“

”اجی رہے بھی دو میں سمجھ کی بہت ذہین ہوں۔“  
بیگم نے کہا۔

”کیا سمجھ گئی؟“ انہوں نے حیرت سے پوچھا۔  
”یہی کہ تم اسٹعفی دینے والے ہو۔“ بیگم نے

اطمینان سے جواب دیا۔  
مرسلہ۔ محمد عاصم صدیقی، کراچی۔

### ہری مرچیں

☆ کیا تمہارے والد کے انتقال کے وقت ان کی  
جسمانی اور ذہنی حالت بالکل ٹھیک تھی؟

☆ یہ تو صبح ہی پتا چلے گا، صبح ان کا وصیت نامہ پڑھا  
جائے گا۔

☆ خدا کی پناہ..... ان دونوں لڑکیوں میں کس قدر  
مشابہت ہے۔ کیا یہ دونوں جڑواں بہنیں ہیں؟

☆ نہیں! اتفاق سے یہ دونوں ایک ہی سرجن سے  
پلاسٹک سرجری کرا چکی ہیں۔

مرسلہ۔ عتی خان اسلام آباد۔

### قابلیت

☆ ایک صاحب نے ایک جگہ مجمع لگا دیکھا تو تجسس  
کے تحت قریب چا پہنچے۔ انہوں نے دیکھا کہ دیہاتوں

جیسے طیلے اور بے وقف سادکھائی دینے والا ایک شخص مجمع  
کو اپنے کتے کے کرتب دکھا رہا تھا جو واقعی حیرت انگیز

تھے اور لوگ ان سے بہت لطف اندوز ہو رہے تھے۔  
مجمع چھٹنے کے بعد وہ صاحب اس شخص کے پاس

پہنچے اور حیرت سے بولے۔ ”بھئی! تم نے اپنے کتے کو  
اتنے کرتب کیسے سکھا دیے؟ میں نے تو اپنے کتے کے

ساتھ بڑی مغز ماری کی میں تو اسے ایک کرتب بھی نہ سکھا  
سکا؟“

”سیدھی سی بات ہے.....“ سیدھے سادے شخص  
نے جواب دیا۔ ”کتے کو کرتب سکھانے کے لیے ضروری

ہے کہ آپ کو کتے سے زیادہ کرتب آتے ہوں۔“  
مرسلہ۔ کینز فاطمہ جھنگ۔

### تفریح

☆ ایک سفری سٹیزمین کاروباری دورے پر تھا۔ راستے  
میں اسے ایک گاؤں میں رکنا پڑا۔ کام سے فارغ ہو کر

شام کو اس نے سوچا کہ کچھ تفریح کی جائے۔ اس نے  
چائے خانے میں جا کر ایک مقامی دیہاتی سے پوچھا۔

”یہاں کوئی سنیما ہے؟“  
”نہیں.....“ دیہاتی نے جواب دیا۔

”کوئی تھیٹر ہال وغیرہ ہے جہاں جا کر آدی کوئی  
ڈراما یا شو وغیرہ دیکھ سکے؟“

”نہیں جناب.....“ دیہاتی نے نفی میں سر ہلایا۔  
”حیرت ہے پھر تم لوگ تفریح کیسے کرتے ہو؟“  
شہری سٹیزمین نے پوچھا۔

”بس جی یہاں اس چائے خانے میں بیٹھ جاتے  
ہیں، یہاں کوئی نہ کوئی شہری بابو آ کر بیٹھا ہوتا ہے۔ ہم

اسے دیکھتے ہیں اس کے بارے میں سرگوشیوں میں  
باتیں کرتے ہیں اور گالیاں دیتے ہیں، بس یہی ہماری

تفریح ہے۔“  
مرسلہ۔ ظہیر احمد۔ حیدر آباد۔

### تائید

☆ سیٹھ صاحب لندن کی سیر کو گئے ہوئے تھے۔ ان کی  
فرمائش تھی کہ انہیں پرانی چیزیں اور تاریخی عمارات بھی

دکھائی جائیں۔ گائیڈ ایک روز انہیں تاریخی بحری جہاز  
’کوسٹری‘ دکھانے لے گیا۔ لارڈ ٹیلن نے اس جہاز کے

ذریعے کئی جنگیں جیتی تھیں۔ بحری جہاز کی سیر  
کراتے ہوئے گائیڈ عرصے پر نصب پیتل کی ایک توپ

کے پاس رکا اور قدرے غم زدہ لہجے میں بولا۔ ”اور سرب  
ہے وہ جگہ جہاں گر لارڈ ٹیلن نے جان دی تھی۔“

”واقعی یہ توپ بڑے خطرناک اور بے ہودہ انداز  
میں بچے راستے میں لٹائی گئی ہے۔“ سیٹھ صاحب میز سے

دور بیٹھ ہوئے بولے۔ ”میں خود اس سے ٹکرا کر گرنے لگا  
تھا۔“

مرسلہ۔ محمد فہیم، کراچی۔

### ترجیح

☆ ٹریول ایجنٹ ایک بے علم کروڑ پتی کو سیر کے لیے  
یونان جانے کا مشورہ دے رہے تھے۔ ایک ٹریول ایجنٹ

بولا۔ ”سردہاں آپ کو پرانے کھنڈر دیکھنے کو گیلے گے۔“  
وہ صاحب ٹی میں سر ہلاتے ہوئے بولے۔ ”میں

نئے کھنڈر دیکھنے کے لیے فراس جانا پسند کروں گا۔“  
مرسلہ۔ اکرم خان، کوئٹہ۔

### حادثہ

☆ ایک صاحب نے انٹرنس ایجنٹ کی بے پناہ  
کوششوں کے بعد آخر کار ایک انٹرنس پالیسی خرید لی۔

انٹرنس ایجنٹ ان کے کاغذات تیار کر رہا تھا۔ ایک فارم  
میں

کی خانہ بیری کرتے ہوئے ایجنٹ نے پوچھا۔ ”آپ کو زندگی میں بھی کوئی حادثہ پیش آیا؟“

”نہیں.....“ ان صاحب نے جواب دیا۔

”واقعی؟“ ایجنٹ نے حیرت اور بے یقینی سے کہا۔

”کیا آپ کو زندگی میں بھی کوئی حادثہ پیش نہیں آیا؟“

”نہیں البتہ ایک مرتبہ ایک سانپ نے مجھے کاٹ لیا تھا۔“ انہوں نے بتایا۔

”تو کیا آپ اسے حادثہ شمار نہیں کرتے؟“ ایجنٹ نے دریافت کیا۔

”نہیں“ یہ حادثہ کیسے ہو سکتا ہے؟ سانپ نے جان بوجھ کر مجھے کاٹا تھا۔“ ان صاحب نے جواب دیا۔

مرسلہ۔ نصیر احمد حیدر آباد۔

### بزمِ آرائی

☆

وہی حساب تمنا ہے اب بھی آجاؤ  
وہی ہے سر وہی سودا ہے اب بھی آجاؤ  
میں خود نہیں ہوں کوئی اور ہے مرے اندر  
جو تم کو اب بھی ترستا ہے اب بھی آجاؤ  
میں یاں سے جانے ہی والا ہوں اب مگر اب تک  
وہی ہے گھر وہی حجرہ ہے اب بھی آجاؤ  
وہی کشاکش احساس ہے یہ ہر لمحہ  
وہی ہے دل وہی دنیا ہے اب بھی آجاؤ  
تمہیں تھا ناز بہت جس کی نام داری پر  
وہ سارے شہر میں رسوا ہے اب بھی آجاؤ  
کسی سے کوئی بھی شکوہ نہیں مگر تم سے  
ابھی تلک مجھے شکوہ ہے اب بھی آجاؤ  
وجود ایک تماشہ تھا ہم جو دیکھتے تھے  
وہ اب بھی ایک تماشہ ہے اب بھی آجاؤ  
وہ جون کون ہے جانے جو کچھ نہیں سنتا  
ہے جانے کون جو کہتا ہے اب بھی آجاؤ؟

(جون ایلیا)

حسن انتخاب۔ رضوانہ کوثر لاہور۔

☆

یہ سچ ہے ان سے نگاہیں کبھی ملا نہ سکے  
ہم ان کی یاد کو لیکن کبھی بھلا نہ سکے  
وہ بد نصیب سہی تجھ سے جو قریب نہیں  
وہ خوش نصیب ہیں جو تم سے دور جانے سکے  
چنگ کے چاندنی اس حسن کو پہنچ نہ سکے  
نکھر کے پھول بھی اس کا شائبہ لانا نہ سکے  
بہ قیدم بھی وہ آنسو خوشی کے قاصد ہیں  
جو ان کی دید کے دوران ہم چھپا نہ سکے  
ہزار گردشِ دوراں کے ساتھ تھکیل سکے  
مگر تمہاری نظر کا مزاج پا نہ سکے  
جھک جھک کے نظر ان کی دل تک آ پہنچی  
یہ سنا ہے کہ منزل جسے بھلا نہ سکے  
مٹھنسی کھی ملاقات میں مگر نازش  
یہ مصلحت بھی کہ ہم دونوں مسکرا نہ سکے

(نازش حیدری دہلوی)

حسن انتخاب۔ آصف زیدی کراچی۔

☆

کہنے کو میرا اس سے کوئی واسطہ نہیں  
امجد مگر وہ شخص مجھے بھولتا نہیں  
ڈرتا ہوں آنکھ کھولوں تو منظر بدل نہ جائے  
میں جاگ تو رہا ہوں مگر جاگتا نہیں  
آتش کی اس کی اسے بے وفا نہ جان  
عادت کی بات اور ہے دل کا برا نہیں  
تہا اداس چاند کو سمجھو نہ بے خبر  
ہر بات سن رہا ہے مگر بولتا نہیں  
خاموش رت جگوں کا دھواں تھا چاروں  
نکلا کب آفتاب مجھے تو پتا نہیں  
امجد وہ آنکھیں جھیل سی گہری تو ہیں مگر  
ان میں کوئی بھی عکس مرے نام کا نہیں

(امجد اسلام امجد)

حسن انتخاب۔ رونی ناز۔ نوشہرہ۔

☆

چاہت کی راہ گزر میں تجارت نہیں کرو  
ایسا ہی شوق ہے تو محبت نہیں کرو  
جب دل سے ہر قصور کو تسلیم کر لیا  
لفظوں میں بار بار وضاحت نہیں کرو  
سانس نہ میری قید کرو سود کے عوض  
مجھ سے وصول جینے کی قیمت نہیں کرو  
نقشہ میرے بزرگوں نے اس کا بنایا ہے  
تقسیم بامِ درد کی یہ جنت نہیں کرو  
اک آخری پناہ تو رہنے دو میرے پاس  
مجھ سے جدا یہ گھر یہ میری جنت نہیں کرو  
تم زر خرید منصف و عادل ہو اس لیے  
میرے معاملے کی سماعت نہیں کرو

(اعتبار ساجد)

حسن انتخاب۔ ثاقب عباس بھکر۔

☆

لوگ حیراں تھے جھکا مرا سر دیکھ کر  
چل رہا تھا میں زمیں پر دیکھ کر  
نفس کی ہونٹوں پہ جم کر رہ گئی  
بند ٹھٹھی میں سمندر دیکھ کر  
کیوں نہ زخمی ہو بدن احساس کر  
ماں کے سر پر میلی چادر دیکھ کر  
جانے کن خوابوں میں کھو جاتا ہوں میں  
آئینے میں خود کو اکثر دیکھ کر  
مٹ گیا احساس تنہائی کا اب  
سائے کو قد کے برابر دیکھ کر  
ہے مزاج اس کا بھی موسم کی طرح  
بات کرنا اس کے تیور دیکھ کر  
یاد تو آیا بہت عارف تحقیق  
ڈار سے پچھڑا کیوڑ دیکھ کر

(عارف شفیق)

حسن انتخاب۔ فیصل عزیز۔ حیدر آباد۔

### اعتراف

بھولتا کون ہے  
وقت کے گھاؤ کو  
ہجر کے تند طوفان میں  
وصل کے خواب کی بے یقین لہر میں  
ذوقِ ناؤ کو  
بھولتا کون ہے  
اپنے قاتل کے قاتلِ خدو خال کو  
دکھاٹھاتے دنوں، مہِ سال کو  
بھولتا کون ہے  
عمر کی شاخ پر کھلنے والی اس کی اولیں شام کو  
بے سبب جو لگے ہر الزام کو  
پھر ترے نام کو  
بھولتا کون ہے

(نوشتی گیلانی)

ناصر سلیم گل آباد خانوالہ۔

### محبت کی طبیعت

محبت کی طبیعت میں یہ کیسا بچپنا قدرت نے رکھا ہے  
کہ جتنی بھی پرانی، جتنی بھی مضبوط ہو جائے  
اسے تانید تازہ کی ضرورت پھر بھی رہتی ہے  
یقین کی آخری حد تک دلوں میں لہلہاتی ہو  
لگا ہوں سے لپکتی ہو لہو میں جگمگاتی ہو  
ہزاروں طرح کے دلکش حسین ہالے بناتی ہو  
اسے اظہار کے لفظوں کی حاجت پھر بھی رہتی ہو  
محبت مانگتی ہے یوں گواہی اپنے ہونے کی  
کہ جیسے طفلِ سادہ شام میں اک سچ بوئے  
اور شب میں بارہا اٹھے  
زمین کو کھود کر دیکھے کہ پودا اب  
کہاں تک ہے؟



محبت کی طبیعت میں عجب گمراہی ہوگی  
کہ یہ انتظار کے لفظوں کو سننے سے نہیں ٹھکتی  
پھٹنے کی کوئی گھڑی ہو یا ملنے کی ساعت ہو  
اسے بس ایک ہی دھن ہے  
کہو مجھ سے محبت ہے  
کہو مجھ سے محبت ہے

(امجد اسلام امجد)  
حسن انتخاب۔ راجیہ خان کراچی۔

### محبت یوں نہیں اچھی

کوئی وعدہ نہیں ہم میں  
نہ آپس میں بہت باتیں  
نہ ملنے میں بہت شوشی  
نہ آخر شب منا جاتیں  
گمراہ کہی کی ہے  
جو ہم دونوں سمجھتے ہیں  
عجب اک سرخوشی سی ہے  
یہ سارے دل رہا منظر طلسمی چاندنی راتیں  
سنہری دھوپ کا منظر یا ہلکے سکہ کی برساتیں  
سبھی اک ضد میں رہتے ہیں  
مجھے یہ ہم کہتے ہیں  
'محبت یوں نہیں اچھی'

(طاہر محمود)  
حسن انتخاب۔ رابع۔ کوئٹہ۔

### محبت کم نہیں ہوگی

تمہاری تلخیوں سے  
اور تمہارے ناتراشیدہ رویوں سے  
تمہاری چھوٹی چھوٹی رنجشوں سے  
اور بڑی ناراضگی سے بھی  
محبت کم نہیں ہوگی  
تمہاری شہر بھر سے دل لگائے کی عادت سے  
تمہاری بے وفائی سے  
تمہاری بے حس سے بھی

محبت کم نہیں ہوگی  
انا کا درمیاں آکر  
کئی بے ساختہ جذبہ پا چاک مار جانے سے  
دلوں کو ذات پر سے وار جانے سے  
کسی وادی میں جا بنے  
کسی صحرا میں رست بھول جانے  
یا سمندر پار جانے سے  
محبت کم نہیں ہوگی  
کسی کے جیت جانے سے کسی کے ہار جانے سے  
محبت کم نہیں ہوگی

(فرحت عباس شاہ)  
حسن انتخاب۔ اشعر جواڑی کراچی۔

### جب ادا اس ہوتی ہو

تم بھی کیا عجیب سی لڑکی ہو  
بات بھی نہیں ہوتی  
اور روٹھ جاتی ہو  
گہری گہری آنکھوں سے  
تم جو حرف بتاتی ہو  
دل پہ لکھ بھی دیتی ہو  
اور سنہری زلفوں کو  
جیئیں پر بکھرا کر تم جب اداس ہوتی ہو  
ہے قسم تیری جاناں مجھ کو ماری دیتی ہو

(ثناء اللہ شاہ)  
حسن انتخاب۔ ارم بخاری، جھنگ۔

### الجبہ

تیرا میرا رشتہ کچھ ایسا الجھا ہے  
اس کو سلجھاتے سلجھاتے  
اپنے دل کی پوری زخمی کر بیٹھا ہوں  
رشتہ شاید سلجھ نہ پائے  
لیکن اس کو سلجھانے کی دھن میں جاناں  
سارے خواب بھلا بیٹھا ہوں  
اپنا آپ گنوا بیٹھا ہوں

(وسی شاہ)  
حسن انتخاب۔ ممتاز احمد سرگودھا۔

### خیال آزادی

جی کہانیاں کے فانیں اور لکھا یوں کی سچ و خیال کا عکس بصورت تحریر

### بدگمانی

صنم ناز۔ گوجرانوالہ۔

کبھی دل میں بدگمانی کو جبکہ مت دو کیونکہ بدگمانی اور آپ سے منسلک وہ رشتے جو آپ کے لیے آکسیجن کا کام کرتے ہیں آپ کے دل میں اکٹھے نہیں رہ سکتے۔ بدگمانی رشتوں میں دراڑیں ڈال دیتی ہے۔ بدگمانی ہمارے دل کا ایسا مرض ہے جو تیزی سے ہمارے اندر جڑ پکڑتا ہے اور دل میں موجود محبت کے جذبات کو نفرت کے زہر سے آلودہ کر دیتا ہے۔ بدگمانی کو اپنے دل سے فوراً نکال لیں اس سے پہلے کہ آپ کے مخلص رشتے آپ سے دور ہو جائیں۔

### نیکی کا صلہ

عبدالعزیز جی آ، چکوال۔

یہ 2010ء کی بات ہے میں اُن دنوں روات کے قریب کلر سیدیاں روڈ پر عباس اکرام CNG اسٹیشن پر مشین آپر بیٹھا تھا۔ نماز فجر سے فارغ ہو کر میں حسب معمول ہر روز کلر سیدیاں روڈ پر تقریباً ایک کلومیٹر داک کرتے ہوئے کھلی آب و ہوا کی تازگی کے مزے لیتا۔ اڑتے پرندوں کی والہانہ پروازیں اور اللہ پاک کی ثناء بیان کرتے پرندوں کی خوبصورت آوازیں میرے دل کو بہت سُرور بخشیں۔ سامنے کوہ مری کی پہاڑیوں سے آنے والی ٹھنڈی ہوائیں اکثر اپنے ساتھ مون سون کی بارشیں لے آتیں تو موسم اور دلکش ہو جاتا۔ اُس روز داک سے واپس لوٹا تو کلک بابا ٹمبل پر ناشا لگا چکا تھا۔ کیشیر عنصر اور دو فلر لڑکے میرا ہی انتظار کر رہے تھے۔ ناشا کرنے کے بعد تازہ اخبار کی موٹی موٹی سرخیاں پڑھ رہا تھا کہ پمپ پر جھاڑو دینے والے خا کر وب شہزاد مسج نے دروازے پر آ کر مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”سر جی، پلیز ایک منٹ۔“ وہ مجھے ہاتھ کے اشارے سے باہر بلا رہا تھا۔ میں باہر گیا تو دیکھا اس کے ساتھ تیس سال کا ایک شخص بھی تھا جو چہرے سے بہت پریشان لگ رہا تھا۔ وہ ایک سائیڈ پر کھڑا ہو کر کہنے لگا۔ ”سر جی، یہ بندہ ڈرائیور ہے اور اسی پمپ سے اپنی گاڑی میں سی این جی بھرواتا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”چہرہ جانا پچھانا لگتا ہے۔ بتاؤ مسئلہ کیا ہے؟“ ”سر جی، مسئلہ یہ ہے اب سے کچھ دیر پہلے وہ سامنے واش روم میں یہ شخص اندر فلکیش ٹینگی پر اپنا پرس رکھ کر بھول گیا ہے۔ سر میں نے دیکھا ہے دو پٹھان لڑکے بھی واش روم میں گئے اور آپ کا چکر بھی لگا تھا۔ سر یہ شخص بہت پریشان ہے اس کے پرس میں آٹھ ہزار روپيا تھا۔ اس شخص کو پریشان دیکھ کر میں دنگی ہو گیا، اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اس کا پرس تو میرے پاس ہے۔“ میرا اتنا کہنا تھا کہ اس غریب ڈرائیور کا دھواں دار چہرہ ایک دم گلاب کی طرح کھل اٹھا۔ وہ خوشی سے دیوانہ وار مجھ سے لپٹ گیا۔ ”آؤ میرے ساتھ۔“ میں نے اپنے کمرے میں پہنچ کر اپنے بیڈ کے تنیکے کے نیچے سے پرس نکال کر جب اُسے تھمایا تو وہ خوشی سے رو پڑا۔ میں نے کہا۔ ”بھائی، صرف شاختی کارڈ چیک کرنے کے لیے اسے کھول کر دیکھا ہے کہ اتنا پتا معلوم ہوتا کہ پرس مالک تک پہنچایا جائے۔ رقم کتنی ہے یہ میں نے نہیں گئی۔ پلیز آپ گن لیں۔“ کہنے لگا۔ ”سر جی، رقم پوری



ہی ہوگی۔“ میں نے کہا۔ ”نہیں“ پہلے گنو۔“ اس نے رقم گن کر تسلی کر لی اور پرس میرے سامنے کر دیا اور بولا۔ ”اس میں سے آپ جتنا چاہیں انعام رکھ لیں۔“ میں نے کہا۔ ”بھائی“ آپ اپنی امانت سنبھالیں۔ مجھے انعام وہ دے گا۔“ میں نے شہادت کی انگلی سے آسان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پورے یقین سے کہا تو میری آنکھیں نم ہو گئیں۔ وہ خوشی خوشی چلا گیا اور پھر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ اللہ نے مجھے واقعی انعام سے نوازا۔ مجھے ایک سرکاری ادارے میں کچی نوکری مل گئی۔ اب پچھلے اڑھائی سال سے لاہور میں جاب کر رہا ہوں۔ بے شک اللہ نیک کام کا صلہ ضرور دیتا ہے۔

## انسان سخت جان

رضوانہ کوثر لاہور۔

انسان سے زیادہ سخت جان واقعی کوئی شے نہیں۔ ہم جن باتوں کا تصور کر کے ہی لرز اٹھتے ہیں وہ حالات جب ہم پر وارد ہوتے ہیں تو ہم سبہ بھی جانتے ہیں جن جاناکاہ صدموں کے تصور ہی سے مر مر جاتے ہیں ان کے جھیل جانے کے باوجود زندہ رہتے ہیں۔ ٹوٹ پھوٹ کر بھی نہیں بکھرتے۔ ریڑھ ریڑھ ہو کر بھی صبح و سالم نظر آتے ہیں۔ شاید یہی معراج انسانیت ہے۔

## یہ تضاد کیوں؟

ممتاز احمد مٹھیاٹ ٹاؤن سرگودھا۔

آج کل عجیب ٹرینڈ چل نکلا ہے کہ لوگ موبائل فون پر دوسروں کو مختلف سیاسی میسجز شاعری بے ہودہ لطیفہ و اہیات قسم کے غیر اخلاقی مزاحیہ اور گھٹیا فقرہوں پر مشتمل پیغامات بڑی باقاعدگی سے بھیجتے ہیں اور تو اور کچھ مذہبی پیغام ایسے بھی ہوتے ہیں جن کو اللہ اور قرآن وحدیث سے منسوب کیا جاتا ہے مگر تحقیق کرنے پر پتا چلتا ہے کہ یہ بات نہ قرآن پاک میں ہے اور نہ ہی کسی حدیث مبارکہ سے ثابت ہے۔ یہ کتنا بڑا ظلم ہے ادبی گستاخی اور المیہ ہے۔ میں حیران ہوتا ہوں کہ اس طرح کے پیغامات بھیج کر لوگ کیا سمجھتے ہیں کہ وہ لوگ کوئی نیکی یا خدمت خلق کا کام کرتے ہیں؟ سب سے زیادہ دکھ کی بات یہ ہے کہ اکثریت میں ایسے لوگوں کی زندگیاں ان پیغامات کے برعکس ہوتی ہیں مثلاً وہ لوگ سچ بولنے، رزق حلال کی تاکید اور تلقین کرتے ہیں مگر خود عمل نہیں کرتے۔ اسی طرح بہت سے لوگ باقاعدگی سے دوسروں کو نماز کی فریضت اور ادائیگی کے پیغامات بھیجتے رہتے ہیں مگر وہ خود نماز نہیں پڑھتے نماز کے وقت جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اذان ہو گئی ہے آئیں نماز کے لیے مسجد چلیں تو ان کا جواب ہوتا ہے کہ آپ پڑھ لیں اور ہمارے لیے بھی دُعا کریں۔ حسن اخلاق اور حسن سلوک کرنے کے بہت سے پیغامات بھیجنے والے خود عملی طور پر ان اعلیٰ اوصاف سے خالی ہوتے ہیں۔ یہ دوغلا عمل، عمل نہیں کہ انسان ایک کام خود تو نہ کرے مگر دوسروں کو تلقین کرتا رہے پھر اس نصیحت کا اثر کیا ہوگا؟ آج کل ایک اور رواج عام ہو گیا ہے کہ فلاں اسلامی مہینے کی مبارک باد جو سب سے پہلے دے گا اس کو جنت ملے گی۔ اگر یہ پیغام میں لوگوں کو بھیجو گے تو بہت بڑی خوشخبری ملے گی، دلی مراد پوری ہوگی سکون ملے گا وغیرہ وغیرہ۔ اگر مبارک بادیں دینے سے اور پیغام بھیجنے سے جنت ملنی ہے تو پھر رب کے آگے جھکتا عبادت کرنا، رونا گز گزانا اور دُعا کس لیے؟ اگر پیغام بھیجنے سے دلی مراد پوری ہونی ہے تو نیک اعمال صالحہ کس لیے؟ اگر پیغام بھیجنے سے سکون ملتا ہے تو پھر

حلاوت قرآن اور اللہ کا ذکر کس لیے؟ کیا شریعت کے وضع کردہ اصولوں پر عمل پیرا ہونے کی کوئی حیثیت نہیں؟ علامہ اقبالؒ نے کہا ہے کہ  
عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی، جہنم بھی  
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے  
لوگوں کے قول و فعل میں یہ تضاد کیوں ہے؟ آخر کیوں؟

## جاگتے رہو

شیخ معظم الہی لاہور۔

ایک زمانہ تھا جب رات کے پچھلے پہر چوکیدار کی آواز گونجا کرتی تھی۔ ”جاگتے رہو۔“ اُس آواز میں ایک عجیب سا احساس ہوتا تھا جیسے کوئی آنے والے خطرے سے ہوشیار کر رہا ہو کہ دیکھو بے خبر نہ رہو۔ میں بچپن میں جب یہ آواز سنتا تو میری نیند اچاٹ ہو جاتی تھی۔ آواز کے ساتھ چوکیدار کے ڈنڈے کی کھٹ کھٹ ماحول کو اور بھی پراسرار بنا دیتی تھی۔ میں ڈر کر اپنے اوپر چادر تان لیا کرتا تھا لیکن میرے کان اسی آواز کی طرف لگے ہوتے تھے۔ ”جاگتے رہو۔“ چوکیدار کی آواز میں بڑا رعب اور دبدبہ ہوتا تھا۔ شاید اسی لیے چوری اور ڈاکے کی وارداتیں بہت کم ہوتی تھیں مگر آج وہ سب کچھ لد گیا۔ اب وہ چوکیدار ہیں نہ ہی وہ آوازیں اور نہ وہ لوگ جو چوکیدار کا احترام کیا کرتے تھے۔ میرے والد چوکیدار کے لیے خود اپنی گمرانی میں ناشتا اور کھانا تیار کروا کر اسے بھیجا کرتے تھے۔ اکثر اس کی مالی مدد بھی کیا کرتے تھے مگر اب وہ دور ختم ہو چکا ہے۔ آج کا دور خود ”جاگتے رہو۔“ کا ہے۔ جاگتے رہو جاگتے رہو ہمیشہ کے لیے کیونکہ اس میں آپ کا ہی فائدہ ہے۔

## وہ میری محبت

دفاصدام حسین غازی تیغ حیدر آباد۔

اُس روز مدت بعد میں نے اسے دیکھا تھا وہ..... وہ میری زندگی تھی میری جان میرے دل کی دھڑکن میری زندگی سے جڑی ایک حسین داستان تھی۔ میں نے اسے چاہا تھا اپنے آپ سے بڑھ کر اپنی زندگی سے بڑھ کر وہ میری زندگی میں یوں آئی تھی جیسے سردیوں کی لمبی اندھیری راتوں میں اچانک چاند نکلتا ہے اور سارے ماحول کو روشن کر دیتا ہے۔ اس کی آمد سے میری زندگی میں خوشیوں کی بارش ہو گئی تھی میری زندگی میں بہار آ گئی تھی۔ میں ان خوشیوں میں مست رہنے لگا تھا۔ ہر سو مسکراہٹیں بکھری ہوئی تھیں لیکن میری خوشی عارضی تھی اس نے مجھے کبھی نہیں چاہا بلکہ میرے پیار کا مذاق اڑایا اور مجھے تنہا چھوڑ گئی لیکن میرا یقین ہے کہ ایک دن آئے گا جب اسے میرے سچے پیار کا احساس ہوگا۔ وہ میری نہیں ہو سکی تو کیا ہوا خوش تو ہے نا اس کی خوشی میں میری خوشی ہے۔ مدت بعد اسے دیکھا تو دل سے بے اختیار اس کے لیے دُعا میں نکلیں۔ ”کسی چمن میں رہو بمبار بن کے رہو“

## قید زندگی

فرید عالم نقشبندی کراچی۔

قید زندگی کیا ہے؟ ذرا فرصت کے لمحات میں سوچے اس قید زندگی میں ہم کچھ بھی اپنی مرضی سے نہیں کر سکتے۔ آپ کسی بھی پرندے یا جانور وغیرہ کو پھنجرے میں قید کر کے رکھیں گے تو اس کے جذبات احساسات کیا ہوں گے کیا وہ اس قید میں گھٹن دشواری محسوس نہیں کرے گا؟ اگر آپ کی غلطی سے پھنجرے کا دروازہ کھلا رہ



گیا تو پہلے تو اس پتھر سے کے ارد گرد کا بار بار چکر لگا کر پتھر سے اڑ جائے گا۔ آپ لاکھ اس کو پکڑنے کی کوشش کریں مگر وہ ہاتھ نہیں آئے گا۔ اسے کہتے ہیں آزادی۔ اسی طرح ہم بھی جب موت کے بعد اس قید زندگی سے آزاد ہوں گے تو ہمیں اُس وقت احساس ہوگا واقعی یہ زندگی کسی قید خانے سے کم نہ تھی۔

### فریب ہے زندگی

میلی سروہ اقبال سیالکوٹ۔

انسان کی نظر میں دنیا کی رنگینی ہی سب کچھ ہے شاید اسی لیے لالچ اور ہوس نے آج کے انسان کو اندھا کر دیا ہے حالانکہ دنیا مسائل، مصائب، پریشانیوں اور بیماریوں کا گھر ہے مگر پھر بھی انسان لالچ اور ہوس میں اطمینان ڈھونڈنے میں مصروف ہے۔ انسان کا دل سیاہ ہو چکا ہے۔ ہر کوئی اپنے ارد گرد موجود انسانوں کے ساتھ ایسا گھٹاؤنا کھیل کھیلنے میں مگن ہے جس میں صرف اس کا ذاتی مفاد شامل ہوتا ہے۔ دنیا کی ظاہری رنگینی اور خوبصورتی میں ہم اپنی آخرت کو فراموش کر چکے ہیں۔ شاید ہم ماتھے پر امت مسلمہ کا لگا لگ جانے سے خود کو جتنی سمجھتے ہیں۔ اب دنیا میں دھوکے کے سوا کچھ باقی نہیں رہا۔ ہماری دُعاؤں میں بھی اڑ نہیں رہا اور عبادتیں بے اثر ہیں کیونکہ اعمال کا دار و مدار نیتوں پر ہے۔ اللہ ہم پر رحم فرمائے۔ (آمین!)

### ہم کیسی قوم ہیں؟

قرۃ العین زہیب ملتان۔

اگر اپنے آپ کو بطور پاکستانی دیکھیں تو ایسا لگتا ہے کہ ہم ایسی قوم ہیں جو صابر و دشا کر ہے۔ جوں گیا پہن لیا جو ہو گیا سہ لیا۔ تبدیلی کی ہم کو بالکل ضرورت نہیں۔ ہاں اگر تبدیلی ہم پر ٹھوپ دی جائے تو کوئی برائی بھی نہیں۔ بات آگے بڑھانے سے پہلے ایک واقعہ سنا دوں کہ بہت پہلے انگریزوں کے دور میں ایک انگریز گاؤں میں گیا۔ وہاں اس نے دیکھا کہ لوگوں نے نہر کو پار کرنے کے لیے ایک بڑا سادہ کٹ کر ڈالا ہوا ہے۔ اس نے سوچا کیوں نا ان کو پل بنوادوں سو اس نے وہاں اپنے خرچے سے پل بنوادیا پھر اس نے گاؤں والوں سے کہا کہ اس پل پر سے گزرنے کے لیے تم کو مجھے ٹیکس دینا ہوگا۔ جب میرا لگایا ہوا پیسا پورا ہو جائے گا تو میں چلا جاؤں گا۔ سب لوگ راضی ہو گئے۔ انگریز گاؤں والوں سے پیسا لیتا گیا۔ جب کئی سال گزر گئے تو اس نے سوچا گاؤں والے تو چپ چاپ پیسا دیے جا رہے ہیں کیوں نا میں پیسا بڑھا دوں سو اس نے ٹیکس دگنا کر دیا۔ لوگوں نے اسے بھی تسلیم کیا اور دیتے گئے۔ انگریز شہر ہو گیا اس نے سوچا یہ بے وقوف لوگ ہیں سو ان کو ان کی اوقات یاد دلانے کے لیے جوتے مارنے چاہئیں سو اس نے پل پر ایک آدی بٹھا دیا جو لوگوں سے ٹیکس بھی وصول کرتا اور جوتے بھی مارتا۔ جب لوگ اس پر بھی چپ رہے تو انگریز خود بول پڑا اور لوگوں کو اکٹھا کر کے بولا۔ ”میں اتنے سالوں سے تم سے پیسا لے رہا ہوں۔ اب جوتے بھی مار رہا ہوں کیا تم میں سے کسی نے کچھ نہیں کہا؟“ اتنے میں ایک آدی کھڑا ہو گیا اور بولا۔ ”میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔“ انگریز بولا۔ ”ہاں ہاں بولو کیا کہنا چاہتے ہو؟“ تو وہ شخص بولا۔ ”صبح ہم بہت جلدی میں ہوتے ہیں ہمیں کام پر جانا ہوتا ہے پل پر جوتے مارنے کے لیے دو ہندوں کو بٹھا دیں ہم لاٹن میں کھڑے کھڑے ٹھک جاتے ہیں۔“

کیا آپ کو ایسا نہیں لگتا کہ ہم بھی ایسی ہی قوم ہیں؟ یہ درست ہے کہ اللہ تعالیٰ بھی اس قوم کی حالت نہیں بدلتا جو اپنے لیے کوشش نہیں کرتی اور اپنی حالت بدلتا نہیں چاہتی۔

☆☆☆☆



اے ماں!!

اے میری پیاری ماں

میرے سارے دکھ

آنسو بن کر.....!

تیرے دامن میں سما جاتے ہیں

میں خود کو رُسکون محسوس کرتی ہوں

اور.....!

خدا کا شکر ادا کرتی ہوں

جس نے مجھے اتنے مخلص رشتے

میری ماں سے مجھے نوازا

صنم ناز۔ گوجرانوالہ

### کیوں؟

دل کے اُجاڑ آگن میں

ایک بار تم آئے تھے

تو وقت تھم گیا تھا

میری درد بھری زندگی میں

ہر خوشی بن گئے تھے تم

پھر کیوں!

دنیا کی طرح تم بھی بدل گئے

میرے دل کے آگن کو

اُجاڑ کر چلے گئے

کیوں میری زندگی کو

دُکھ کا ساغر بنا دیا!

سید عبادت کاظمی۔ ڈیرہ اسماعیل خان

### موسم

اتنے اچھے موسم میں

روٹھنا اچھا نہیں!

بارحیت کی باتیں

کل پہ اٹھا رہیں!

آج دوستی کر لیں۔

کرن شیر۔ کراچی

### یاد

رات کے پچھلے پہر

گہری سردرات میں

اس کی یاد

مجھے کچھ اس طرح

ترش پار ہی تھی کہ.....!

سانس لینا بھی دشوار ہو گیا تھا

اور جینا ایک آزار ہو گیا تھا

وفا صدام حسین غازی تینو۔ حیدرآباد



# پسند اپنی اپنی

قارئین کے پسند کردہ اشعار، ادبی ذوق کے آئینہ دار

رضوانہ کوثر..... لاہور

وہ تجھے بھولے ہیں تو تجھ پہ بھی لازم ہے یہ میر  
آگ لگا، خاک ڈال، نام نہ لے یاد نہ کر  
شمینہ ناز..... کراچی

صدیوں کا سفر بل بھر میں ختم ہونے کو چلا  
آج دیکھو ایک انسان خاک ہونے کو چلا  
رو زنجشتر جب ہم اٹھائے جائیں گے  
دیکھنا، کیا اعمال دنیا ساتھ ہونے کو چلا  
محمد اسماعیل بروہی..... نواب شاہ

جو چپ ہے دراصل بولتا وہی ہے  
اس کی خاموشی میں بہت سے سوال پنہاں ہے  
صنم ناز..... گوجرانوالہ

کہو ان سے کہ آئے اور ہم سے مصلحت کر لے  
ہمیں محسوس ہوتا ہے، ہم اُس دن جی نہیں سکتے  
محمد علی..... خانیوال

بات کرتی ہے تو جادو سا جگا دیتی ہے  
اس کی آواز میں کون کی صدا لگتی ہے  
خالد سلیم..... اتلی

کہاں ہو تم کہ تیرے انتظار میں اے دوست  
تمام رات سگلتے ہیں دل کے دیرانے  
سلمیٰ..... حیدر آباد

زخم پہنے ہوئے معصوم بھکاری بچے  
صفیہ دل پہ بکھرے ہیں سوالوں کی طرح

کامران عباسی..... حیدر آباد

تمہاری آنکھ میں بسنے سے پہلے  
میں اک مدت تلک بے گھر رہا ہوں

شاکر بشیر..... میرپور خاص

کل کی بات اور ہے میں اب سارہوں یا نہ رہوں  
جتنا جی چاہے تیرا، آج ستا لے مجھ کو

شریف خان..... پشاور

پڑھتا تھا میں نماز سمجھ کے اسے رشید  
پھر یوں ہوا کہ مجھ سے قضا ہو گیا وہ شخص

ارم بٹول..... جھنگ

کس کا خیال، کون سی منزل نظر میں ہے  
صدیاں گزر گئیں کہ زمانہ سفر میں ہے

آصف زیدی..... کراچی

ہر چند انتخاب نہ تھا میرا تو مگر  
آیا نہ تیرے بعد کوئی انتخاب میں

ناصر احمد..... لاہور

کرنے کو تیرا انتظار حشر تک کریں  
لیکن سوال زندگی مختصر کا ہے

علی..... کوہاٹ

اکیلا ہوں مگر آباد کر لیتا ہوں دیرانے  
بہت روئے گی میرے بعد میری شام تنہائی

شبنم ریاض..... کراچی

ہم تو کچھ دیر بس بھی لیتے ہیں  
دل ہمیشہ اداس رہتا ہے

زرینہ جونجو..... بورڈی سندھ

اتنی شدت سے مجھے وہ یاد آیا کیوں ہے؟  
یا تو ہے دل میں کوئی بات یا برسات میں؟

فیضان ہاشمی..... فیصل آباد

پھول جب مانگتے ہیں ہر برسوں دعا  
تب بہاروں کی کلی کھلتی ہے

لیلی مراد اقبال - سیالکوٹ

ساتھی

زندگی کسی طور کٹ گئی  
کبھی غم بنے ساتھی  
کبھی خوشی آتے آتے پلٹ گئی  
جاوید عثمان زندانی - کراچی

نظم

اپنی سوچ کی لگاموں کو  
ذرا باندھ کے رکھو  
خیالوں کی گستاخی بھی  
گوارا نہیں ہمیں

اصفا فیصل - کراچی

بدن صیبی

ہمیں جن سے عشق ہوا  
وہ لوگ ہی پھڑ گئے  
سمٹ سکے نہ پھر بھی  
کچھ ایسے ہم بکھر گئے  
عکاشہ سحر ایمان - ملتان

پھانس

تلخ یادوں کی پھانس  
میرے دل میں  
پیوست ہو چکی ہیں  
مجھے اک درد دے رہی ہیں  
رستے لہو سے اپنا  
خراب لے رہی ہیں

عائشہ خورشید انور - کراچی

خوابش

سنوے دوست میرے تم  
اگر میں نہ رہوں زندہ  
تو آنسو نہ بہانا تم  
کہ تمہاری آنکھ میں آنسو  
گوارہ ہی نہیں مجھ کو  
میری بس اک ہی خواہش ہے  
کہ یوں رشتہ نبھانا تم  
جب میری یاد آئے تو  
ہمیشہ مسکراتا تم

غزالہ مشعل - کراچی

مصروفیت

خوب صورت لوگوں کو  
خوب صورت رویوں کو  
رہنما اصولوں کو  
تہذیب کے طریقوں کو  
یا دکر تار ہتا ہوں  
دل فریب سوچوں کو  
دستک دیتا رہتا ہوں  
رنگ برنگ پھولوں کو  
دیتا لیتا رہتا ہوں  
ترے خیالوں کو  
کتاب کرتا رہتا ہوں  
ظریف احسن - کراچی

اے خدا

میرے دل کے جنازے تو کئی بار اٹھ چکے مگر  
اب اصل موت کا انتظار ہے!!



الفت خان..... ہنکو

تم تو آئی ہو کہیں جنت سے  
یہ محبت بھی زمانے میں کہاں ملتی ہے  
قمر اکرم..... وزیر آباد

حساب عمر کا اتنا سا گوشوارہ ہے  
تمہیں نکال کے دیکھا تو سب خسارہ ہے  
علیم احمد..... کراچی  
تم نہ سمجھو گے مرے دل پہ گزرتی کیا ہے  
تم نے دیکھا نہیں عالم میری تنہائی کا  
شہناز بانو..... رحیم یار خان

وہ لوگ جن کی رفاقت بھی نہ راس آئی  
ہوئے جو دور تو دل کو بہت ملال ہوا  
نیلیم ظفر..... گوجرانوالہ  
جس شخص سے مانگی تھی اجالوں کی رفاقت  
وہ مجھ کو اندھیروں میں کہیں چھوڑ گیا ہے  
فضل کریم..... کراچی

چھت پہ گہری نیند سونے کے زمانے بھی گئے  
گاؤں سے شہروں کی جانب کا سفر کیا رہا  
تنویر..... راولپنڈی  
منحصر اہل ستم پر ہی نہیں ہے محسن  
لوگ اپنوں کی عنایت سے بھی مر جاتے ہیں  
عائشہ سلیم..... اسلام آباد

وصل و فراق کیا بھلا وقت تو سہہ لیا گیا  
اُس کی گزرتو ہو گئی میری بسر تو ہو گئی  
سجاد علی..... بہاول پور  
کون جانے کہ نئے سال میں تو کس کو پڑھے؟  
تیرا معیار بدلتا ہے نصابوں کی طرح  
بلال سہو..... لیہ

ہمیں زیبا نہیں دیتا رہ دشوار کا منظر  
کہ صحراؤں میں بھی برسات کی تعلیم دیتے ہیں

عمران طارق..... ٹنڈو جام  
منتظر کہاں ہوں میں اب کسی بھی ساتھی کا  
اپنے آپ سے ہی اب دوستی بلا کی ہے  
جیند..... کراچی

میں بدگمان تو اکثر ہوا ہوں تم سے مگر  
کوئی گمان بہت دیر تک نہیں رہتا  
ریمیا چوہدری..... ملتان  
اندھ کی ٹوٹ پھوٹ نے دیران کر دیا  
ورنہ ہمیں بھی ناز تھا ہم آفتاب تھے  
شبانہ وقار..... کوئٹہ

بس یہی بات کہ لوگوں کو نہ چاہو دل سے  
تجربے اس کے سوا عمر کو کیا دیتے ہیں  
عارف شین روہیلہ..... حیدر آباد  
سمندر دن سے بہت دیر گفتگو مت کر  
یہ لکھ نہ جائیں تری زندگی میں پیاس بہت  
عبداللہ..... میرپور خاص  
ساری مخلوق کا سلطان ہونا  
کتنا دشوار ہے انساں ہونا

عابدہ..... کراچی  
اتر بھی آؤ کبھی آسمان کے زینے سے  
تمہیں خدا نے ہمارے لیے بنایا ہے  
کاشف..... کراچی

محبت بھی سرکاری نوکری ہے شاید  
کم بخت غریب کو ملتی ہی نہیں  
پنگی..... راولپنڈی  
یہ طبیبوں کے بس کی بات نہیں  
آپ کا مسئلہ محبت ہے  
☆☆.....

نوٹ: اب شعر کے ساتھ شاعر کا نام لکھنا ضروری  
نہیں۔ اچھے اور معیاری اشعار ارسال کریں۔

## آپ کی خبر

◆..... خبر.....◆

☆ ہمارے دوست لکھاری اور مفرد لب و لہجے  
کے شاعر علی زبیر گزشتہ ماہ ایک نئی دورے کے سلسلے میں  
جائی روانہ ہوئے جہاں انہوں نے ایک ہفتہ قیام کیا اور  
اس دوران کئی ادبی تقریبات میں بھی شرکت کی۔

☆ ہماری دوست لکھاری گڈی آپا چھ ماہ  
امریکہ میں اور تین ماہ آئرلینڈ میں قیام کے بعد وطن  
واپس پہنچ گئی ہیں۔

◆..... شادی خانہ آبادی.....◆

☆ ہمارے ساتھی 'ایڈیٹر دو شیزہ کاشی چوہان  
کے خالہ زاد بھائیوں محمد عامر اور محمد واصل کی شادی  
خانہ آبادی گزشتہ ماہ کراچی میں بخیر و خوبی انجام  
پائی۔ ادارہ دونوں بھائیوں کی خوشیوں کے لیے  
دعا گو ہے۔

☆..... سالگرہ مبارک.....☆

☆ 14 جولائی کو اودودادب کے ممتاز اور  
معروف شاعر "حمایت علی شاعر" کی 87 ویں  
سالگرہ منائی گئی۔ "جاگ اٹھا ہے سارا وطن" جیسے  
قومی نغمے کے خالق کے لیے ادارہ ان کی صحت  
تندرستی اور لمبی زندگی کے لیے دعا گو ہے۔

☆ ہماری دوست لکھاری اور مفرد لب و لہجے کی  
شاعرہ حمیرا راحت نے بھی ماہ جولائی میں اپنی سالگرہ  
منائی۔ ادارہ ان کی صحت تندرستی اور لمبی زندگی کے  
لیے دعا گو ہے۔

☆ ہماری پرانی قاری رخسانہ نوید نے نو

رمضان المبارک کو اپنی سالگرہ منائی۔ ادارہ ان کی  
صحت اور لمبی زندگی کے لیے دعا گو ہے۔

☆ یکم جولائی کو ہمارے پیارے قاری ایم  
سعید انور سعید نے اپنے بیٹے عمیر سعید کی سالگرہ  
منائی۔ ادارہ عمیر کی صحت زندگی اور کامیابیوں کے  
لیے دعا گو ہے۔

☆ 17 جولائی کو ہماری قاری کوثر سعید کے  
بھانجے صہب احمد کی سالگرہ منائی گئی۔ ادارہ ان کی  
زندگی، صحت اور کامیابیوں کے لیے دعا گو ہے۔

□..... کتاب خبر.....□

□ گزشتہ ماہ بہار ایسی شاعری کرنے والی  
آئین فرحت کی کتاب "ہوا کا رخ بدلنا چاہتی  
ہوں" کی تقریب پذیرائی آئرش کونسل میں منعقد  
کی گئی۔ اس تقریب میں سلمان صدیقی نے نظامت  
کے فرائض خوبصورتی سے انجام دیئے جبکہ اورج کمال  
پروفیسر سحر انصاری ریحانہ روجی کے علاوہ ادبی دنیا  
کی ممتاز شخصیات نے بھرپور شرکت کی اور آئین  
فرحت کے فن پر بھرپور آراء کا اظہار کیا۔

□ ہمارے دیرینہ دوست علی رضا عمرانی جو  
سجاد سے تعلق رکھتے ہیں ان کی مفرد شاعری سے سجا  
دوسرا مجموعہ بہت جلد طباعت کے مراحل طے کرنے  
والا ہے۔ امید ہے پہلے مجموعے کی طرح یہ مجموعہ بھی  
اہل ادب سے داد پانے میں کامیاب رہے گا۔

☆☆.....

"آپ کی خبر" کا حصہ بننے کے  
لیے تمام شاعر زاور قارئین بلا جھجکا اپنی خبریں  
ادارے کو بھیج سکتے ہیں۔